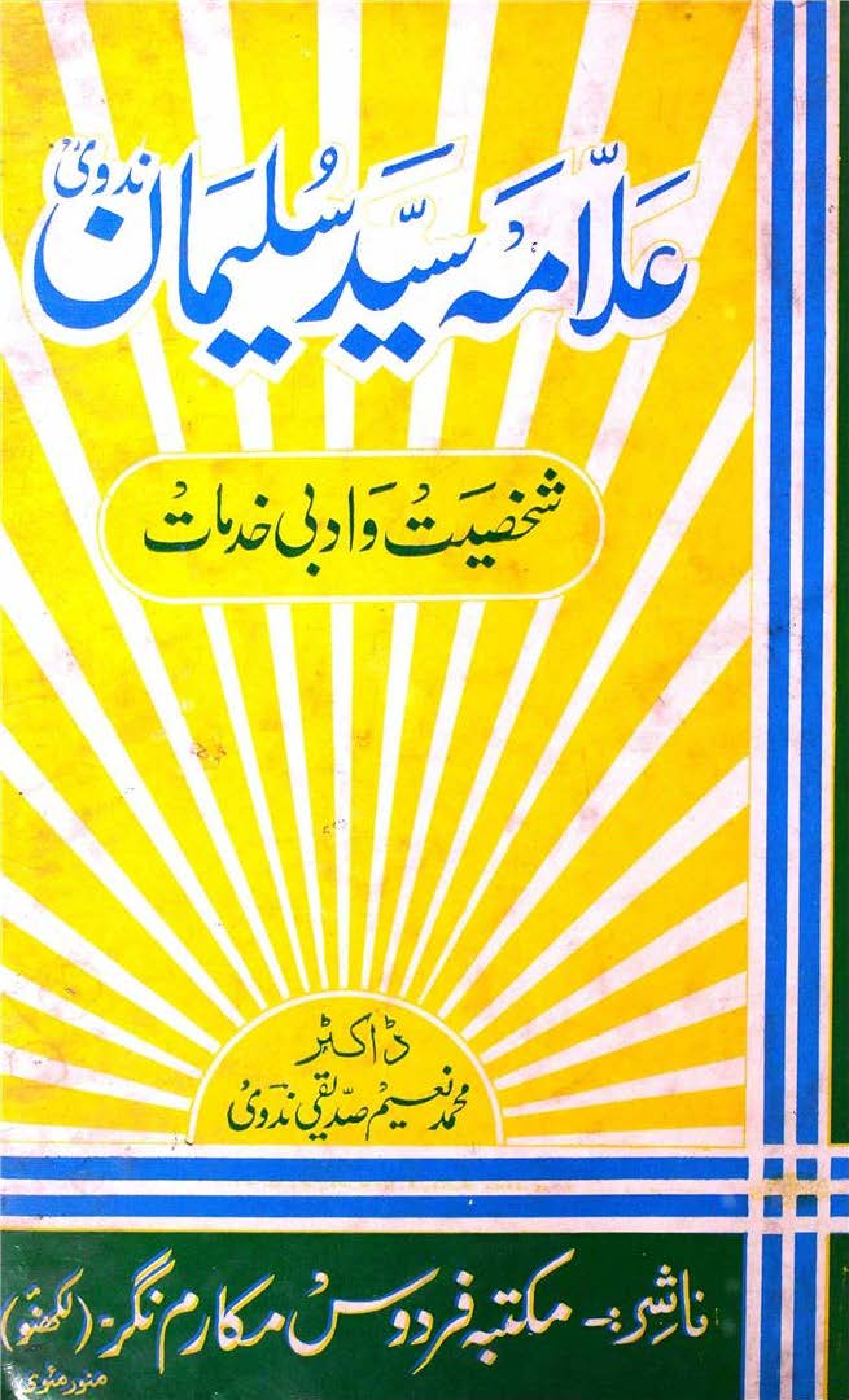

علامہ سید سلیمان ندوی

شخصیت و ادبی خدمات

ڈاکٹر
محمد نعیم صدیقی ندوی

ناشر:- مکتبہ فردوس مکارم نگر (لکھنؤ)

منور مئوی

علامہ سید سلیمان ندویؒ

شخصیت و ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

ناشر

مکتبہ فردوس، مکارم نگر۔ لکھنؤ (یوپی)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

بار اوّل

سنہ ۱۴۰۵ھ ۔ سنہ ۱۹۸۵ء

تعداد ایک ہزار

کتابت ــــــــــ شوکت علی محلہ بلاقی پورہ دار العلوم روڈ مئو۔ اعظم گڑھ
طباعت ــــــــــ آفسٹ پریس گورکھپور
ٹائٹل ــــــــــ منور علی اعظمی
صفحات ــــــــــ ۴۴۸
قیمت ــــــــــ ۴۰ روپے

باہتمام

عتیق الرحمٰن طیبی

طابع و ناشر

مکتبہ فردوس مکارم نگر۔ لکھنؤ

انتساب

والدہ مرحومہ کے نام

★ جن کے والد مولانا حافظ فضل الرحمٰن ندوی کیرانوی، علامہ شبلیؒ کے معتمد رفیق اور حضرت سید صاحبؒ کے بڑے گہرے و مُخلِص دوست تھے۔

اور

★ جن کے پیہم اصرار اور مسلسل مہمیز کے باعث یہ تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل کو پہونچ سکا۔

خدا انھیں کروٹ کروٹ جنّت نعیم نصیب فرمائے۔

تصریح

پیش نظر کتاب دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مُصنّف کو گورکھپور یونیورسٹی نے ۱۹۷۹ء میں پی ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

مکتوب گرامی ڈاکٹر سید سلمان ندوی ص۷
پیش لفظ از جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی ص۹
مقدمہ از جناب ڈاکٹر احمر لاری ص۱۳
باعثِ تحریر از مصنّف ص۱۷
حرفِ آغاز ص۲۵
باب اوّل :- عہد اور ماحول ص۳۱
باب دوم :- (الف) سوانح حیات ص۶۹
(ب) کردار و شخصیت ص۹۳
باب سوم :- ادبی تصانیف ص۱۲۹
. نقوش سلیمانی ص۱۳۱
. خیام ص۱۷۰
. حیات شبلی ص۱۸۰
. یاد رفتگاں ص۱۹۸

باب چہارم :- مکاتیب ص۲۰۹

باب پنجم :- شاعری ص۲۵۳

باب ششم :- تنقید ص۲۸۹

باب ہفتم :- صحافت ص۳۱۷

- الندوہ لکھنؤ ص۳۱۹
- الہلال کلکتہ ص۳۴۲
- معارف اعظم گڑھ ص۳۶۴

باب ہشتم :- اسلوب ص۳۹۵

حرف آخر ص۴۳۱

کتابیات ص۴۳۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی کا مکتوب گرامی

۲۳؍ جنوری ۱۹۸۵ء

برادر مکرم نعیم صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں تقریباً دو ماہ کے سفر کے بعد پچھلے ہی ہفتہ واپس پہونچا ہوں۔ مجھے چند علمی اجتماعات میں شرکت کے لئے امریکہ۔ لندن اور پاکستان جانا تھا۔ واپسی پر آپ کے دو عنایت نامے ملے۔ اور والد مرحوم پر آپ کی کتاب کا پیش لفظ بھی ملا۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ مجھ کو آپ نے اس قابل سمجھا کہ کتاب پر کچھ لکھوں۔

آپ کے والد بزرگوار سے تو تعلقات بہت پرانے ہیں۔ انھوں نے بچپن سے مجھے کھلایا ہے۔ ہمارا بچپن ان کے ساتھ پریس میں گزرا ہے کیوں کہ اس زمانہ میں سب سے زیادہ دلچسپی کا سامان ہم لوگوں کے لئے پریس ہی ہوا کرتا تھا۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ کے اندر اندر کچھ لکھ کر بھیج دوں گا۔ اگر پسند آئے تو شامل کرلیجئے گا اور اگر پسند نہ آئے تو شامل نہ کیجئے گا مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

حیات سلیمان میں کئی باتیں غلط لکھدی گئی ہیں۔ مثلاً والدہ محترمہ کے بارے میں لکھدیا ہے کہ وہ کمسن بیوہ تھیں جب والد مرحوم نے ان سے شادی کی۔ مگر یہ غلط ہے اور صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح کئی اور بے سروپا باتیں ہیں۔ حیات سلیمان ماخذ کے لحاظ سے خصوصاً پاکستان

کے دوران قیام کے سلسلہ میں معتبر نہیں ہے۔ دراصل ضرورت تھی کہ کوئی حیات سلیمان پر تنقید یا تبصرہ کر کے ان اغلاط کی نشاندہی کرتا۔ میں نے صباح الدین صاحب سے کہا تھا۔ بالآخر حالیہ سفر کے موقع پر کراچی میں والد مرحوم کی یاد کے سلسلہ میں ایک تقریب میں حیات سلیمان کے متعلق اپنے تاثرات کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ حیات سلیمان میں میرے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ہم درس خاتون سے شادی کی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میری بیگم میری ہم درس کبھی بھی نہیں تھیں شادی سے پہلے تو میں ان کو جانتا بھی نہ تھا۔

یہ چند سطریں صرف تنبیہ کے لئے لکھدی ہیں۔

والسّلام

مُحتاجِ دُعا

سلمان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی صدر شعبۂ اسلامیات

ڈربن یونیورسٹی۔ جنوبی افریقہ

ڈاکٹر نعیم صدیقی صاحب کا اصرار ہے کہ میں ان کی کتاب "علامہ سید سلیمان ندویؒ شخصیت و ادبی خدمات" پر مقدمہ لکھوں۔ نعیم صاحب کی یہ خواہش اور ان کا پیہم اصرار اُن کے اس حسن ظن کی بنا پر ہے کہ میں اس مقدمہ کے لکھنے کا اہل ہوں۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے، اور مجھے اپنے متعلق اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ دراصل ان کے اصرار کا باعث انکی وہ محبت ہے جو ان کو والد مرحوم علامہ سید سلیمان ندویؒ سے اور اسی توسط سے مجھ سے ہے۔ نعیم صاحب کو یہ محبت ورثہ میں اپنے والد محترم منشی عطاء اللہ صاحب سے ملی ہے۔ مجھے بھی اس تعلق کا اعتراف ہے جو میرے والد مرحوم کو منشی عطاء اللہ صاحب سے تھا اور جو مجھے منشی عطاء اللہ صاحب سے شروع سے ہے۔

نعیم صاحب کی یہ کتاب دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو گورکھپور یونیورسٹی نے ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ جنوری ۱۹۸۳ء میں کراچی میں مجھے خوش قسمتی سے موقع ملا تھا کہ نعیم صاحب کی اس کتاب کے مسودہ پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکوں۔ مسودہ دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ مصنف نے بڑی محنت و دیدہ ریزی سے سید صاحبؒ کی شخصیت و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

سید صاحبؒ کو جاننے والے اور ان سے ملنے والے یہ جانتے ہیں کہ ان کا علمی مقام بہت بلند تھا اور ان کی جامعیت تو اس دور میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں سید صاحبؒ کی جامعیت کے بارے میں لکھا تھا:۔

> ”میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہل علم و اہل نظر ہیں۔ صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے بھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم و فن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی (جیسی سید صاحبؒ کی تھی)“

اس جامعیت و تنوع کے ساتھ سید صاحبؒ کی ایک نمایاں علمی خصوصیت، ان کی تحقیق اور آزادانہ علمی رائے قائم کرنے کی تھی۔ علمی تحقیق و آزادانہ علمی رائے قائم کرنے کی عادت ان کو طالب علمی کے زمانے سے ہی تھی۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس شوق تحقیق نے ایک مستقل طرز فکر اختیار کر لی۔ معروف اصطلاح میں وہ تقلید کے قائل کبھی بھی نہ رہے۔ یہ علمی طرز فکر و حریت ان کی زندگی کے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہی۔ چنانچہ اس طرز فکر نے سید صاحبؒ کو طبعاً ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہ کی طرف کھینچا۔ سید صاحبؒ کو اس کا اعتراف تھا کہ وہ ان تینوں بزرگوں سے بہت متاثر تھے۔ فقہی مسلک کے لحاظ سے اگرچہ وہ حنفی تھے مگر فقہ میں بھی انھوں نے اپنی اس طرز فکر کو آخر تک قائم رکھا۔ خود میں اس سلسلہ میں ذاتی طور پر بہت سے واقعات کا شاہد ہوں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بھی بیعت کے وقت اپنی اس طرز فکر و فقہی توسع کا ذکر کیا تھا اور مولانا تھانویؒ نے بھی جواباً اس فکر کی تصویب فرمائی تھی۔

یہ تسلیم ہے کہ سید صاحبؒ جیسی متنوع شخصیت پر کام کرنا آسان نہیں اور کسی ایک شخص کے لئے مشکل ہے کہ ان کی بوقلمونیوں کو کما حقہ ایک جگہ سمیٹ سکے۔ کم از کم ”حیات شبلی“ ہی جیسی کوئی جامع و تفصیلی و تحقیقی سوانح حیات سید صاحبؒ کی اگر شائع ہو جاتی تو وہ سید صاحبؒ پر کام کرنے والوں کے لئے مستند ماخذ بن سکتی تھی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شاہ معین الدین صاحب مرحوم کی کتاب ”حیات سلیمان“ شائع ہوئی ہے۔ شاہ صاحب مرحوم کی کوشش خاصی کامیاب رہی ہے، مگر پھر بھی بعض واقعات کی تحقیق میں ان سے چوک ہو گئی ہے۔ ”حیات سلیمان“ کئی اعتبار سے تشنہ ہے اس میں بعض واقعات اور خصوصاً پاکستان کے زمانۂ قیام کے واقعات صحیح نقل نہیں ہوتے ہیں۔

دارالمصنفین میں سید صاحبؒ کے آخری زمانۂ قیام کے بارے میں اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم سے ان کے تعلقات کے بارے میں بعض مقالہ نگاروں نے بہت بڑھا چڑھا کر اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ کم از کم ایک صاحب کو جو ہندوستان کی ایک جامعہ میں سید صاحبؒ پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں نے فروری ۱۹۸۲ء میں ہندوستان ہی میں اس بات پر متنبہ کیا تھا۔ اختلاف اگر اختلاف کی حد تک رکھا جائے تو قباحت نہیں۔ لیکن اگر اختلاف کو عداوت و بغض میں تبدیل کر دیا جائے تو یہ تحقیق نہیں ہے بلکہ افترا ہے۔ سوانح نگار کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ واقعات کو صحیح طور سے اسی حد تک رکھے جس طرح وہ ہیں نہ یہ کہ تحقیق کے نام پر حقائق کو توڑ (تا ۷۵ تا ۸۱؟) کر ایک ایسا نتیجہ اخذ کیا جائے جو جانبین میں سے کسی کے بھی ذہن میں نہ ہو۔

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔ سید صاحبؒ کا اصل علمی ذوق قرآن و حدیث و علم کلام کا تھا۔ خود سید صاحبؒ کے بقول کہ تاریخ تو علمی دسترخوان کی چٹنی ہے جو صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ہے۔ سید صاحبؒ نے اگرچہ قرآن پر یا حدیث پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ پھر بھی ان کے تفسیری نکات اور حدیث کی تشریحات سیرت النبیؐ، سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہیں۔ اگر کوئی صاحب سید صاحبؒ کی ان تفسیری نکات و حدیث کی تشریحات کو ان کی علمی تصنیفات سے علیحدہ علیحدہ جمع کر کے ان پر کام کر لے اور پھر ان کو شائع کر لے تو یہ خود ایک مستقل اور قیمتی کام ہے۔ اگرچہ یہ کام خاصا محنت طلب ہے مگر بے انتہا ضروری ہے۔ اس پہلو پر کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی اور اسلامی علوم سے کما حقہ واقف ہو۔ کاش کوئی اس طرف توجہ دے سکے۔ نعیم صدیقی صاحب اس کے اہل ہیں۔ شاید ان کے دل میں یہ بات اتر جائے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام جو غالباً دارالمصنفین ہی انجام دے سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے قلم سے معارف میں جتنے بھی شذرات تحریر ہوئے ہیں ان کو سن وار حاشیوں کے ساتھ کم از کم دو یا تین جلدوں میں شائع کر دیا جائے۔ یہ شذرات دراصل شذرات الذہب ہیں، اور علمی و ملکی و معاشرتی حالات پر بھرپور تبصرہ ہیں۔ آج بھی یہ شذرات اتنے ہی کام کے ہیں جتنے اس وقت تھے۔

سیّد صاحبؒ پر ہندوستان و پاکستان کی کئی جامعات میں تحقیقی کام ہوا ہے اور ان تحقیقی مقالات لکھنے والوں کو ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی گئی ہیں۔ یہ مقالات ظاہر ہے کہ سیّد صاحبؒ کی حیات کے کسی نہ کسی ایک پہلو پر لکھے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ہر مقالہ ایک قیمتی اضافہ ہے۔ نعیم صدیقی صاحب کا مقالہ بھی سید صاحبؒ کی شخصیت و ادبی خدمات پر ہے۔ نعیم صاحب کی معلومات صرف کتابی نہیں ہے۔ ان کی یہی خصوصیت ان کو دوسرے مقالہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کا تعلق اعظم گڑھ سے ہے۔ اور ان کی رسائی دار المصنفین کے رفقاء اور سیّد صاحبؒ کے ساتھ کام کرنے والوں تک براہِ راست رہی ہے۔ بہت سی شخصی و ذاتی معلومات تو ان کو اپنے والد محترم منشی عطاء اللہ صاحب، سید صباح الدّین عبد الرحمٰن صاحب اور مولوی عبد الباری صاحب سے حاصل ہو گئی ہوں گی۔ نعیم صاحب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں اور قابلِ مبارکباد بھی۔ واللہ الموفق و علیہ التکلان۔

۲ر جمادی الاخری ۱۴۰۵ھ — سیّد سلمان ندوی
۲۲ر فروری ۱۹۸۵ء — شعبہ دراسات اسلامیہ
جامعہ ڈربن۔ جنوبی افریقہ

ڈاکٹر احمر لاری

ریڈر شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی

مقدمہ

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب کے افق پر جو ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں نمودار ہوئیں، ان میں سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۲ء) کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ سیّد صاحب کی شخصیت بڑی متنوع، کثیر الجہت اور ہمہ گیر تھی۔ وہ ایک عظیم المرتبت عالم، مؤرخ، ادیب، شاعر، صحافی، ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے۔ سید صاحب کا علم و ادب میں کیا مقام ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر، مفکر اور دانشور نے نہ صرف ان کے علمی مرتبہ اور ادبی ذوق کا اعتراف کیا ہے، بلکہ ان سے کسبِ فیض بھی کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی دبستانِ شبلی کے ایک گل سر سبد ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی قدیم اور جدید کے امتزاج کے قائل تھے۔ اسی لئے وہ سر سید سے متاثر ہونے کے باوجود ہر معاملے میں ان کی ہمنوائی نہ کر سکے۔ شبلی کے تمام علمی و ادبی کارنامے ان کے اس مخصوص نقطۂ نظر کے آئینہ دار ہیں۔ شبلی کا ایک اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادیبوں کی ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جنھوں نے نہ صرف ان کے نامکمل کاموں کو مکمل کیا، بلکہ انھیں مزید آگے بڑھایا۔ ان ادیبوں میں سید صاحب سر فہرست ہیں اور انھیں صحیح معنوں میں شبلی کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔ سید صاحب نے شبلی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا، لیکن اسے اپنے خونِ جگر سے ایسی جلا بخشی کہ وہ اردو ادب کے ہزاروں روشن چراغوں کے درمیان منفرد اور نمایاں ہے۔

سید سلیمان ندوی نے ۲۲؍ نومبر ۱۸۸۴ء کو بہار کے ایک مردم خیز قصبہ دیسنہ (ضلع پٹنہ)

کے ایک علمی خانوادے میں آنکھ کھولی، جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ دینداری اور تقویٰ میں بھی ممتاز تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوئے اور یہاں پانچ سال رہ کر ۱۹۰۶ء میں انھوں نے سندِ فراغت حاصل کی۔ یہیں سید صاحب کی ملاقات علامہ شبلی نعمانی سے ہوئی اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی رہنمائی میں علم و ادب سے عمر بھر کے لئے پیمانِ وفا باندھ لیا، ورنہ ان کے بڑے بھائی تو انھیں اپنی طرح طبیب بنانا چاہتے تھے۔

سیّد صاحب نے اپنی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ”الندوہ“ کی سب اڈیٹری سے کیا، (۱۹۰۷ء)۔ اس دوران انھوں نے متعدد بلند پایہ مضامین لکھ کر اپنی ہمہ گیر علمی و ادبی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ ندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ”دروس الادب“ کے نام سے دو حصوں میں عربی کی ایک درسی کتاب تالیف کی اور ”لغاتِ جدیدہ“ کے نام سے جدید عربی الفاظ کا ایک لغت مرتب کیا۔ علامہ شبلی نے جب ۱۹۱۰ء میں ”سیرت النبیؐ“ کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب نے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے اس کام میں استاد کی پوری اعانت کی۔ چند ماہ تک وہ ”الہلال“ کے شعبۂ ادارت میں بھی شامل رہے۔ بعد ازاں علامہ شبلی کی ایما پر انھوں نے دکن کالج، پونا میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرر کی ملازمت قبول کرلی۔

پونا میں قیام کے دوران سید صاحب نے ”سیرت عائشہؓ“ لکھنا شروع کیا۔ ”ارض القرآن“ کی پہلی جلد مکمل کی اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا۔ سید صاحب کو پونا گئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کا انتقال ہوگیا (۱۸؍ نومبر ۱۹۱۴ء)۔ استاد کے انتقال سے تین روز قبل سید صاحب اعظم گڑھ پہونچ گئے تھے۔ علامہ شبلی نے ان سے سیرت کو مکمل کرنے کا وعدہ لیا۔ سید صاحب نے استاد سے کئے گئے وعدے کا اس حد تک پاس کیا کہ دکن کالج کی ملازمت چھوڑ دی۔ اعظم گڑھ کو اپنا مستقر بنایا اور استاد کے نامکمل کاموں کی تکمیل اور ان کے خوابوں کی تعبیر میں مصروف ہوگئے۔

سیّد صاحب کی اولین حیثیت ایک عالمِ دین کی ہے۔ ان کے دینی کارناموں کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ دیگر کارناموں سے قطع نظر، ان کی تصانیف ”سیرت النبیؐ“، ”سیرت عائشہؓ“ اور ”حیاتِ مالک“

انھیں علماء کی صف میں بلند مقام دلانے کے لئے کافی ہیں۔ علامہ شبلی "سیرت النبی" کی پہلی جلد مکمل کرچکے تھے اور دوسری جلد کا مسودہ چھوڑ گئے تھے۔ سید صاحب نے دوسری جلد کو اضافوں کیساتھ مرتب کرکے شائع کیا۔ باقی جلدیں سید صاحب کی تصنیف ہیں۔ جہاں تک خالص سیرتِ نبوی کا تعلق ہے، یہ دو جلدوں میں ختم ہوجاتی ہے۔ باقی جلدیں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ جلد سوم میں دلائل و معجزات، جلد چہارم میں اسلام کے بنیادی عقائد، جلد پنجم میں اسلامی عبادات اور جلد ششم میں اسلامی فلسفۂ اخلاق کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ اس طرح "سیرت النبی" اسلامی علوم کی ایک انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے۔ "خطباتِ مدراس" بھی سیرت ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔ اس میں سید صاحب نے اختصار کے باوجود آنحضرت صلعم کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔

تاریخی کتابوں میں "ارض القرآن"، "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہاز رانی" اور ادبی کتابوں میں "خیام"، "حیات شبلی" اور "نقوش سلیمانی" سید صاحب کے وہ لازوال کارنامے ہیں جو ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ علاوہ ازیں سید صاحب کے مضامین اور خطوط بھی ان کے علم و فضل، تحقیق و تنقید اور وسعت نظر کے آئینہ دار ہیں۔

سید صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کا ایک اور روشن باب دارالمصنفین کی تشکیل اور اسے ایک فعال ادارہ بنانا ہے۔ اس ادارے کا منصوبہ بھی علامہ شبلی نے بنایا تھا مگر سید صاحب نے اسے عملی جامہ پہنایا (۱۹۱۵ء)۔ سید صاحب کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت جلد ہی اس ادارے نے عالمی شہرت حاصل کرلی۔ اس ادارے سے کئی ممتاز مصنّف وابستہ رہے ہیں اور اس نے نئے لکھنے والوں کی تربیت بھی کی ہے۔ یہاں سے مختلف علوم و فنون کی وقیع اور بلند پایہ کتابیں بھی خاصی تعداد میں شائع ہوچکی ہیں۔ سید صاحب نے دارالمصنفین سے "معارف" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا تھا (۱۹۱۶ء)۔ وہ "معارف" کے تقریباً ۳۵ سال تک مدیر رہے اور اس کے ذریعے بھی علم و ادب میں گراں قدر اضافے کئے۔ اس جریدے کی علمی و ادبی ضوفشانیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

المختصر سیّد سلیمان ندوی کے علمی و ادبی کارناموں کا ایک سرسری جائزہ بھی ان کی

عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار صف اول کے مصنفین میں ہوتا ہے سید صاحب پر اب تک چند کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو رسالوں کے خاص نمبر نکل چکے ہیں، لیکن ان میں سید صاحب کی ادبی خدمات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سید صاحب کی ادبی خدمات پر قلم اٹھا کر اس کوتاہی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔ اے کی اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ اس طرح انھیں قدیم اور جدید دونوں ہی طریقۂ تعلیم سے استفادے کا موقع ملا ہے۔ وہ ایک عرصے تک دارالمصنفین کے فیلو بھی رہے ہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا اور راقم السطور کی نگرانی میں یہ مقالہ مکمل کر کے پی ایچ۔ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ نعیم صاحب نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے اور سید صاحب کے ادبی کارناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر اردو کی ادبی تاریخ میں ان کا مقام متعین کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقالہ علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

احسن لاری

ریڈر شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی

۲۵ فروری ۱۹۸۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باعثِ تحریر

علامہ شبلی اور ان کے دبستان فکر کے گل سرسبد مولانا سید سلیمان ندوی سے راقم سطور کی ذہنی وابستگی اور عقیدت و شیفتگی کی بنیاد محض علمی یا جذباتی نہیں بلکہ درحقیقت اس کی پُشت پر گوناگوں اسباب و عوامل کارفرما ہیں۔ جس خاندانی ماحول میں میرے شعور و تعقل نے آنکھیں کھولیں وہ اس صدی کے آغاز ہی سے شبلی و سلیمان اور ندوہ و دارالمصنفین کے چرچوں سے معمور رہا ہے۔ چنانچہ نانا مرحوم مولانا حافظ فضل الرحمٰن ندوی کیرانوی، جن کا اصلی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا بچپن ہی میں تحصیل علم کے لئے لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر متوسطات تک کی تعلیم پائی۔ اور پھر فکرِ معاش سے مجبور ہو کر ندوہ ہی میں صرف و نحو کی تدریس پر مامور ہو گئے۔ وہ صرف و نحو اور ریاضیات میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ طمع دنیا سے نفرت، قناعت و سادگی، خودداری و استغنا، زہد و اتقا اور انابت الی اللہ ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ اُن کے تلامذہ میں مولانا شاہ حلیم عطا سلونیؒ نے اپنے غیر معمولی وسعت مطالعہ، مفقود النظیر قوت حفظ اور اعلیٰ لطافت ذوق کے باعث شہرت عام پائی۔

حضرت نانا مرحوم نے ندوہ کی وہ فصلِ بہار دیکھی تھی جب علامہ شبلی دارالعلوم کے معتمد تعلیم تھے۔ اور اُن کی عہد آفرین قیادت میں ندوہ کی شہرت و مقبولیت کے غلغلہ سے پورا ملک گونج رہا تھا۔ نانا مرحوم نے علامہ شبلی ہی کے ایما سے مکتبۃ المعین ندوہ کے نام سے ایک

تجارتی ادارہ قائم کیا تھا۔ جو عرصۂ دراز تک محلہ پل جھاؤلال میں واقع ان کے مکان کی زیریں منزل کے ایک کمرے میں رہا۔ اس مکتبہ کے ذریعہ انھوں نے لکھنؤ میں پہلی بار مصر، بیروت اور قسطنطنیہ کی عربی مطبوعات کی تجارت کا آغاز کیا۔ آج بھی نانا مرحوم کے نام سے المعین ندوہ کا اشتہار رسالہ الندوہ کی قدیم فائلوں کی زینت ہے۔ یہی تخم بارآور ہوکر پہلے شبلی بکڈپو پھر مکتبہ جمعیۃ التعاون ندوہ اور اب المکتبۃ التجاریہ ندوہ کے نام سے اپنے مُوسس اولین کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ علامہ شبلی نانا مرحوم کے حسن انتظام اور خوش سلیقگی کے بڑے قدرداں و معترف تھے۔ ان کے اکثر حسابات کی رقمیں بھی نانا جان ہی کے پاس رہتی تھیں۔ اسی تقریب سے مکاتیب شبلی میں متعدد جگہ ان کا نام بھی ملتا ہے۔

نانا مرحوم حضرت سید صاحب کے ہم درس اور بڑے گہرے و مخلص دوست تھے۔ دونوں نے ایک ہی وقت میں نابغۂ عصر استاذ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی صدر مدرس دارالعلوم کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کی سعادت حاصل کی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دونوں میں باہمی مودت و محبت اور اخلاص و یگانگت پختہ سے پختہ تر ہوکر تا حیات باقی رہی۔ حضرت سید صاحب دکن کالج کی ملازمت کے زمانہ (۱۹۱۳ء) میں پونا سے جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تو اسی تعلق دیرینہ کے باعث وہ نانا مرحوم کے مکان واقع پل جھاؤلال ہی پر قیام فرماتے تھے۔ اُن کے سانحۂ ارتحال (اکتوبر ۱۹۴۴ء) پر حضرت سید صاحبؒ نے اپنے خون جگر کی روشنائی سے جو ماتمی مضمون لکھا ہے اس کی سطر سطر میں سوگواری، رقّت و غمناکی اور اثر آفرینی کی بسی ہوئی بجلیاں پنہاں ہیں۔ یہاں اس کا صرف ایک اقتباس پیش خدمت ہے، جس سے نانا مرحوم کی شخصیت کے بعض نمایاں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

> "مرحوم نے عین جوانی میں انابت الی اللہ کی توفیق پائی اور مدرسہ (ندوہ) کی نوکری چھوڑ کر مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے نقشبندی مجددی طریقہ میں بیعت کی اور اُن ہی کے مدرسہ فرقانیہ میں مدرس بھی ہوگئے، اور پھر اُن ہی کے ہو رہے۔ انہی کے زمانہ میں حج سے بھی فراغت پائی۔ اُن کی وفات کے بعد لکھنؤ سے سرہند جاکر

> خانقاہ مجددیہ کی جامع مسجد میں خطابت وامامت قبول کی۔ آخر میں
> اس کا معاوضہ چھوڑ کر حسبۃً للہ اس کام کو انجام دیتے رہے اور متوکلانہ
> زندگی بسر کرتے تھے۔ اس سلسلہ کے سارے متوسلین جو افغانستان
> سے گجرات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے اچھی طرح واقف اور مداح
> تھے۔ قناعت پسند، زہد پیشہ، پھر بذلہ سنج، ہمیشہ بہار اور شاداں
> وفرحاں رہتے تھے۔ دوستوں کی طرح دوستی میں بے حد پائیدار
> اور مخلص تھے۔"

حضرت نانا مرحوم کے حلقۂ احباب میں شبلی وسلیمان کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) حکیم عبدالمعید صاحب، ظفر الملک علوی (ایڈیٹر الناظر) منشی محمد خلیل صاحب نہٹوری، مولانا محمد سعید کیرانوی (والد مولانا محمد سلیم مکی ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ) اور مولانا سید علی زینبی جیسی ممتاز ومتنوع الکمالات شخصیتیں شامل تھیں، جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے تحریک ندوۃ العلماء کے فروغ وترقی سے تعلق رہا ہے۔

ندوہ سے اسی غیر معمولی شغف کے باعث نانا مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم کو بھی ندوہ ہی میں تعلیم دلائی جو عربی زبان وادب میں اپنے اختصاص کی وجہ سے "ادیب" کے لقب سے مشہور عام ہوئے۔ انھوں نے خیرآباد (اودھ) ضلع سیتاپور میں اپنی بساط درس آراستہ کی اور نہایت زہد وقناعت کے ساتھ تاحیات تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے۔ راقم سطور کے تایا مرحوم منشی عبدالحفیظ صاحب کو بھی نانا جان ہی اپنے ہمراہ مظفر نگر سے لکھنؤ لائے اور ندوہ کے دفتر میں محرّر مقرر کرا دیا۔ پھر ۱۹۱۱ء میں والد ماجد جناب منشی محمد عطاء اللہ صاحب (خدا اُن کے سایۂ خیر وبرکت کو تادیر سلامت رکھے) کو بھی ندوہ میں داخل کرانے والے میرے نانا مرحوم ہی تھے۔ والد محترم ندوہ میں اپنے زمانہ قیام کے واقعات نہایت تفصیل اور بڑی لذت وحلاوت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ افسوس کہ بعض وجوہ سے ان کو ندوہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کی ندوہ سے علیحدگی کے رد عمل میں جو مشہور زمانہ اسٹرائیک دارالعلوم میں برپا ہوئی تھی اس میں والد محترم

اور نانا عزیز الرحمٰن ادیب مرحوم پیش پیش تھے۔ عین اس شورش کے زمانہ میں ایک بار علامہ شبلی لکھنؤ تشریف لائے تو اسٹرائیک کی طلبہ نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا اور فرطِ جوش و عقیدت میں ان کی فٹن سے گھوڑے علیحدہ کر دیئے اور خود اسے کھینچ کر شبلی زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے امین آباد پارک (موجودہ گھنٹہ گھر پارک) کے بالمقابل واقع علامہ کی بالائی قیام گاہ تک لے گئے۔ والد محترم بھی اس موکب شبلی میں شامل تھے۔ ملحوظ رہے کہ اس اسٹرائیک کی قیادت مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد اور خود حضرت سید صاحب جیسی اکابر عہد شخصیتیں کر رہی تھیں۔ میرے نانا مرحوم علامہ شبلی سے فرطِ تعلق کے باوجود، اپنی مخصوص افتادِ طبع کے باعث طلبہ کی اس شورش کو پسند نہ فرماتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بھائی مولانا عزیز الرحمٰن ادیب مرحوم اور والد محترم کو اس اسٹرائیک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے دیکھ کر دونوں کو لکھنؤ سے باہر ہرونی بھیج دیا، جہاں میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں جناب محمد زکریا صاحب مرحوم ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔

میرے خال معظم جناب مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری بھی (خدا ان کے ظلِّ عاطفت کو سلامت رکھے) ندوہ سے میرے خاندانی تعلق کے سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی ہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم تو ہندوستان میں حاصل کی مگر پھر نانا مرحوم نے ان کو مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ بھیجدیا۔ جہاں کئی سال قیام کر کے انھوں نے علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اس کے بعد مزید تکمیل و تخصص کی غرض سے وہ جامعہ ازہر مصر چلے گئے۔ وہاں کلیۃ اصول الدین سے جون ۱۹۴۲ء میں فارغ ہو کر ہندوستان واپس آئے اور فروری ۱۹۴۳ء میں ندوہ میں عربی زبان و ادب کے استاذ مقرر ہوئے۔ کامل ۶ سال تک یہاں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد کلکتہ مدرسہ میں عربی ادب کے پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ وہاں سے ۱۹۷۷ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد سے تادمِ تحریر پھر ندوہ ہی میں تدریس و تعلیم میں مصروف ہیں۔ ان کو عربی زبان و ادب کا نہایت پاکیزہ اور صحیح ذوق اور اس کے رموز و نکات پر ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ بچپن ہی میں حفظ قرآن کی دولت سے بہرور ہوئے، اور تجوید و قرأت میں استاذ وقت قاری عبد المالک مرحوم سے مہارت پیدا کی۔ بات سے بات نکل آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ میرا ننہالی خانوادہ

حفاظ و قراء کا مجمع ہے۔ قرآن کے حفظ و تجوید کے ساتھ اتنے طویل تسلسل اور شدت اہتمام کی نظیر کم ہی مل سکے گی۔ اس خاندان کی زندہ نسل میں میرے چھوٹے ماموں جناب محمد طاہر شاہ بھی ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں۔ علاوہ ازیں میرے دو ماموں زاد بھائیوں اور ہم تین خالہ زاد بھائیوں کے نصیب میں بھی خدا نے یہ سعادت عظمیٰ مقدر فرمائی۔ فالحمد للہ حمداً کثیراً

جب دار المصنفین نے ۱۹۱۶ء میں اپنا مستقل پریس قائم کر لیا (جو معارف پریس کے نام سے معروف و مشہور ہوا) تو اس کے انتظام و انصرام کے لئے حضرت سید صاحب کی نگاہیں تایا مرحوم منشی عبد الحفیظ صاحب پر پڑیں۔ جو ندوہ کی محرری چھوڑ کر مولانا عبد الشکور لکھنویؒ کے النجم پریس سے وابستہ ہو چکے تھے۔ حضرت سید صاحب کی لغات جدیدہ اس وقت اسی پریس میں چھپ رہی تھی۔ کچھ اس تعلق سے اور زیادہ تر نانا مرحوم مولانا فضل الرحمٰن ندوی کیرانوی کی وجہ سے سید صاحب تایا مرحوم سے بخوبی واقف اور ان کی نظم و نسق کی صلاحیت کے معترف تھے۔ چنانچہ جب سید صاحب نے ان کو معارف پریس کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے بلا کسی پس و پیش اسے قبول کر لیا۔ اور ۱۹۱۶ء میں وہ والد محترم کو، جن کا ابھی سبزۂ آغاز ہی تھا، ہمراہ لے کر اعظم گڈھ چلے آئے اور معارف پریس کے اولین منصرم مقرر ہوئے۔ اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک پورے تسلسل کے ساتھ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد علیحدگی اختیار کر لی۔ تایا مرحوم منشی عبد الحفیظ صاحب بڑی خداداد صلاحیتوں کے انسان تھے، جدت و اختراع ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ندرت پسندی ان کی فطرت ثانیہ تھی، پامال روش پر چلنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ ان ہی خصوصیات کے باعث ان کے عہد اہتمام میں معارف پریس کے مخصوص انداز کتابت کو سکۂ رائج الوقت اور اس کے حسن طباعت کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ بلاشبہ آج طباعت کا فن جدید ترین ٹکنالوجی اور نوع بنوع اختراعات کے باعث بیحد ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ لیکن اب سے ستّر برس پہلے، جبکہ لیتھو پریس بھی زیادہ عام نہیں تھے، تایا مرحوم کے اختراعی ذہن نے اسی لیتھو مشین پر حسن طباعت اور دلکش آرٹ کے بڑے نادر نمونے یادگار چھوڑے، سیرالنبی تقطیع کلاں، عمر خیام اور الفاروق (قدیم ایڈیشن) کی دیدہ زیب طباعت

معارف پریس ہی میں ہوئی اور ان کے رنگین ٹائٹل بھی یہیں چھپے اور وہ خود تایا مرحوم نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا، والد محترم اپنے برادر معظم جناب منشی عبدالحفیظ صاحب کے ہمراہ عین عالم نوجوانی میں اعظم گڑھ چلے آئے اور پھر یہی اُن کا وطنِ ثانی بن گیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مشہور خطاط منشی اشتیاق حسین سے (جو اس زمانہ میں معارف پریس سے وابستہ تھے اور ان کی اہلیہ بھی خوشنویس تھیں) دو سال میں فن خوشنویسی کی تحصیل کی، اور ۱۹۱۸ء میں باضابطہ معارف پریس کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اور مسلسل پچپن برس تک ایک معمولی مشاہرہ پر اس کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۸۳ء میں سبکدوش ہو گئے۔ درمیان میں چند سال وہ معارف پریس کے مہتمم بھی رہے۔ والد محترم اپنے عہد کے ایک ممتاز خوشنویس اور مصلح سنگ تھے ان کا قابل ذکر کمال یہ تھا کہ وہ طباعت کی پلیٹوں پر اُڑی ہوئی کئی کئی سطروں کی کتابت بالعکس اتنی فنی مہارت اور حسن ولطافت کے ساتھ کرتے تھے کہ چھپائی کے بعد اس کی نشاندہی ناممکن ہوتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جس قناعت پسندی اور صبر وثبات قدمی کے ساتھ اپنی نوجوانی، عالم شباب اور عہد کہولت سب کچھ دارالمصنفین پر نثار کر دیا اس کی نظیر خال خال ہی مل سکتی ہے۔

خطۂ اعظم گڑھ گو میرے والد محترم کا وطن ثانی ہے مگر یہی میرا وطن اصلی ہے۔ اسی مردم خیز سرزمین میں میری ولادت ہوئی اور اس کی علم پرور فضاؤں میں میرا نشو ونما ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں جبکہ میری عمر غالباً پانچ سال رہی ہوگی۔ فطری طور پر گھر کے لوگوں کو میری تعلیم کی بسم اللہ کرانے کا خیال پیدا ہوا، کاتب ازل نے دفتر نصیب کا ورق اُلٹا اور حضرت سید صاحب نے رفقاء وکارکنان دارالمصنفین کی موجودگی میں میری بسم اللہ کرائی۔ شرکائے محفل نے اسے میری خوش بختی کی پیش گوئی اور مستقبل کے لئے فال نیک جانا، دعا سے فارغ ہو کر حضرت سید صاحب نے اپنی جیب سے نکال کر ایک روپیہ کا سکہ بھی عنایت فرمایا، میں اُن کے صدیق حمیم کا نواسہ جو تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آئندہ زندگی میں مجھے علم وتحقیق کے کسی مرحلہ میں اگر کوئی کامیابی نصیب ہوئی تو وہ حضرت سید صاحب کی اسی دُعا کا فیضان ہے۔

راقم سطور نے ابتدائی تعلیم کے بعد اپنی ننہالی روایت کے مطابق پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر ۱۹۵۶ء میں خال معظم مولانا مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری کے ایماء و تحریک بلکہ انہی کی سرپرستی میں والد محترم نے مجھے تحصیل علم کے لئے ندوہ بھیجدیا۔ جہاں سے کامل نو سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں سند فراغت حاصل کی۔ علامہ شبلی اور ندوہ سے عقیدت مجھے ورثہ میں ملی تھی۔ ندوہ کے تعلیمی قیام نے اس میں مزید نمو و جلا عطا کی۔ اسی سال استاذی المرحوم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مجھے دارالمصنفین میں ناظر کتب خانہ اور پھر دو سال کے بعد میرے مطالعہ و تحریر کے ذوق و شغف کو دیکھ کر رفیق دارالمصنفین بنالیا۔ جہاں میرے عنفوانِ شباب کے بہترین بارہ سال گزرے۔ اب آفتاب حیات منزل نصف النہار سے رخصت کی اجازت لے چکا ہے۔ والبقاء للہ وحدہٗ۔ اس حقیقت سے انکار یقیناً احسان ناشناسی کے مرادف ہوگا کہ میرے ذہن کی ترتیب و تشکیل میں دارالمصنفین کا بہت بڑا حصہ ہے۔

راقم سطور کو ۱۹۷۲ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد جب ریسرچ و تحقیق کا خیال ہوا تو اس نے ندوہ، دارالمصنفین اور حضرت سید صاحب سے ان دیرینہ خاندانی و شخصی روابط کی بنا پر جس کا ایک اجمالی جائزہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے، "علامہ سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات" کو اپنا موضوع تحقیق منتخب کیا کہ شاید خریداران یوسف کی فہرست میں میرا نام بھی شامل ہو سکے حضرت سید کو خالص ادیب و انشا پرداز ثابت کرنے کے لئے مستقل تحقیقی مقالہ کا موضوع بنانا بڑی جرأت اندیشہ کی بات تھی۔ کیوں کہ ان کی مسلّم مؤرخانہ و محققانہ حیثیت، ان کے علوم و مضامین کا تنوع، اور جامعیت اُن کی خالص ادبی شہرت کے لئے بڑا حجاب بن گئی ہے حالانکہ نہ صرف یہ ان کی ٹھوس تاریخی و تحقیقی کتابوں میں بھی ادبی حاسہ کو اپنی غذا فراہم ہوتی ہے بلکہ خالص ادبی و تنقیدی موضوعات پر انھوں نے جو سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، وہ میزان قدر میں عصر حاضر کے ترقی پسند ادباء و نقادان سخن کی خدمات سے کہیں زیادہ گراں پلہ ہے۔ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جائے گی۔ یہی تحقیقی مقالہ نظر ثانی اور بعض ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں ہدیۂ قارئین ہے۔

پیش نظر کتاب کے ساتھ میری والدہ مرحومہ کی حسرت ناک یاد اس طرح وابستہ

ہوگئی ہے، جو سینہ کا داغ بن کر ہمیشہ تازہ رہے گی۔ بلاشبہ ان ہی کے پیہم مہمیز کے باعث میں یہ کام مکمل کر سکا تھا، اور وہ اس کی اشاعت کی بے حد آرزومند تھیں۔ آہ! آج میں کس کو کیسے بتاؤں کہ میری والدہ مرحومہ کن محاسن وکمالات کا مجموعہ تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک رابعہ سیرت خاتون تھیں ان کا دردِ دل، ذوقِ دعا، ان کے قلب کی بیتابی، ان کی آنکھوں کی اشکباری اور ان کی شب و روز کی آہ وزاری، ان کی کتابِ زندگی کے روشن عنوانات ہیں۔ وہ نہ صرف ایک خانوادۂ تصوّف و معرفت کی چشم و چراغ تھیں بلکہ خود بھی مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتی تھیں۔ پھر ۱۹۶۲ء میں جب خدا نے ان کو حج کی سعادت نصیب فرمائی تو مکہ مکرّمہ میں مولانا شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئی سے بھی ارشاد و اصلاح کا تعلق قائم کیا۔ اللّٰھمّ اغفرلہا وارحمہا وشبب علیہا شآبیب رحمتک

آخر میں راقم سطور اپنے استاذ و مربی جناب مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی (اڈیٹر البعث الاسلامی) کا سراپا سپاس ہے کہ ان کے حوصلہ افزا تعاون اور شدت فکر و اہتمام کے باعث اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ برادر مکرم جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور استاذی ڈاکٹر احمد لاری کا بھی میں صمیم قلب سے شکرگزار ہوں کہ ان دونوں نے اس کتاب پر مقدمہ سپرد قلم کرکے قدر افزائی فرمائی۔ میں اپنے عزیزترین دوست سید ظہور السلام ندوی کے پرُخلوص تعاون کا بھی دل سے سپاس گزار ہوں خدا ان سب کرم فرماؤں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

شریعہ سپریم کورٹ ابوظبی
(متحدہ عرب امارات)
۹ مارچ ۱۹۸۵ء

خاکسار
محمد نعیم صدیقی ندوی
(سابق رفیق دارالمصنفین)

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیسویں صدی کے ربع اول کا زمانہ سرزمین ادب کی زرخیزی کے اعتبار سے اردو تاریخ کا عہد زریں قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہہ اس پچیس سال کی مختصر مدت میں آسمانِ علم و ادب مہ وانجم جگ مگا اٹھا، اقبال، حسرت، اصغر، فانی، جگر، سرور، آغا حشر، شرر، پریم چندر، چکبست، عبدالماجد دریابادی اور ابوالکلام آزاد سب اسی عہد روشن کے آفتاب و ماہتاب تھے، سید سلیمان ندوی کو اس علمی کہکشاں میں کوکب تاباں کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعیت تنوع اور ہمہ گیری میں ان کی نظیر معاصرین میں کم یاب ہے۔ ان کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو مذہب و تاریخ کا سرمایہ دار بنایا اور تحقیق و تنقید کو گلے ملا کر اپنی علمی و ادبی تخلیقات میں وزن اور وقار پیدا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا اصل مایۂ افتخار وہ تاریخی، مذہبی اور تحقیقی تصنیفات ہیں جو نہ صرف اردو زبان بلکہ معاصر ادب اور عالمی لیٹریچر میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ لیکن لسانی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر بھی ان کے کارنامے مستقل توجہ اور تحقیق و مطالعہ کے مستحق ہیں۔ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سید صاحب نے اردو زبان و ادب کے بہت سے مسائل پہلی بار اٹھائے ہیں جو شروع میں تو متنازعہ فیہ رہے لیکن مرور ایام سے ان کی اہمیت وعظمت پر مہر توثیق ثبت ہوتی گئی اور آج وہ ہمارے ادبی خزانے کا انمول موتی شمار ہوتے ہیں

لیکن بایں ہمہ سید سلیمان ندوی کے فکر و فن کا ادراک حاصل کرنے کی ابھی تک کوئی منظم و مرتب کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دو ایک کتابیں اور بعض رسالوں کے خاص نمبر ضرور

شائع ہوئے ہیں مگر ان میں بھی قلم کا سارا زور سوانح حیات بیان کرنے اور سید صاحب کی مذہبی سیاسی، علمی اور تعلیمی خدمات کو اجاگر کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ ان سے سید صاحب کی ادبی خدمات کی کوئی واضح تصویر نہیں ابھرتی۔ پیش نظر کتاب اس سمت میں پہلی باضابطہ کوشش ہے۔ راقم سطور نے سید صاحب کے حالاتِ زندگی سے زیادہ ان کی شخصیت و کردار پر توجہ صرف کی ہے۔ کیونکہ ان کی تخلیقی کاوشوں پر اس متنوع شخصیت کے گہرے نقوش مرتسم ہیں۔ سوانح حیات سے صرف اسی حد تک اعتنا کیا گیا ہے جو ربط کلام کے لئے ضروری ہے۔

یہ کتاب آٹھ ابواب، حرف آخر اور کتابیات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سید صاحب کے عہد کے ان مخصوص سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات سے بحث کی گئی ہے جن میں ان کی شخصیت اور تخلیقات نے نشوونما اور ارتقا کے مراحل طے کئے۔ تحقیق کے جدید اصولوں کے مطابق اس باب کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس کے بغیر کسی شخصیت کے تشکیلی عناصر کی نشاندہی مشکل ہے۔

دوسرے باب کے حصّہ الف میں سید صاحب کے حالات زندگی اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اور حصّہ "ب" میں ان کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید صاحب اپنے استاذ علامہ شبلی کی طرح نہایت جامع، متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی مجمع الصفات شخصیت کے نگار خانے میں پہونچکر نگاہیں جلوہ ہائے صد ہزار دیکھ کر خیرہ ہو جاتی ہیں۔ جس کا پورا اندازہ اس باب کے مطالعہ سے ہوگا۔

تیسرے باب میں سید صاحب کی ادبی تصانیف نقوشِ سلیمانی، خیام، حیاتِ شبلی اور یادِ رفتگاں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یوں تو سید صاحب کی ہر علمی و تحقیقی تصنیف ادب عالیہ کی سرحدوں میں داخل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پیش نظر باب میں ان کی صرف مذکورہ بالا ادبی کتابوں ہی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں سید صاحب کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ مکتوب نگاری نے اپنی متنوع خصوصیات کے باعث ایک باقاعدہ فن اور ادب کی ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ غالب کے خطوط کے بعد ہر عصر و عہد کے مشاہیر اہل قلم

کے مکاتیب کے مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے خطوط کے بھی متعدد مجموعے شائع ہو کر ذوقِ شناسانِ ادب سے داد حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں خطوط نگاری کے وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اس صنف کو استفسار خیر و عافیت سے آگے بڑھا کر ادب کے حدود میں داخل کر دیتے ہیں

سید صاحب کے صحیفۂ کمال سے ان کی شاعری کو بوجوہ ہمیشہ خارج رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے پانچویں باب میں پہلی بار ان کی شاعری کا مبسوط تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ گو سید صاحب کے بوقلموں علمی و تحقیقی کمالات کی خیرہ کن تجلیات کے سامنے ان کی شاعری کے چراغ کی روشنی ماند رہی لیکن قدرت کلام اور صحت فن کے اعتبار سے وہ لکھنوی دبستانِ شاعری کے اوسط درجہ کے شعراء کے ہم پایہ ضرور تھے۔

چھٹے باب میں سید صاحب کی تنقید نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ وہ شبلی کے مشرقی دبستانِ تنقید کے ایک اہم رکن تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے استاذ کے تنقیدی افکار کی نہایت کامیاب تقلید کی ہے۔

ساتویں باب میں الندوہ، الہلال اور معارف کی روشنی میں سید صاحب کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اردو صحیفہ نگاری میں ان کا مقام متعین کیا گیا ہے سید صاحب نے معارف کے ذریعہ مضمون نگاروں کی ایک پوری نسل کی آبیاری کی اور اپنی جدت طبع سے ادب و صحافت کو متحد کیا۔

آخری باب میں سید صاحب کے اسلوب نگارش کے مخصوص رنگ و آہنگ کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کا طرز تحریر ارتقاء کے کئی تدریجی مراحل سے گذرا ہے۔ شروع میں وہ شرر اور محمد حسین آزاد کے زیر اثر رہے۔ پھر ابوالکلام آزاد کے عہد آفریں اسلوب کی اس حیرت انگیز حد تک اتباع کی کہ اصل و نقل کی تمیز دشوار ہو گئی۔ لیکن سید صاحب کے طرز پر سب سے دیرپا اور گہرا نقش شبلی کا قائم ہوا۔ ان تمام اسالیب نثر سے ہم آہنگ ہونے کے باوصف سید صاحب کے طرز نگارش کا ایک امتیازی و انفرادی رنگ بھی تھا جس میں ان کی شخصیت پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

"حرف آخر" میں پیش نظر کتاب کے تمام ابواب کے مباحث کو سمیٹ کر اردو

ادب میں سید صاحب کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح ان چند اوراق کی حیثیت پوری کتاب کے عطر کی ہے۔

بابِ اوّل

عہد اور ماحول

انسانی شخصیت مختلف عوامل و مؤثرات سے تشکیل پاتی ہے، یہ عوامل مخفی اور واضح، خارجی اور داخلی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کسی اعلیٰ فنکار کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کے سمجھنے کے لئے اس کے عہد اور ماحول کی معرفت لازمی ہے، جس کے مؤثرات کے نقوش شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے فن پر مرتسم نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر ادیب و شاعر عام فطرت انسانی کے مطابق اپنے زمانہ کے متنوع سیاسی، سماجی اور تہذیبی میلانات سے متأثر ضرور ہوتا ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات ماحول کے خارجی مؤثرات کا عکس فن کے بین السطور اتنا صاف جھلکتا ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر اس ادیب یا شاعر کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جس طرح فن میں شخصیت اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ شان دکھاتی ہے، اسی طرح شخصیت پر عہد اور ماحول کے مخصوص کوائف کا عکس بھی نہایت گہرا ہوتا ہے۔

اس لئے سید سلیمان ندویؒ کی فن کارانہ شخصیت و عظمت کا (جو بیک وقت شاعر بھی تھی اور ادیب و نقاد بھی) صحیح ادراک حاصل کرنے کیلئے ذیل میں ان کے عہد اور ماحول کا ایک اجمالی مرقع پیش کیا جاتا ہے، جس میں ان کی بلند مرتبت شخصیت نے نمو و ارتقار کی منزلیں طے کیں اور ان کے علمی اور ادبی اکتسابات منصۂ شہود پر آئے۔

علامہ سیّد سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء ۔ ۱۹۵۳ء) کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم شمار ہوتا ہے، اسی زمانہ میں ہندوستان کی تحریک حریت میں نہ صرف زور و طاقت پیدا ہوئی بلکہ وہ بڑی برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوئی۔ سیاسی تحریکوں میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، مجلس خلافت و ترک موالات اور جمعیۃ العلماء کا عہد شباب سیّد صاحب

کی نگاہوں کے سامنے گزرا۔ ملک کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے حریت پسندوں اور محبان وطن کا قافلہ سیاسی جدوجہد کے جس طوفان بلاخیز سے گزرا، سید صاحب بھی اس کے صرف ساحل کے تماشائی نہ تھے، بلکہ عملی طور پر بھی وہ اس میں شریک ہوئے اور اپنی تمام تر عزلت پسندی اور گوناگوں علمی مصروفیات کے باوجود اس قافلہ حریت کی حدی خوانی کے فرائض انجام دیتے۔ اسی طرح اس زمانے میں علمی و تعلیمی میدانوں میں بھی بڑی دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور ادب میں متنوع رجحانات اور جدید تحریکوں نے جنم لیا۔ غرض سید سلیمان ندویؒ کا عہد ہندوستان کی تاریخ کا وہ انقلابی دور ہے جس میں ہر شعبۂ حیات میں تغیرات و انقلابات کی ایک مسلسل رو چلتی رہی۔

(۲)

عام طور پر مورخین ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات سے شروع کرتے ہوئے اس سال کو جدید ہندوستان کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب اٹھارہویں صدی کے آغاز میں (یعنی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد) سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال گہن آلود ہوگیا تھا، اور جس کے نتیجہ میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے تجارتی زینہ سے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جمنا شروع ہوگئے تھے، اسی وقت سے آزادی وطن کی بقاء کی جدوجہد کا بھی آغاز ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں بدیسی حکومت کے قیام کے امکانات سے سب سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید احمد شہید متاثر ہوئے۔ اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان دونوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ غیر ملکی اثر و نفوذ کی مخالفت اور مرکزی حکومت کی بقاء کی جو تحریک شروع کی وہ ہماری قومی جدوجہد کے ہر مرحلہ میں اثر انداز رہی[1]۔ انگریزوں نے تحریک ولی اللہی کے علمبرداروں کو "وہابی" کہہ کر اس لئے بدنام کیا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تمام ملک میں منظم طریقے سے نمایاں حصہ لیا اور اس کے بعد بھی اپنی کوششیں

---

[1] اسرار احمد۔ "قومی جدوجہد کے ڈھائی سو سال" (مضمون) رسالہ آجکل دہلی جنگ آزادی نمبر ۱۹۵۷ء ص ۱۲

جاری رکھیں[1]۔ اس طرح ہندوستانیوں کے دلوں میں بدیسی اقتدار کی مخالفت کا جذبہ پلاسی اور سرنگا پٹنم کی لڑائیوں سے بھی پہلے پیدا ہو چکا تھا، اور اس کا سہرا بلاشبہہ شاہ ولی اللہ اور ان کے رفقاء کے سر ہے۔ راقم سطور کے خیال میں صرف اسی باعث ۱۸۵۷ء کی انقلاب انگیز بغاوت کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا خصوصی نشانہ بنایا۔

بہر حال ۱۸۵۷ء کا سال مختلف حیثیتوں سے ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ سال ہے جس میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب سرزمینِ ہند پر سوا تین سو سال تک ضیا پاشیاں کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا اور ملک پر برطانوی سامراج کا تسلط مستحکم ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات کو انگریزوں نے غدر کے نام سے موسوم کیا اور ہندوستانیوں نے اسے آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا۔ انگریزوں نے چونکہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور وہ ان ہی کو بغاوت کا سرخیل اور بانی خیال کرتے تھے، اس لئے وہ ہندوستانی مسلمانوں کو کچا چبا جانا بھی کم سمجھتے تھے[2]۔ ریکس نے لکھا ہے کہ ”باغی کا دوسرا نام مسلمان ہے“[3]۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر انگریزوں کے بے پناہ منتقمانہ مظالم کی داستانیں بڑی دلدوز ہیں۔ جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ عرصہ حیات تنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ”میگنا چارٹا“ کے نام سے عام معافی کا ایک اعلان جاری کر دیا تھا لیکن عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا رہا[4]۔

اس میں شبہہ نہیں کہ سن ستاون کی تحریک میں مسلمانوں کا رول نمایاں رہا، لیکن ہندو بھی اس جدوجہد میں شانہ بشانہ برسرپیکار تھے[5]۔ مگر بقول ڈاکٹر تاراچند

---

[1] خورشید مصطفےٰ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۲۳ (الجمعیتہ پریس دہلی طبع اول ۱۹۵۹ء)

[2] محمد طفیل۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۶۲۱ (کتب خانہ عزیزیہ دہلی)۔

[3] Rax: Revolt of N.W.P_P.175

[4] A History of Freedom Movement Vol. II P.240 (Pakistan Historical Society Karachi - 1960)

[5] Moinul Haq: The great revolution of 1857 - P. 245

ہندوستان کی قسمت میں ابھی خط غلامی لکھا تھا اس لئے انقلاب کی یہ تحریک ناکام رہی۔ بلاشبہہ ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں حق کی آواز بلند کرنا گویا دار و رسن کو دعوت دینا تھا۔[1] لیکن یہ "رتبہ بلند" ایک مرد حق بیں و دور اندیش کو نصیب ہوا جو سر سیّد احمد خاں کے نام سے ہندوستان کے غبار آلود مطلع پر طلوع ہوا۔ سر سیّد نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو تاراج ہوتے، بجنور کو لٹتے اور مراد آباد میں انگریزوں کے ظلم و تعدی کا ننگا ناچ دیکھا تھا، انھوں نے ۱۸۵۹ء میں "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر دنیا اور خصوصاً انگریزوں پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ اس لڑائی کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں کے سر نہیں تھی۔ بلکہ اس کی پشت پر انگریزوں کے مظالم، اور ناانصافیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔[2] اس زمانے میں یہ ایک ایسی جرأت کا کام تھا جس کو خدا نے صرف سر سیّد کے لئے ہی مخصوص کر دیا تھا، اور ان کا یہ کارنامہ بلاشبہہ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا، یہی درحقیقت ان کی سیاسی زندگی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کی آگ متعدد اسباب کی بنا پر دب ضرور گئی تھی لیکن خاکستر میں قوم پروری کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔[3] ملک کے غیور عوام نے انگریزی اقتدار کو کبھی رضامندی سے تسلیم نہیں کیا، ان کو غلامی کی لعنت اور بدیسیوں کے ظلم و ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کا ہمیشہ احساس رہا۔ رفتہ رفتہ ملک میں عام بیداری کی لہر چل پڑی اور برطانوی استبداد کی چیرہ دستیوں، ملک کی اقتصادی ابتری، صنعت و حرفت کی تباہی، پے در پے قحط اور تعلیم یافتہ طبقہ کی روز افزوں بے روزگاری وغیرہ نے انقلابی جذبات کو پھر سے ہوا دینا شروع کر دی، ان تمام حالات نے قومی احساسات بیدار کئے اور ملک میں ایک مضبوط و منظم سیاسی تحریک کی ضرورت کا خیال پختہ ہو گیا۔ چنانچہ مختلف سیاسی

---

[1] ڈاکٹر تاراچند۔ پیش لفظ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۹۔

[2] محمد حسن۔ ۱۸۵۷ء کی ادبی اہمیت (مضمون) رسالہ آجکل دہلی جنگ آزادی نمبر ۱۹۵۷ء ص ۲۵۔

[3] ڈاکٹر عابد حسین۔ "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" ص ۶۷ (بار اول ۱۹۶۵ء)

جماعتیں وجود میں آنے لگیں، ان میں "انڈین ایسوسی ایشن" قابل ذکر ہے جو جولائی ۱۸۷۶ء میں چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کے جواب میں سرسید نے "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کی جو مسلمانان ہند کے سیاسی خیالات کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی۔ [1]

بہر حال بیسویں صدی میں قدم رکھتے کانگریس نے ہندوستان کی ایک منظم و مؤثر اور مسلمہ سیاسی جماعت بن کر ارباب اقتدار سے بھی اپنی اہمیت کو تسلیم کرالیا اور ۱۹۰۶ء میں اجلاس کلکتہ (بصدارت دادا بھائی نوروجی) کے موقع پر کانگریس نے سوراج کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔[2] اسی زمانہ میں کانگریس اعتدال پسند اور انتہا پسند دو طبقوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ جن کا اتحاد ۱۹۱۶ء میں پھر ہوا۔

۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کا وسیع صوبہ دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ مشرقی بنگال کو جہاں مسلم اکثریت تھی ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت دیدی گئی، اس تقسیم کے خلاف ایک طوفان برپا ہو گیا۔[3] مخالفانہ ایجی ٹیشن میں بنگالی ہندو خاص طور پر شریک تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس تقسیم کو اپنے حق میں مختلف حیثیتوں سے مفید خیال کرتے تھے، اس لئے وہ اس سیاسی شورش میں حکومت کے موقف کے شدت سے حامی تھے۔ تقسیم بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن تقریباً چھ سال تک جاری رہا۔ بالآخر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی کے دربار تاجپوشی کے موقع پر ملک معظم قیصر ہند نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔[4] جس سے مسلمانوں میں حیرت کے ساتھ غم وغصہ اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ نواب وقار الملک نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اعلان تنسیخ کے خلاف معرکۃ الآراء اور مدلل مضامین لکھے۔ جن کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی خیالات میں زبردست انقلاب پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ کچھ ہی دنوں بعد آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی خود مختار حکومت کو اپنا نصب العین

---

[1] دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۲ ص ۱۲۱ طبع اول ۱۹۶۶ء۔

[2] Ishwari Parsad : A History of Modern India P. 346

[3] عبدالقدوس ہاشمی: ہندوستان اور پاکستان ص ۷۸ (دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد ۱۹۴۷ء)۔ [4] امین زبیری: سیاست ملیہ ص ۸۱۔

قرار دے لیا۔[1] اور ۱۹۱۳ء میں کانگریس اور لیگ میں متحدہ جدوجہد کا سمجھوتہ ہو گیا۔

اگست ۱۹۱۳ء میں جب کہ طرابلس و بلقان کی جنگ گرم تھی اور حکومت برطانیہ کی پالیسی سے مسلمانوں کے دل غم و غصہ سے لبریز تھے۔ مسجد کانپور کی شہادت کا واقعۂ ہائلہ پیش آگیا۔ میونسپل حکام نے ایک نو تعمیر سڑک سیدھی کرنے کے لئے مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا دالان اور وضو خانہ بجبر منہدم کر دیا اور جب غیور مسلمانوں کا ایک گروہ جن میں بچے بھی شامل تھے۔ گری ہوئی اینٹیں اٹھا اٹھا کر منہدم دیوار پر رکھنے لگا تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے فوج سے گولی چلوا دی۔[2] اس واقعہ نے جذبات کو مشتعل کر دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں برطانوی استبداد کے خلاف آگ لگا دی۔[3]

۱۹۰۶ء میں جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بمقام ڈھاکہ منعقد ہوا تو نواب وقار الملک کی جدوجہد سے پولیٹکل ایسوسی ایشن (جس کا آغاز ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ نواب صاحب موصوف ہی کے ایما و کوشش سے ہو چکا تھا) کا ایک جلسہ خود نواب صاحب موصوف کی صدارت میں ۳۰؍ دسمبر ۱۹۰۶ء کو منعقد ہوا۔[4] اور اسی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک جماعت کا قیام عمل میں آیا اور نواب وقار الملک اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔[5] اس جماعت کے مقاصد میں مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا، گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی ہو اسے دور کرنا، اور مسلمانان ہند کے پولیٹکل حقوق و فوائد کی نگہداشت اور انکی ضروریات و خواہش کو مؤدبانہ طریقہ سے گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا تھا۔[6] دسمبر ۱۹۰۷ء میں لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس کراچی میں سر آدم جی پیر بھائی کی صدارت میں منعقد

---

[1] اکرام اللہ ندوی: وقار حیات۔ ص ۶۵۹۔

[2] امین زبیری: سیاست ملیہ۔ ص ۹۷۔

[3] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان۔ ص ۵۸۔

[4] امین زبیری: تذکرۂ وقار۔ ص ۱۶۸ (عزیزی پریس آگرہ ۱۳۳۸ء)۔

[5] عبد القدوس ہاشمی: ہندوستان اور پاکستان۔ ص ۸۲۔

[6] اکرام اللہ ندوی: وقار حیات۔ ص ۶۷۷۔

ہوا، جس میں ممبروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور لیگ کا دستور العمل منظور ہوا۔[1]

راقم سطور کے نزدیک سید طفیل احمد منگلوری کا یہ خیال محلِ نظر ہے کہ مسلم لیگ کا قیام انگریزوں کے ایما سے عمل میں آیا۔ چونکہ وہ کانگریس کی روز افزوں مقبولیت اور طاقت سے خوف زدہ تھے اس لئے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی اپنی مشہور زمانہ پالیسی کے مطابق انھوں نے مسلم لیگ قائم کرا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی کوشش کی۔[2] راقم السطور کا خیال ہے کہ اس طرح کی غلط فہمی کانگریس کے اس طبقہ نے پھیلائی جنھیں بنیادی طور پر مسلم لیگ کے قیام ہی سے اختلاف تھا، اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا کوئی جداگانہ پلیٹ فارم کانگریس کے علاوہ بن سکے۔ اسے محض اتفاق ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی بنا میں وہ مسلمان پیش پیش تھے جو "سر" کے خطاب یافتہ تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انگریزوں نے انھیں مسلم لیگ قائم کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ واقعات و شواہد اس کے خلاف ہیں۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لکھنؤ میں اپنا نصب العین:

> "برادرانِ وطن سے اتحاد اور ہندوستان کے لئے حکومت
> خود اختیاری حاصل کرنا"

قرار دیا۔[3] اسی زمانے میں **محمد علی جناح** جو اس وقت تک کانگریس کے سرگرم لیڈر تھے۔ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور بہت جلد اس کے سب سے بڑے لیڈر بن گئے۔ سنہ ۲۰ء تک انھوں نے کانگریس اور لیگ کو جوڑنے میں ایک مضبوط کڑی کا کام دیا۔ سنہ ۲۰ء میں جناح کے کانگریس چھوڑنے کے بعد لیگ کانگریس سے دور ہٹنے لگی۔[4]

سنہ ۱۹۱۶ء میں بال گنگا دھر تلک نے "ہوم رول" کی تحریک شروع کی جس میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے آواز بلند

---

[1] امین زبیری: سیاست ملیہ۔ ص ۵۹۔ [2] سید طفیل احمد: مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۳۶۳۔

[3] عبدالقدوس ہاشمی: پاکستان اور ہندوستان۔ ص ۸۳۔

[4] "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں"۔ عابد حسین۔ ص ۱۶۲۔

کی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۹ء تک کا زمانہ ہوم رول تحریک کا عہد شباب تھا۔ اس وقت ہندو مسلمان ایک جان دو قالب ہو کر حق خود اختیاری کی جدوجہد میں شریک تھے[1]۔ نتیجے کے طور پر جون ۱۹۱۸ء میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو چیمسفورڈ کی کوشش سے ہندوستانیوں کو نظام حکومت میں کافی حقوق دیئے گئے[2]۔ مانٹیگو رپورٹ کی تجاویز کا کانگریس نے خیر مقدم کیا۔ گو ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں جب ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تو تمام توقعات پر پانی پھر گیا اور بہت سے سرکردہ ہندوستانی جن میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے، مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیئے گئے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) کے خاتمہ کے بعد مارچ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے رولٹ کمیشن مقرر کیا جس کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد رولٹ ایکٹ کے نام سے نافذ کر دی گئی، ان تمام زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج سے ملک کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ بقول قاضی عبدالغفار ”دامن ہمالیہ سے سیلون تک اور پشاور سے کلکتہ تک ہزاروں احتجاجی جلسے ہر روز ہو رہے تھے اور ہوا میں ہزاروں بجلیاں کوند رہی تھیں“[3]

بالآخر جب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور حکومت خود اختیاری کا خواب شرمندۂ تکمیل ہونا درکنار مزید دھندلا ہو گیا تو یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو مہاتما گاندھی نے انگریزوں کے خلاف ستیاگرہ کا اعلان کر دیا اور اس کے بعد ۹؍ اپریل ۱۹۱۹ء کو ملک گیر پیمانے پر یہ تحریک شروع ہو گئی۔ پورے ہندوستان میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد کیے گئے۔ ملک کے دوسرے شہروں کی طرح امرتسر میں بھی ایک جلسہ ہوا۔ اس کے رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال تھے۔ پنجاب گورنمنٹ نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔ اہل شہر کو خبر ہوئی تو انھوں نے ان کو چھڑانے کے لئے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر مظاہرہ کیا۔ پولیس نے مجمع پر گولی چلا دی جس میں کئی آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس واقعہ نے عوام کو بے قابو کر دیا اور انھوں نے سرکاری دفتروں اور عمارتوں کو لوٹنا اور آگ لگانا شروع کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر جنرل ڈائر نے امرتسر کو اپنے چارج میں لے لیا۔ ۱۲؍ اپریل کو

---

[1] امین زبیری: مسلمانان ہند کی سیاست وطنی۔ ص ۵۹۔

[2] ” ” سیاست ملیہ۔ ص ۱۳۹۔ [3] قاضی عبدالغفار: حیات اجمل۔ ص ۲۰۲۔

امرتسر کے باشندوں نے جلیان والا باغ میں پھر ایک احتجاجی جلسہ کیا۔ جنرل ڈائر نے جلسہ گاہ میں پہونچ کر بے تحاشا گولی چلوادی[1]۔ اور جلیان والا باغ کی زمین صرف تیس سکنڈ میں پانچ سو شہیدان وطن کے خون سے لالہ زار ہو گئی۔ اس اندوہناک حادثہ میں تقریباً پندرہ سو انسان زخمی ہوئے[2] اور بے شمار گرفتار کئے گئے۔ اس خونیں واقعہ نے پورے ہندوستان خصوصاً پنجاب میں آگ لگادی اور امرتسر کو زیارت گاہ خلائق بنا دیا۔

اس واقعہ نے ہندو مسلمانوں میں وہ عدیم المثال اتحاد پیدا کر دیا جو اکابر سیاسی قائدین برسوں کی جدوجہد اور طویل بیانات سے بھی پیدا نہ کر سکتے تھے۔ اسی زمانے (۱۹۱۹ء) میں ترکی حکومت کی بحالی کی کوشش کے لئے مجلس خلافت[3] اور مسلمانوں میں قومی جدوجہد کو فروغ دینے کے لئے جمعیۃ علمائے ہند[4] کا قیام عمل میں آیا۔ ان دونوں جماعتوں کی بنا و تاسیس میں سید سلیمان ندویؒ کا نمایاں حصہ تھا۔ وہ ان کے سرگرم رکن تھے، اور اس کے جملہ مہمات امور میں ان کا مشورہ شامل رہتا تھا۔

رولٹ بل کے نفاذ اور جلیان والا باغ کے قتل عام نے ملک میں جو غیر معمولی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا جب اس کی کوئی دادرسی نہ ہوئی تو کانگریس نے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کر کے حکومت سے عدم تعاون (Non Coopration) کا رزولیوشن پاس کر دیا[5]۔ تحریک ترک موالات یا عدم تعاون میں خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء نے کانگریس کی پرزور اور غیر مشروط حمایت کی[6]۔ اس پرامن

---

[1] امین زبیری: سیاست ملیہ۔ ص ۱۵۱۔ [2] قاضی عبدالغفار: حیات اجمل۔ ص ۲۰۲۔

[3] اس کے بانیوں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا کفایت اللہ، علی برادران، حکیم اجمل خاں اور دوسرے علماء و سیاسی لیڈر تھے۔

[4] اس کے بانیوں میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ اس عہد کے بہت سے علماء تھے۔

[5] اس کے تین ماہ بعد دسمبر ۱۹۲۰ء میں بمقام ناگپور کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ جس میں اس تجویز کی توثیق کی گئی اور سوراجیہ کے حصول کو قومی جدوجہد کا نصب العین قرار دیا گیا۔

[6] امین زبیری: سیاست ملیہ۔ ص ۱۵۴۔

اور عدم تشدد پر مبنی تحریک کا مقصد ایک سال کے اندر سوراج حاصِل کرنا تھا۔ اس وقت کے مخصوص حالات نے ہندو مسلمانوں کو بالکل شیر و شکر کر دیا تھا۔ چنانچہ علی برادران (محمد علی شوکت علی) نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کا دورہ کر کے پورے ملک کو ترک موالات کے غلغلہ سے پر شور کر دیا۔[۱] سرکاری ملازمین نے اپنی ملازمتیں، طلبہ نے سرکاری مدارس، اور کونسل کے ممبروں نے اپنی ممبری چھوڑنا شروع کر دی۔ خطاب یافتوں نے خطاب واپس کر دیئے۔ انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ کر کے سب لوگ کھدر پوش ہو گئے۔[۲] شاہ معین الدین نے بہت صحیح لکھا ہے کہ "ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا ایسا روح پرور نظارہ پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔"[۳]

اسی سال پانچ سو ہندوستانی علمائے کے دستخط سے ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا، اسی فتویٰ کی بنا پر وہ تاریخی مقدمہ چلایا گیا۔ جو "کراچی کیس" کے نام سے مشہور ہے، اس مقدمہ میں مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شوکت علی، پیر غلام مجدد، مفتی نثار احمد کانپوری اور بھارتی کرشنا ماخوذ ہوئے تھے۔[۴]

سول نافرمانی کی یہ پر امن تحریک جاری ہی تھی کہ اسی سلسلہ میں ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو چوری چورا (ضلع گورکھپور) میں عوام اور پولیس میں زبردست تصادم ہو گیا اور مظلوم دیہاتیوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تھانہ کو آگ لگا دی اور متعدد سپاہیوں کو اس میں زندہ جلا دیا، چونکہ اس تحریک کی بنیاد عدم تشدد پر تھی، اس لئے مذکورہ واقعہ سے گھبرا کر گاندھی جی نے عین اس وقت تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ جب وہ پورے عروج پر تھی، حکومت کو بھی چین نصیب ہوا، اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر فرقہ وارانہ کشمکش پیدا کرنے کے لئے شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں شروع کرا دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ہندو مسلم اتحاد خاک میں مل گیا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے بڑی بھیانک صورت اختیار کر لی اور

---

[۱] امین زبیری: سیاست ملیہ ص ۱۵۷۔ [۲] رئیس احمد جعفری: علی برادران ص ۶۲۸ (طبع اول ۱۹۶۳ء)
[۳] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۲۱۷۔
[۴] امین زبیری: سیاست ملیہ ص ۱۶۲۔

دونوں فرقوں میں بڑی خونریز لڑائیاں شروع ہوگئیں جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا[1]۔ عام مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ انھیں ہندوستان کی تنگ نظر اکثریت انگریز کے بعد چین سے بیٹھنے نہ دے گی۔

کانگریس اور دوسری قومی جماعتوں نے اس فضا کو بدلنے اور دوبارہ اتحاد قائم کرنے کی بہت کوشش کی اور ستمبر کے اواخر میں دہلی میں ایک مجلس اتحاد منعقد ہوئی مگر تمام کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں کیوں کہ بقول شاہ معین الدین ندویؒ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس اختلاف کے اسباب بہت گہرے تھے۔ ملک میں ایسی جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں جن کا مقصد فرقہ وارانہ اتحاد کو نقصان پہونچانا تھا اور کانگریس کا اثر کم ہونے کے بعد ان جماعتوں کی قوت اور ان کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کا انسداد محض کانفرنسوں، جلسوں اور پلیٹ فارم کی تقریروں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے ذہنوں کے بدلنے کی ضرورت تھی[2]۔ ستمبر ۲۴ء کے آخری ہفتہ میں جو مجلس اتحاد دہلی میں منعقد ہوئی تھی، علامہ سید سلیمان ندوی بھی اس میں شریک ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آکر اکتوبر ؁۲۴ء کے معارف میں ہندو مسلم اختلاف کے اسباب و علل اور اس کے علاج پر بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی تھی۔

نان کوآپریشن اور خلافت تحریک (؁۱۹۲۱ء ؁۱۹۲۴ء) کے زمانے میں مسلم لیگ ساکت اور بے جان سی رہی لیکن جیسے ہی یہ تحریکیں ڈھیلی پڑیں مسلم لیگ میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ؁۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا پندرھواں اجلاس لاہور میں ہوا، اس موقع پر مسٹر جناح نے لوگوں کو بتایا کہ اگرچہ تحریک عدم تعاون ناکام رہی لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عوام بیدار ہو گئے ہیں اور وہ اب سوراج کا مطالبہ اور ”ذمہ دار ڈومینین“ حکومت کی مانگ کر رہے ہیں۔ ہندوستانی عوام کی خودداری اور غیرت کا تقاضہ

---

[1] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۲۲۳۔

[2] ” ” ” ” ” ص ۲۲۴۔

ہے کہ ملک کی باگ ڈور غیروں کے بجائے ہم وطنوں کے ہاتھ میں ہو۔ اسی اجلاس میں جناح نے یہ بھی واضح کیا کہ مسلم لیگ اعلان کر چکی ہے کہ اس کا مقصد ملک کے لئے سوراج حاصل کرنا ہے۔ لیکن اس کے حصول کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ [1]

۸ر نومبر ۱۹۲۷ء کو ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی سفارش پیش کرنے کیلئے سر جان سائمن کی چیرمینی میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا۔ اس کمیشن کے تمام ساتوں ارکان انگریز تھے۔ اس نوعیت کے کمیشن کے بارے میں ہندوستانی عوام کا رویّہ کیا ہونا چاہیئے تھا، ظاہر ہے۔ ۱۶ر نومبر کو محمد علی جناح نے ۲۵ سرکردہ ہندو مسلم دانشوروں کے دستخط سے سائمن کمیشن کے مقاطعہ کا اعلان شائع کر دیا۔ اس اعلان پر دستخط کرنے والوں میں سر علی امام، سیتلواد، تیج بہادر سپرو، سیٹھ یعقوب حسن، پرشوتم داس ٹھاکر، من موہن داس، ڈاکٹر کچلو، چنتامنی، اور نواب اسماعیل خاں وغیرہ شامل تھے، جنوری ۲۸ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، اس میں بھی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد منظور ہوئی، اسی طرح کانگریس نے بھی اپنے دسمبر ۲۷ء کے اجلاس مدراس میں اس کمیشن کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا[2]۔ چنانچہ ۳ر فروری ۲۸ء کو جب سائمن کمیشن ہندوستان پہونچا تو اسے سارے ملک میں زبردست مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹ر مئی ۲۸ء کو بمبئی کی آل پارٹیز کانفرنس نے ہندوستان کے دستور اساسی کو طے کرنے کے لئے موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی، اس کے سکریٹری جواہر لعل تھے، دوسرے ارکان میں سر علی امام، شعیب قریشی، جیکر اور سر تیج بہادر سپرو کے نام قابل ذکر ہیں۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ۲۸ر اگست ۲۸ء کو بمقام لکھنؤ ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کانگریس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ، مرکزی خلافت کمیٹی، ہندو مہاسبھا، جمعیۃ العلماء اور آل انڈیا لبرل فیڈریشن نیز دوسری علاقائی سیاسی و اقلیتی جماعتیں شریک ہوئیں[3]۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اس کانفرنس کے صدر تھے۔ نہرو رپورٹ میں ہندوستان کے

---

[1] [2] کانجی دوارکا داس: محمد علی جناح۔ مترجمہ شہاب الدین دسنوی ص ۴۰، ۵۳ ([illegible])۔

[3] رپورٹ کمیٹی آل پارٹیز کانفرنس ۲۸ء (اردو ترجمہ) ص ۱۵۹ (مکتبہ جامعہ دہلی)۔

درجہ نوآبادیات آزاد ہندوستانی ریاستوں کا ہند یونین سے الحاق، اور جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو ختم کرنے کی تجاویز" رکھی گئی تھیں۔ ان تجاویز پر مختلف ردعمل ظاہر ہوا، مسلمانوں نے اس رپورٹ کو خاص طور پر اپنے لئے سیاسی موت کا جام تصور کیا۔ متعدد صوبوں میں اس پر احتجاج اور ناراضگی کے بڑے بڑے جلسے منعقد ہوتے۔ ۳۱؍ دسمبر ؁۲۸ء کو دہلی میں مسلمانوں کی ایک کل جماعتی کانفرنس ہوئی، جس میں مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماؑ کے سربرآوردہ ارکان شریک ہوتے اور نہرو رپورٹ کو مسلم اقلیت کی طرف سے تسلیم نہ کئے جانے کی تجویز پاس کردی گئی[۱]

۲۲؍ دسمبر ؁۲۸ء کو نہرو رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے کلکتہ میں ایک کل ہند آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ لیکن بالآخر عمومی مخالفت کے باعث نہرو رپورٹ کا خاتمہ ہوگیا۔ ہندو مہا سبھا رپورٹ کی پرزور مؤید اور مسٹر جناح کی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوششوں کی شدید مخالف تھی[۲] جس کے باعث کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے دوستانہ رویہ میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور دونوں میں کشیدگی کا آغاز ہوگیا۔

نہرو رپورٹ کی منسوخی کے بعد ؁۲۹ء کے اخیر میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں کانگریس کا لاہور سیشن منعقد ہوا جس میں کانگریس نے مکمل آزادی کی تجویز منظور کرلی۔ علماء اسلام نے جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اس کی پوری حمایت کی، ستیاگرہ اور عدم تعاون کی تحریک نے پھر زور پکڑ لیا۔ گاندھی جی نے نمک کا قانون توڑا[۳]، اور انقلابی عوام سوراج کے گن گانے لگے۔

۱۲؍ دسمبر ؁۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس بلائی گئی۔ چونکہ برطانوی حکومت آزادی کامل کے بجائے ہندوستان کو صرف نوآبادیاتی درجہ دینے پر راضی تھی، اس لئے کانگریس نے اپنے مذکورہ بالا لاہور سیشن میں گول میز کانفرنس میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ

---

[۱] امین زبیری: مسلمانان ہند کی سیاست وطنی ص ۱۰۶۔

[۲] سید عبدالباری: ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ ص ۱۸۷۔

[۳] عبدالقدوس ہاشمی: پاکستان اور ہندوستان ص ۸۶۔

کرلیا[1]، لیکن ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں اور مختلف مفادات کے نمایندوں نے شرکت کی، مسلمان نمایندوں میں مولانا محمد علی کی تقریر نہایت پرجوش اور مدلل تھی، ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس ملتوی کردی گئی۔ گاندھی جی نے سپرو اور ستیلواد کی زبانی کانفرنس کی روداد سنی اور اس کے بعد وائسرائے سے آٹھ بار ملاقاتیں کیں[2]۔ جس کے نتیجہ میں ۴ر مارچ کو "گاندھی اروِن پیکٹ" تیار ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے سول نافرمانی کی تحریک روک دی گئی۔ ستمبر میں گاندھی جی نے اپنے دوسرے کانگریسی رفقار کیساتھ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی[3]۔ اس بار کانفرنس کے مندوبین میں گاندھی جی، سپرو، امبیڈکر، ستیلواد اور آغاخاں بھی تھے۔ کانگریس کی نمایندگی تنہا گاندھی جی کر رہے تھے لیکن جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے طریقہ پر اتفاق رائے نہ ہوسکنے کے باعث گاندھی جی ہندوستان لوٹ آئے اور سول نافرمانی کی تحریک پھر شروع کردی۔ جس کے نتیجہ میں گاندھی جی سمیت کانگریس کے تمام رہنما گرفتار کرلئے گئے[4]۔ اب مسلم لیگ رفتہ رفتہ کانگریس کے مقابل آنے لگی۔ وہ مسلم اقلیت کے مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ تھی۔ اسے تنگ نظر اکثریت کا خوف راہ آزادی سے دور لے جارہا تھا۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" پاس کیا اس کے مطابق صوبوں کی خود اختیاری حکومت اور مرکز میں ایک وفاقی حکومت قائم کرنے کی تجویز تھی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بمبئی کے جلسوں میں مذکورہ ایکٹ پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا۔ "اس ایکٹ کے ذریعہ ہندوستان کو ذمہ داری تو صرف دو فیصدی دی گئی ہے۔ لیکن گورنر جنرل اور وائسرائے کے اختیارات خصوصی اور تحفظات کا حصہ ۹۸ فیصد رکھا گیا ہے[5]۔" اسی بنیاد پر ہندوستان کے ہر گروہ

---

[1] کانجی دوارکا داس: محمد علی جناح ص ۷۴۔
[2] ″ ″ ″ ″ ص ۷۹۔
[3] امین زبیری: سیاست ملیہ ص ۲۵۳۔
[4] احمر لاری: حسرت موہانی۔ حیات و کارنامے ص ۲۳۔
[5] کانجی دوارکا داس: محمد علی جناح ص ۸۹۔

اور ہر مکتب خیال کے افراد نے اس قانون کی مخالفت کی۔

ہندوستان میں ۳۷ء کے اوائل میں گیارہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس کو آٹھ ریاستوں میں اکثریت حاصل ہو گئی اور ان میں اس کی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ انتخابات سے قبل کانگریس نے مسلم لیگ سے مفاہمت کر لی۔ لیکن بعد میں غیر معمولی اور خلاف توقع فتح و کامرانی کے نشۂ میں اپنی وزارتوں میں حسب وعدہ مسلم لیگ کے نمایندوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ کے جداگانہ وجود ہی سے انکار کر دیا[1]۔ جس کے باعث مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس سے بدظن ہو گیا۔ ۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ میں شریک ہونے کے مسئلہ پر کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ مسٹر جناح نے اس دن کو یوم نجات کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اب مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کھلی جنگ چھڑ گئی۔ مسلم اقلیت کے بارے میں کانگریس کی روش سے مایوس ہو کر ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں ہندو مسلمانوں کو دو جداگانہ قومیں تسلیم کرتے ہوئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے قیام پاکستان کی قرارداد منظور کی اور پھر اس علیحدہ مملکت کے حصول کیلئے جدوجہد کرنے لگی۔

اس وقت سے ۴۲ء کے وسط تک ہندوستان کے حریت پسندوں، اور برطانوی حکومت کے درمیان سیاسی کشمکش برابر بڑھتی ہی گئی۔ اس دوران میں صلح و مصالحت کی بعض کوششیں ہوئیں۔ لیکن چونکہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کامل کے مطالبہ کو کسی طرح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئی اس لئے مفاہمت کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ بالآخر اگست ۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" (Quit India) کی تاریخی قرارداد منظور کی۔ جس کی بنیاد پر وہ انقلابی تحریک شروع ہوئی جسے "اگست ۴۲ء کی جدوجہد" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[2]۔ اس تحریک کو کچلنے کے لئے تمام اکابر سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔

---

[1] عبدالقدوس ہاشمی: پاکستان اور ہندوستان ص ۸۹۔

[2] اسرار احمد: قومی جدوجہد کے ڈھائی سو سال؛ (مضمون) رسالہ آجکل دہلی جنگ آزادی نمبر ص ۱۴

۱۹۴۵ء میں وائسرائے لارڈ ویول نے ہندوستان کے سیاسی مسائل حل کرنے کے لئے مختلف جماعتوں اور قوموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس شملہ میں بلائی، مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو ویول پلان منظور کرنے کے لئے آمادہ کرلیا، لیکن ایگزیکیوٹیو کونسل میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے مسئلہ پر اختلاف کے باعث کانفرنس ناکام ہو گئی۔ مسٹر جناح انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے شدید مایوس و بدظن ہو گئے تھے، اور انھیں مسلمانوں کا یکساں دشمن سمجھنے لگے تھے۔ اس لئے اب وہ ان دونوں سے براہ راست ٹکر لینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔[1] اگست ۱۹۴۶ء کے وسط میں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش نے بھیانک فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کرلی جس کی آگ میں مغربی بنگال، بہار، بمبئی، اور پنجاب کے متعدد مقامات جل کر خاکستر ہو گئے۔ اس مرحلہ پر سردار پٹیل، جواہر لال نہرو اور گاندھی جی بھی تقسیم ملک کے حامی ہو گئے۔ بالآخر بعد از خرابی بسیار ایک نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ملک کی تقسیم اور اختیارات کی منتقلی کے لئے لندن سے بھیجا گیا۔ جنھوں نے مقررہ میعاد سے بھی پہلے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ اگست کو ہندوستان کے خودمختار ڈومینین کا افتتاح کیا۔[2] مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم میں تقسیم ملک کے وقت کی ملکی و جانی تباہیوں کی بڑی دلدوز مرقع کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پورا متحدہ پنجاب موت و تباہی کا قبرستان بن گیا تھا۔"[3] ڈاکٹر سید عابد حسین

---

[1] قائد اعظم محمد علی جناح کے ایک بہت قریبی دوست کانجی دوارکاداس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ وہ ۱۹۴۶ء تک متحدہ ہندوستان کیلئے کام کرنے پر تیار تھے۔ وہ درحقیقت پاکستان کا مطالبہ پیش کرکے مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرانا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ کانگریس لیڈران سے کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے تھے تو اسمیں بجوہ حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتے پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظرانداز کرنے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ کو کانگریس، جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کرسکیں گے"
(محمد علی جناح۔ ص ۱۲۲۔ علمی مجلس دہلی ۱۹۷۶ء)

[2] Leonard Mosley: Last days of British days P.250-

[3] Azad: India Wins Freedom P.190 (First Edition)

رقم طراز ہیں:۔

> ”تقسیم کے دوران خوف و ہراس اور قہر و غضب کے طوفان میں
> سرحد کے دونوں طرف چھ لاکھ مرد و عورت قتل ہوئے اور ایک
> کروڑ چالیس لاکھ کو بے گھر ہونا پڑا۔“[1]

(۳)

ہندوستان ہمیشہ سے مختلف تہذیبوں کا سنگم اور نوع بنوع مذاہب و ادیان کا گہوارہ رہا ہے کیوں کہ یہاں دنیا کی مختلف اقوام کی آمد کا سلسلہ ہر عہد میں برابر جاری رہا، اور مختلف رنگ و نسل، زبان و معاشرت، عقاید و نظریات اور طرز معاشرت کی حامل یہ قومیں اپنے جلو میں اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کے جلوے ساتھ لائیں۔ مختلف تہذیبوں کا یہ حسین گلدستہ صدیوں سدا بہار رہا۔ اور اس کے باعث ہندوستان میں ایک مشترک سماجی تہذیب کا ارتقا ہوا۔ لیکن انقلاب ۵۷ء کے دوررس اثرات نے جہاں زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا وہیں ہندوستان کے معاشرتی سمندر کی پرسکون سطح میں بھی شدید ارتعاش پیدا ہوا۔

انگریزوں نے تجارتی زینہ سے ہندوستان میں آنے کے بعد صرف سیاسی تسلط کی بنا دیں استوار نہیں کیں بلکہ اپنے مذہب و زبان اور تعلیم و تہذیب کے فروغ کی بھی حیرت انگیز کوششیں کیں۔ قانون فطرت کے مطابق مفتوح اقوام ہمیشہ غالب و فاتح قوموں کی ذہنی غلامی میں اسیر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی مغربی تہذیب اور عیسائیت کے فروغ کی ایک برقی لہر چل پڑی۔ جس سے خاص طور پر یہاں کی نوجوان نسل بہت متاثر ہوئی اور اس کے نتیجہ میں سماج سدھارا اور مذہب محافظ تحریکوں کا آغاز ہوا۔

ہندوؤں میں سماجی اصلاح کی تحریکیں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ جن میں سب سے قابل ذکر برہمو سماج ہے، جسے راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں

---

[1] عابد حسین: ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ص ۱۹۲

قائم کیا تھا۔ اس تحریک کی دو نوعیتیں تھیں۔ مذہبی اور سماجی۔ مذہبی اعتبار سے اس کا مقصد ہندو مت میں پائی جانے والی اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے ثابت شدہ وحدانیت ہے۔ راجہ رام موہن رائے وحدت خدا کے قائل تھے اور مورتی پوجا کو ہندو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے ان کی مساعی کے نتیجہ میں بالخصوص عورتوں کی پست حالت میں بہت سدھار ہوا اور ان کے بہت سے حقوق بحال ہوئے۔ مثلاً ستی، تعدد ازدواج اور کم عمری کی شادی کا خاتمہ ہوا۔ بیوہ کو نکاح ثانی کا حق ملا، لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کا رجحان عام ہوا[1] وغیرہ۔

برہمو سماج تحریک کا اثر علاقائی نقطۂ نظر سے زیادہ تر بنگال تک محدود رہا مگر اس کی ایک شاخ بمبئی کے علاقے میں پرارتھنا سماج کے نام سے پھلی پھولی اور پروان چڑھی اس کا مقصد بین القومی شادی بیاہ، بیواؤں کو دوسری شادی کا حق دلانا، پست ماندہ اقوام میں بیداری پیدا کرنا اور عورتوں کی فلاح و اصلاح کے کام انجام دینا تھا۔ پرارتھنا سماج کے روح رواں مہادیو گووند رانا ڈے تھے جن کی کوششوں سے مغربی ہندوستان میں دکن تعلیمی سوسائٹی، انڈین سوشل کانفرنس اور تنظیم بیاہ بیوگان وغیرہ متعدد تنظیمیں قائم ہوئی تھیں، رانا ڈے کے علاوہ پرارتھنا سماج کے ایک ممتاز رہنما رام کرشن بھنڈارکر تھے۔[2]

مذکورہ بالا دونوں سماج سدھار تحریکیں مغربی تہذیب و تمدن کی پیداوار تھیں۔ اس کے برعکس آریہ سماجی تحریک ہندوستان کے ماضی سے فیضان حاصل کرنا چاہتی تھی، اس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ء - ۱۸۸۳ء) تھے، ان کا مقولہ تھا "ویدوں کی طرف لوٹو"۔ وہ ویدوں کے مطابق سارے ہندوستانی سماج کو ڈھالنا چاہتے تھے، خالص سماجی اصلاحات میں وہ بچپن کی شادی، ذات پات کی بندشوں کی مخالفت، تعلیم نسواں، اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کے موافق تھی۔ آریہ سماجی تحریک کا سماج سدھا پروگرام شدھی تحریک سے بہت متاثر ہوا۔ سوامی دیانند کی وفات کے بعد لالہ ہنس راج، لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند نے اس تحریک کے مقصد اور کام کو آگے بڑھایا۔

انیسویں صدی کی چوتھی اہم سماجی تحریک رام کرشن مشن کے نام سے مشہور

---

[1] [2] جعفر حسن۔ ہندوستانی سماجیات ص ۱۲۵، ۱۲۶ (انجمن ترقی اردو ہند۔ بار اول ۱۹۵۵ء)

ہوئی۔ برہمو سماج اور پرارتھنا سماج اگر مغربیت کی طرف مائل تھے اور آریہ سماج پر قدیم ہندومت غالب تھا تو رام کرشن مشن مغرب و مشرق کا امتزاجی نمونہ اور دونوں تہذیبوں کے فلسفے سے یکساں سرشار تحریک تھی، اس کے بانی رام کرشن پرم ہنسا (۱۸۳۴ء ۔ ۱۸۸۶ء) تھے، وہ کلکتہ کے قریب اپنے معتقدوں کو رواداری، بلند خیالی، سادہ زندگی اور جفاکشی وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے۔ جو تمام مذاہب عالم کی اساسی قدریں ہیں۔ خود رام کرشنا تو اپنی زندگی میں گوشہ گیر اور گمنام رہے لیکن ان کے مریدوں میں نریندر دت عرف سوامی وویکانند (۱۸۶۳ء ۔ ۱۹۰۲ء) نے اپنے گرو کے نام پر رام کرشن مشن کو ایک منظم تحریک بنا کر اس کے کام اور شہرت کو ملک اور بیرون ملک خاص طور پر امریکہ میں بہت پھیلایا۔ اس مشن کی بنیاد گو ہندومت پر قائم ہے، مگر وہ تمام مذاہب کی حقانیت و صداقت پر اعتقاد رکھتے ہیں؛ یہ تحریک معاشرہ کی خدمت کو مذہبی اور روحانی زندگی کی تکمیل کے لئے لازمی قرار دیتی ہے اس مشن کے تحت ملک بھر میں اسکول اور شفاخانے قائم ہیں۔ جہاں اس تحریک کے علمبردار حتی المقدور تن، من اور دھن سے دکھی کمزور اور مصیبت زدہ عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔

معاشرتی اصلاح کی تحریکوں میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کی بناء امریکہ میں ۱۸۷۵ء میں مادام بلواسکی اور کرنل الکٹ کے ہاتھوں پڑی، لیکن چند ہی سال بعد یہ دونوں ہندوستان آ کر بس گئے اور مدراس کے نزدیک اس کا مرکز قائم ہو گیا۔ ہندوستان میں اس سوسائٹی کو غیر معمولی مقبولیت عطا کرنے کا سہرا مسز اینی بیسنٹ کے سر ہے۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی نے اپنے آغاز قیام ہی سے قدیم ہندومت کے احیاء سے اپنا تعلق وابستہ رکھا۔ چنانچہ مسز بیسنٹ کی کوشش سے بنارس میں مرکزی ہندوانی مدرسہ قائم کیا گیا جو بعد میں بتدریج کالج اور پھر ۱۹۱۵ء میں ہندو یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں سماج سدھار کی کوششوں میں جہاں منظم تحریکوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہیں انفرادی طور پر بھی بعض مصلحین نے اہم کارنامے انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر (۱۸۲۰ء ۔ ۱۸۹۱ء) اور

شیونرائن پرمہار ۱۸۴۰ء۔ ۱۹۰۹ء) نے تعلیم نسواں، مرد و عورت کے مساویانہ حقوق، اور نکاح بیوگان کی حمایت اور کم عمری کی شادی اور ذات پات کے خلاف بڑی کامیاب جدوجہد کی، جس کے نتیجہ میں اس عہد کے مخصوص حالات میں نہ صرف مغربی تہذیب کے سیلاب کے آگے مضبوط بند تعمیر ہو سکا بلکہ ہندو مت اور ہندو کلچر کے تحفظ کا نمایاں کام انجام دیا۔ دوسرے سماج سدھارکی ان انفرادی و اجتماعی کوششوں کے باعث قدیم رسوم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہندو معاشرہ کو راحت کا سانس نصیب ہوا ان اصلاحی تحریکوں کے ردعمل کے طور پر قدامت پسندوں نے بھی کلکتہ میں ۱۸۷۳ء میں سناتن دھرم رکشنی سبھا کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو مذہبی سے زیادہ سماجی و تہذیبی امور میں ہر طرح کی تجدیدی و اصلاحی کوششوں کے خلاف تھا، اور دھرم کی طرح سماج کو بھی بدستور قائم رکھنے کا حامی و مبلغ تھا۔

ہندوؤں کی اپنے مذہب و سماج کے تحفظ و اصلاح کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی برابر سرگرم عمل رہے۔ اور ان کے اندر بھی دین و عقیدہ کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی اصلاح کے لئے مختلف تحریکوں نے جنم لیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکامی انگریزی حکومت کے قیام و استحکام اور نئے حکمرانوں کے بغض و عناد اور بدگمانی کے باعث مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں مبتلا تھے۔ ان کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا، معاشی وقار گر گیا تھا۔ اقتصادی حالت بدتر ہو گئی تھی، دینی عقائد و نظریات بگڑ گئے تھے۔ اور نئے دور کے بدلے ہوئے حالات میں ان کا قومی وجود تک خطرہ میں پڑ گیا تھا[1]۔ قومی زوال و ادبار کے ایسے نازک اور ناموافق زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی سے سرسیّد احمد خاں جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور حکومت کا دم واپسیں دیکھا تھا۔ چنانچہ اپنی حساس اور اثر پذیر طبیعت کے باعث مسلمانوں کے ہمہ جہتی انحطاط سے انھیں بڑی تکلیف ہوئی وہ اپنے چند مخلص رفیقوں کو لے کر آگے بڑھے اور اپنی منظم اصلاحی سرگرمیوں سے تباہی کے

---

[1] محمد عمر الدین: سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر (مضمون)، مشمولہ علی گڑھ تحریک ص، ۱۱ ۶۰ء۔

بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچا لیا۔ سر سیّد نے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۴ء میں مراد آباد اور غازیپور میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے۔ ۱۸۶۳ء میں غازیپور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، جس کے مقاصد میں انگریزی اور دوسری یوروپین زبانوں کی اہم علمی و فنی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا اور قدیم مصنفین کی نادر کتابوں کی جستجو و اشاعت کا کام تھا، سر سیّد کے علی گڑھ تبادلہ کے بعد سوسائٹی کا دفتر وہاں منتقل ہو گیا۔ علی گڑھ میں اس قطرہ نے موج رواں کی شکل اختیار کر لی، اور اس کی سرگرمیوں و مقبولیت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ یہی سوسائٹی درحقیقت علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے[۱]۔ ۱۸۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اس سے اصلاحی کوششوں کو مقبول بنانے میں بہت کام لیا گیا۔ اس اخبار کا ایک کالم اردو اور ایک انگریزی میں ہوتا تھا۔ اس کا خاص مقصد بقول حالیؔ "گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا[۲]۔" اس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر طرح کے مضامین چھپتے تھے۔

دسمبر ۱۸۷۰ء میں سر سیّد نے اسٹیل اور اڈیسن کے انگریزی رسالوں ٹیٹلر[۳] اور اسپکٹیٹر[۴] کے طرز پر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس رسالہ کا مقصد سر سید کے الفاظ میں یہ تھا:۔

> "ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ تاکہ جس حقارت سے مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور

---

[۱] اصغر عباس: سر سیّد کی اردو صحافت ص، ۵ (انجمن ترقی اردو ہند۔ دسمبر ۱۹۷۵ء)۔

[۲] حالیؔ: حیات جاوید ج ۱ ص ۱۱۳۔

[۳، ۴] یہ دونوں رسالے ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری رہے۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انگریز ان کے مضامین پر وجد کرتے تھے۔ ان سے انگریزوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات پر بڑا اثر ہوا تھا۔

مہذب قومیں کہلاویں۔"[1]

سماجی اصلاح کی جدوجہد میں اس رسالہ سے بڑی مدد ملی۔ تہذیب الاخلاق کی معاشرتی، تمدنی، ادبی اور مذہبی خدمات کا تجزیہ خود سرسید نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے کیا ہے۔[2] اسی سال انگلستان سے واپسی پر سرسید نے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ جس کا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طلبہ کس وجہ سے کم پڑھتے ہیں، ان میں علوم قدیمہ کے زوال کا کیا سبب ہے، اور علوم جدیدہ کا رواج کیوں نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ کمیٹی نے اس سلسلہ میں تمام معلومات فراہم کرکے مذکورہ امور کے دو اسباب اور ان کے دفعیہ کی تدابیر کی نشاندھی کی۔[3]

۱۸۷۵ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں مدرسہ ابتدائی قائم کیا جو دو سال بعد اینگلو اورینٹل کالج یا مدرسۃ العلوم کی شکل اختیار کر گیا۔ علی گڑھ کالج کہنے کو تو ایک کالج تھا مگر عملاً اسے مسلمانان ہند کے اہم سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔[4] شروع میں قدامت پسند علماء اور بعض روشن خیال لوگوں (مثلاً اکبر الہ آبادی) کی طرف سے اس کالج کی شدید مخالفت ہوئی مگر رفتہ رفتہ سب لوگ اس کی افادیت کے قائل ہوتے گئے۔ اسی کالج نے آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا اور آج بھی یہ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں مسلمانوں کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ علاوہ ازیں سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ جس کے مقاصد میں مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہونچانے کی کوشش کرنا، علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم کو تقویت دینا، مسلمانونکی تعلیم کے انگریزی مدارس میں مذہبی تعلیم کے عمدگی سے انجام پانے کی کوشش کرنا وغیرہ شامل تھے۔[5]

مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح و درستگی

---

[1] مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خویشگی ص ۳۷۔ [2] ملاحظہ ہو رسالہ تہذیب الاخلاق ج ۴ ش ربیع الاول ۱۲۹۰ھ

[3] حالی: حیات جاوید ج ۲ ص ۲۲۶۔

[4] سید عبداللہ: اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور ج ۲ ص ۱۲۱۔

[5] حالی: حیات جاوید ج ۱ ص ۳۰۲۔

کے لئے سرسید کی مذکورہ بالا تمام کوششوں نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی، جو تاریخ میں علی گڑھ تحریک کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ اس تحریک کی غیر معمولی کامیابیوں میں سرسید کے خلوص و صداقت کے ساتھ ان کے ایثار پیشہ اور پاک باطن رفقاء کا بھی نمایاں حصہ ہے، جن میں شبلی، حالی، محسن الملک، وقار الملک، مولوی سمیع اللہ اور چراغ علی کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک کے بالواسطہ دوررس اثرات سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس عہد کے بکثرت اہل علم اور دانشور متاثر ہوئے۔

واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صرف سیاسی اور تعلیمی ہی نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی تحریک بھی تھی[1]۔ اس تحریک کی وسعت و جامعیت کے حدود معاشرت، تعلیم، مذہب اور ادب تک وسیع تھے۔ اور زندگی میں یہ ترقی پسند زاویۂ نظر کی علمبردار تھی۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوؤں کی سماجی اصلاح کی جو تحریکیں سرگرم ہوئیں۔ ان میں گوکھلے کی بھارت سیوک سماج (Servants of India Society) ۱۹۰۵ء، نرائن لمبار جوشی کی سوشل سروس لیگ (۱۹۱۱ء) اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (۱۹۲۰ء) ہردے ناتھ کنزرو کی سیوا سمتی الہ آباد (۱۹۱۴ء) اور کل ہند خواتین کانفرنس (۱۹۲۳ء) مہاتما گاندھی کی ہریجن سیوک سماج (۱۹۳۳ء) اور گاندھی کے پیروکاروں کی قائم کردہ سرودے سماج خاص طور پر قابل ذکر ہیں[2]۔ ان تمام تحریکوں نے ہندوستانی سماج کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور ملک کے ہر طبقہ کے خیالات، عادات و اطوار، رسم و رواج اور طرز معیشت و معاشرت میں انقلاب عظیم رونما کیا ہے۔

یہ درست ہے کہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی تنگ نظری ختم کر کے ان میں سیاسی خود اعتمادی اور ان کے خیالات میں وسعت پیدا کی، اور مسلمانوں کی نئی نسل میں جدید علوم اور انگریزی زبان کو فروغ دینے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں لیکن اسی کے

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۱۱۸۔

[2] جعفر حسن: ہندوستانی سماجیات ص ۱۳۰۔

ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کا جو سیلاب ہندوستان میں برطانوی تسلط مکمل ہونے کے بعد نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اس تحریک نے نہ صرف اس سے حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا، بلکہ اس کے ضرورت سے زیادہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے زندگی کے روحانی مطالبات کو شدید نقصان پہونچا[1] چنانچہ ہندوستان میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مغربیت کے مسموم اثرات سے نئی نسل کے مذہب اور روحانی اقدارِ حیات کو محفوظ رکھنے کی متعدد کوششیں ہوئیں۔

شبلیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ وغیرہ نے اپنی بلند آہنگ شاعری کے ذریعہ اس کے خلاف صورِ اسرافیل پھونکا، حسرتؔ موہانی، ابوالکلام آزاد، محمد علی، سیّد سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی نے مضامین لکھ کر مسلمانوں کو خطرہ سے آگاہ کیا۔ اجتماعی جدوجہد کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کی مساعی قابل ذکر ہیں[2]۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر ان دونوں تعلیمی مراکز کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے ہیں۔ بدعات و رسوم کی اصلاح، عقائد کی درستگی، تبلیغ دین، فرقِ ضالہ سے مناظرہ وغیرہ میں ان حضرات کی جدوجہد لائق تحسین ہے[3]۔ قدیم طرز کے مدارس اور جدید یونیورسٹیوں کے درمیان ۱۸۹۸ء میں چند وسیع النظر، روشن ضمیر، اور حالات زمانہ سے باخبر علماء کے ہاتھوں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا۔ اس کا طرۂ امتیاز قدیم و جدید کا متوازن امتزاج ہے۔ ندوہ کے قیام کا بنیادی مقصد قدیم نظام تعلیم کی اصلاح اور مسلمانوں کے باہمی نزاع و اختلاف کو دور کر کے اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا تھا۔ اور بلاشبہہ وہ اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا، دارالعلوم ندوہ کی شہرت و مقبولیت اور افادیت میں سب سے بڑا حصہ علامہ شبلیؔ نعمانی کا ہے۔ سید سلیمان ندوی کی شخصیت اسی مادرِ علمی کا گوہر شب چراغ اور اسی دانش کدۂ علم و فن کا ایک گل سرسبد تھی۔

---

[1] سید عبداللہ: اردو ادب کی ایک صدی ص ۱۹۔

[2] ابوالحسن علی: ہندوستانی مسلمان ص ۱۱۹ (تنویر پریس لکھنؤ ۱۹۶۱ء)

[3] یہ دونوں ادارے ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند کے ہاتھوں علی گڑھ میں پہلی آزاد قومی درسگاہ جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا، اس کے اصل بانی مولانا محمد علی، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور حکیم اجمل خاں تھے، یہ تعلیمی ادارہ تحریک ترک موالات کے تحت سرکاری درسگاہوں کے تعلیمی بائیکاٹ اور آزاد قومی درسگاہوں کے قیام کا ایک شاخسانہ تھا۔ سید سلیمان ندوی، ندوہ کے علاوہ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے کاموں میں عملاً شریک رہے۔ ان سب کے تقسیم اسناد کے جلسوں میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ معارف میں شرح وبسط کے ساتھ اپنے تاثرات تحریر کرتے جو قومی وملی اور علمی وتعلیمی نقطۂ نظر سے درس بصیرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں جب نان کوآپریشن تحریک کے عین شباب کا دور تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی باد نسیم پورے ملک میں چل رہی تھی کہ انگریزوں نے فقید المثال فرقہ وارانہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے ترک موالات کے ایک لیڈر سوامی شردھانند کو جیل سے رہا کر کے شدھی سنگھٹن کی تحریک شروع کرادی[1]۔ فروری سنہ ۲۳ء سے جولائی سنہ ۲۳ء تک اس تحریک کا بڑا زور رہا۔ بھارت شدھی سبھا کے رد عمل میں مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا محاذ قائم ہو گیا۔ اور تنظیم کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تصادم وسنگھرش سے جذباتی ہم آہنگی اور فرقہ وارانہ اتحاد و یکجہتی کو اس ملک میں ناقابل تلافی نقصان پہونچا، اور آزادئ وطن کی جد وجہد اس سے شدید طور پر متاثر ہوئی جس کی لڑائی ہندو مسلمان بلا امتیاز مذہب ونسل شانہ بشانہ لڑ رہے تھے مگر پھر انگریزوں کی اس چال کو محسوس کر لینے کے بعد دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے اسکی تلافی کی بھر پور کوشش کی۔

(۴)

سنہ ستاون اردو ادب کی تاریخ میں بھی ایک انقلاب آفریں سنگ میل شمار کیا جاتا ہے، اگرچہ مغربی اثرات اور نئے طرز احساس کی پرچھائیاں اس سے کچھ پہلے

---

[1] قاضی عبد الغفار: حیات اجمل ص ۲۸۴ (انجمن ترقی اردو ہند)

اردو ادب میں نظر آنے لگی تھیں۔ جس کے واضح نقوش فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج کی ادبی خدمات میں ملتے ہیں، لیکن ہنگامہ غدر کے بعد یہ نقوش مزید گہرے ہو گئے۔ قدیم زوال آمادہ تہذیب، جمود پذیر ماحول اور عیش پرستانہ زندگی کا ترجمان تھا۔[1] سرسیّد اور ان کے رفقاء نے ادب کے اس پرسکون سمندر میں اپنی ضرب کلیم سے ارتعاش پیدا کر دیا اور ادب برائے زندگی کا نعرہ لگا کر اردو ادب کو ایک نئی زمین اور نئے آسمان سے روشناس کیا۔ علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کے جلی عنوانات مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری ہیں۔ سرسید کے پیدا کردہ ادبی سرمایہ میں یہ عناصر تقریباً ہر جگہ جلوہ گر ہیں۔[2]

سرسید کے ادبی نظریات کو ان کے جن رفقاء نے پروان چڑھایا اور مقبول عام کیا، ان میں حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، چراغ علی اور محسن الملک کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا حالی (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴ء) اپنے فکر و نظر میں سرسید کی فکری روح کے غالباً سب سے کامیاب ترجمان تھے۔ انھوں نے روایتی غزل کی اصلاح پر خصوصی توجہ مبذول کی اور مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر نہ صرف اردو تنقید کو ایک صحیفہ عطا کیا بلکہ شعر و تغزل کو نئے امکانات اور جدید وسعتوں سے روشناس کرایا، ان کا مسدس مدوجزر اسلام اردو کی پہلی عظیم نظم ہے، جو مسلمانوں کی عظمت پارینہ کا نوحہ بھی ہے اور ان کی بیداری کے لئے صور اسرافیل بھی، نثر میں حالی نے حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب جیسی معیاری ادبی سوانح عمری لکھ کر اس صنف ادب میں اوّلیت کا تاج زیب سر کیا۔

شبلی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) رفقائے سرسید میں مختلف حیثیتوں سے سب سے بلند قامت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ سرسیّد سے بعض سماجی روایات اور قومی و سیاسی نظریات میں اختلاف رائے رکھتے تھے، لیکن ادبی نقطۂ نظر میں دونوں ہم آہنگ تھے۔ ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کو علمی و تحقیقی تصانیف کا سرمایہ دار بنا دیا۔ وہ بیک وقت

---

[1] وحید قریشی: اردو ادب کی ایک صدی، مصنفہ ڈاکٹر عبداللہ (پیش لفظ) ص ۱۶۔
[2] سید عبداللہ: سرسید کا اثر اردو ادبیات پر۔ علی گڑھ تحریک ص ۲۸۱۔

ادیب بھی تھے، شاعر بھی، مفکر بھی تھے۔ اور مورّخ بھی، سوانح نگار بھی تھے اور نقّاد بھی۔ انھوں نے ادب کے ان تمام مختلف النوع میدانوں میں اپنے اشہب قلم کی جولانی دکھائی ہے۔ ان کا سرمایہ شاعری بیشتر سیاسی و قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ تاریخ ادب میں شعرالعجم، اور موازنہ انیس و دبیران کی معرکے کی تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں سیاسی، ادبی اور تعلیمی مقالات اور خطوط و مکاتیب کا گرانقدر ذخیرہ ان کی نثر نگاری کی اہم یادگاریں ہیں۔

نذیر احمد (۱۸۳۱ء۔ ۱۹۱۲ء) نے مختلف موضوعات پر بہت کثرت سے تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔ مذہبی تصانیف میں الحقوق والفرائض (۳ جلدوں میں) اور ترجمہ قرآن مجید قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے قانون کی کتابوں کے ترجمے کئے اور بچوں کے ادب میں بھی حصہ لیا۔ ان کے کثیر التعداد ناولوں (مثلاً ابن الوقت، مرآۃ العروس، بنات النعش اور فسانہ مبتلا وغیرہ) میں عقل پر زور، دین اور عقل کا پیوند، تعلیم کی اہمیت، علوم جدیدہ کی ضرورت، قوانین فطرت کی پیروی، تعلیم نسواں اور اخلاقیات وغیرہ موضوعات کی روح کارفرما ہے۔ جو سرسید اسکول کا مشترک طرۂ امتیاز ہے۔

منشی ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء۔ ۱۹۱۰ء) ریاضی اور تاریخ کے مرد میدان تھے ان موضوعات پر ان کی کتابیں شہرت عام رکھتی ہیں۔ اپنی زود نویسی کے باعث بازار ادب میں جنس گراں ارزاں نہ بن سکے۔ محسن الملک (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۰۷ء) سرسیّد کے شہرۂ آفاق رسالہ تہذیب الاخلاق کے اہم مقالہ نگاروں میں تھے، انھوں نے افکار سرسیّد کی ترجمانی اور تبلیغ و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ وہ اردو کے اچھے خطیب اور مصنف بھی تھے۔ مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء، ۱۸۹۵ء) بھی سرسیّد کے متبع خاص اور ان کی فکر کے مبلغ تھے۔ انھوں نے زیادہ تر انگریزی میں لکھا ہے، اردو میں صرف "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" اور چند رسالے ان کی یادگار ہیں۔

سرسیّد کی ادبی تحریک سے بالواسطہ پورا ایک عہد متاثر ہوا ہے۔ رفقاء سرسیّد کے حلقہ سے باہر اس تحریک کے مخالف اور موافق دونوں ہی طبقہ کے لوگوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے مفید اثرات و نتائج قبول کئے۔ ان میں شعراء بھی تھے، نثر نگار بھی

ناول نویس بھی اور ڈراما نگار بھی۔ شاعروں میں اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴-۱۹۱۷) سرور جہان آبادی (۱۸۷۳-۱۹۱۰) شاد عظیم آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۵) اور اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱) کے نام لائق ذکر ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کو بچوں کی شاعری کے سلسلہ میں امتیاز حاصل ہوا۔ ان کی نظمیں مناظر قدرت کی ہو بہو مرقع کشی کا شاہکار ہیں۔ اخلاق و سادگی اور موسیقی و مصوری ان کی شاعری کے خاص جوہر ہیں۔ سرور جہان آبادی کی نظمیں وطنی احساسات سے پُر اور سادگی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ شاد عظیم آبادی اپنی غزلوں اور مراثی کے لئے مشہور ہیں۔ انکے تغزل میں بقول سید عبداللہ "غم آمیز، ابنساط یا ابنساط آمیز غم پایا جاتا ہے۔[1] اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کو اصلاح معاشرت اور اصلاح اخلاق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ اس لئے مغربی تہذیب ان کے طنز و تعریض کا خاص نشانہ بنی۔ انھوں نے قوافی کی سنگلاخ زمینوں میں جدت و ندرت کا جو گلستاں کھلایا ہے اس کی نظیر خال خال ہی مل سکتی ہے۔

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰-۱۹۱۰) بھی علی گڑھ تحریک سے بالواسطہ متاثر ہونے والی ایک عظیم المرتبت شخصیت اور سحر نگار انشاء پرداز تھے۔ ان کی تصانیف میں دربار اکبری، قصص ہند، آب حیات، نگارستان فارس، نیرنگ خیال اور سخندان فارس خاص طور پر اہم ہیں، انداز بیان کے اعتبار سے آب حیات آزاد کا شاہکار ہے۔ پوری کتاب کی ڈرامائی ترتیب کے اندر مصوری اور مرقع نگاری سے ہر منظر روشن اور ہر شخصیت کو زندہ کر دکھایا ہے ان کے زرنگار قلم نے تخیل کی مدد سے جو دلکش تصویریں کھینچی ہیں اس سے ذوق و وجدان تو محظوظ و مسحور ضرور ہوتے ہیں، لیکن مؤرخانہ حقیقت نگاری کو اس سے شدید نقصان پہونچا ہے۔ تاہم ان کا اسلوب بیان منفرد و یکتا ہے۔ جس کی کامیاب تقلید آج تک کوئی نہ کر سکا وہ جدید اردو نظم کے بانیوں میں بھی تھے۔ حالی کی طرح آزاد نے بھی نیچرل شاعری پر زور دیا ہے انھوں نے کئی مثنویاں لکھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی نثر میں ان کی نظموں سے زیادہ

---

[1] سید عبداللہ: اردو ادب کی ایک صدی ص ۸۵۔

شاعرانہ کیفیت و اہتزاز حاصل ہوتا ہے۔

اردو ناول نگاری کے میدان میں رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶-۱۹۰۳) عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰-۱۹۲۶) محمد ہادی رسوا (۱۸۵۸-۱۹۳۱) اور راشد الخیری (۱۸۴۶-۱۹۳۶) نے بڑی یادگار اور عہد آفریں خدمات انجام دی ہیں۔ سرشار ناول نگار کی جینس رکھتے ہیں[1]، ان کا شہرۂ آفاق ناول "فسانہ آزاد" جو لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کی متحرک تصویر ہے اردو ادب میں ایک خاص اہمیت و شہرت کا حامل ہے۔ اس کو غیر معمولی قبول عام نصیب ہوا، شرر نے اصلاحی، تاریخی اور معاشرتی ناول نگاری میں امتیاز خاص حاصل کیا۔ "فردوس بریں" ان کا شاہکار اور مقبول ترین ناول ہے۔ رسوا کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ جہت تھی۔ "امراؤ جان ادا" ان کا زندہ جاوید ناول ہے جسے اردو میں کلاسکس کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھنوی معاشرت کے ایک خاص پہلو کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ راشد الخیری نے عورتوں کی اصلاح اور تعلیم و ترقی کے مقصد سے کئی ناول لکھے۔ وہ اپنے خاص انداز بیان کے باعث "مصور غم" مشہور ہوئے۔ ان کا پائیدار کردار نانی عشو بقول علی عباس حسینی "ادب میں مستقل جگہ پانے کا مستحق ہے۔[2]

جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء) دنیا کی تاریخ میں ایک بہت بڑی حد فاصل ہے، جہاں سے مختلف میلانات و رجحانات اور علم و تمدن کی سرحدیں جدا ہوتی نظر آتی ہیں، پورا ہندوستان قومی و سیاسی بیداری کی آماجگاہ اور آزادی و حریت کے غلغلہ سے گونج رہا تھا تحریک ترک موالات کے نتیجہ میں مغربیت مخالف رجحان کے باعث مشرقیت کی تحریک کو بڑا فائدہ پہونچا۔ اردو زبان اسلامی علوم اور تاریخ و مذہب کی سرمایہ دار بنی۔ اردو ادب میں بھی ایک نیا موڑ پیدا ہوا۔ شاعروں اور ادیبوں کے فنی میلانات عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گئے۔ دبستان شبلی کے ادیبوں نے دلکش اور موثر انداز میں تاریخ کو پیش کیا اور اسلام کے فکری و عملی پہلو کا محققانہ تجزیہ کر کے اسلام کو جدید سائنس اور علم کی دنیا میں کامیاب ترین

---

[1] محمد احسن فاروقی: ناول کی تنقیدی تاریخ ص ۷۲ (سرفراز پریس لکھنؤ۔ اگست سنہء)۔

[2] علی عباس حسینی: ناول کی تنقید و تاریخ ص ۱۴۱-۳ (انڈین بک ڈپو لکھنؤ)۔

مذہب ثابت کیا۔ اس عہد کے نثر نگاروں میں سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی ابوالکلام آزاد، عبدالسلام ندوی، حکیم عبدالحیٔ اور شاعروں میں حسرتؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ کے نام ممتاز اور لائق ذکر ہیں۔

سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۳ء) اپنے استاذ شبلی کی طرح مغرب کے سارے نظام علمی و تمدنی کے مخالف تھے۔ انھوں نے بکثرت علمی و تحقیقی اور تاریخی و ادبی کتابیں لکھی ہیں۔ سیّد صاحب کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی موضوعات میں ادب کا رنگ و لطف پیدا کر دیا اور تحقیق و تنقید کو گلے ملایا ہے۔ عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۷۷ء) ایک فلسفی، صحافی، مذہبی مؤرخ اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے فلسفہ کے موضوع پر اردو میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مزید برآں ان کے ہفتہ وار اخبار "صدق جدید" میں ان کے ادبی و تنقیدی مضامین، کتابوں پر تبصرے اور شذرات کثرت سے شائع ہوئے، جن سے ان کی گہری ادبی بصیرت اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ ان کی تمام تخلیقات کے بنیادی محور دو ہیں۔ انشا پردازی اور مذہب کا اثر۔

ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۵۸ء) شبلی سے متاثر تھے۔ اسی باعث وہ بھی سرسیّد کے اثرات کے شدید مخالف تھے۔ وہ احیائے مشرقیت کی تحریک کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ اپنے پیغام کی ترویج و اشاعت کی۔ مسلمانوں میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں ان اخبارات کا نمایاں حصّہ ہے۔ آزادؔ کا اسلوب ان کی عظیم و منفرد شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ شوکت الفاظ، جوشِ خطابت، وسعت علمی، اور شاعرانہ رعنائی اس طرز کے بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ نے درست لکھا ہے کہ "ابوالکلام کا اسٹائل عظمت اور شان و شوکت کے اعتبار سے ابوالفضل سے مشابہ ہے۔" لہ

عبدالسلام ندوی (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۵۶ء) دبستان شبلیؔ کے گل سرسبد تھے، انھوں نے

لہ ڈاکٹر عبداللہ: اردو ادب کی ایک صدی ص ۱۱۹۔

مختلف علمی و مذہبی موضوعات پر کثرت سے کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان کا خاص موضوع شعر و ادب تھا، اس کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے اور دیدہ ور محقق ومؤرخ بھی۔ خالص ادبی موضوعات پر ان کی کتابوں شعرالہند، اقبال کامل اور مقالات عبدالسلام کو شہرت و مقبولیت کی دنیا میں کلاسکس کا درجہ مل چکا ہے۔ شعرالہند اردو اصناف سخن کی تاریخ، اور شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ عبدالسلام، شبلی اسکول کے ادیبوں میں اسلوب شبلی کے سب سے کامیاب مقلد ہیں۔ حکیم عبدالحیؔ (سنہ ۱۸۶۹ء۔ سنہ ۱۹۲۳ء) بھی مشرقی انداز تنقید کے دبستان شبلی کے زیر اثر رہے۔ ان کی تصنیف "گل رعنا" اردو شعراء کے تذکرے میں ایک اچھا اضافہ ہے، ان کا طرز تحریر بہت متین و سلیس اور رواں و سادہ ہے۔ اشعار کے حسن انتخاب سے ان کی سخن فہمی اور سخن شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چکبستؔ (سنہ ۱۸۸۲ء۔ سنہ ۱۹۲۶ء) شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصّہ قوم و وطن کی محبت کے جذبات سے پر ہے۔ تاریخی واقعات اور حقائق کائنات کے انکشافات نظم کرنے میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے مناظر قدرت کی بڑی دلکش مرقع کشی کی ہے۔ ان کی سیاسی، سماجی اور قومی نظمیں ہندوستان کے ہنگامہ خیز عہد کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ مضامین چکبستؔ سے ان کے ادبی رجحانات اور تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

اقبالؔ (سنہ ۱۸۷۷ء۔ سنہ ۱۹۳۸ء) نے بھی حب وطن کے نغمے گائے تھے، لیکن سنہ ۲۴ء میں یورپ کے نظر قومیت کے خلاف شدید ردّ عمل کا اظہار کیا۔ سرمایہ و مزدور کی کشاکش میں انھوں نے مزدوروں کی حمایت کی۔ فکر اقبالؔ میں اسلامی تہذیب و تاریخ کا احساس ایک غالب اور پائندہ عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی خالص اسلامی فکر کی تصوّراتی رنگ آمیزی سے دنیا کے سامنے ایک مثالی نظام حیات کا خاکہ پیش کیا۔ انسان کامل کی نشو و نما اور اعلیٰ نصب العین کی سوسائٹی کی تشکیل ان کی فکر کی سب سے اہم خصوصیت ہے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:۔

"اقبالؔ کا فلسفہ خودی، خود شناسی کا ہدایت نامہ ہے۔ ان کی

رجائیت مردہ اقوام کیلئے پیغام حیات ہے۔"[1]

اقبال نے شاعری میں ہیئت کے نئے تجربے تو نہیں کئے لیکن نظم نگاری کی تحریک کو بہت قوت پہونچائی۔ شاہین، شہباز، لالہ صحرائی اور صبح کا ستارہ ان کی خاص علامتیں ہیں۔ اقبال کے لہجہ میں بڑا اخلاص، نرمی، اور گھلاوٹ ملتی ہے۔ یہی اس کی شدت تاثیر کا راز ہے۔

حسرت موہانی (سنہ ۱۸۸۱ء - سنہ ۱۹۵۱ء) کے رنگ تغزل میں سادگی، رنگینی، اصلیت، خلوص، عشق اور سوز و گداز کا احترام ملتا ہے بقول ڈاکٹر احمد لاری "حسرت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی غزل کا احیاء کیا اور غزل کو جدید رجحانات سے روشناس کرایا، اس میں سیاسی، سماجی، اور معاشی موضوعات داخل کئے مگر اس طرح کہ غزل کی قبا چاک نہ ہو۔"[2] اصغر (۱۸۸۴ء - ۱۹۳۶ء) نے قدیم اساتذہ کی بہترین صناعی کا پیوند عصر حاضر کے مخصوص حسن کارانہ رجحانات کے ساتھ لگا کر اپنی غزل کو ممتاز بنایا ہے۔ تصوف، تفلسف، داخلیت، عمیق جذبات نگاری، احساس خودی اور شاعرانہ موسیقیت ان کی شاعری کے جلی عنوانات ہیں۔[3] فانی (سنہ ۱۸۷۹ء - سنہ ۱۹۴۱ء) نے اردو غزل کو غم اور قنوطیت کا نیا مزاج دیا اور نئے آداب سکھائے لیکن ان کا غم مصنوعی اور روایتی نہیں بلکہ اس میں حقیقت و صداقت کی جھلک موجود ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ان کو "یاسیات کا امام" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے ہاں فن اور زبان کا بڑا احترام ملتا ہے۔[4] مگر جگر مرادآبادی (سنہ ۱۸۹۰ء - سنہ ۱۹۶۰ء) نے اردو غزل کو سادگی و برجستگی، شوخی و معاملہ بندی، کیف و سرمستی، بیخودی و ترنم، اور دلکشی و حسن کاری کے ساتھ تصوف کی چاشنی بھی عطا کی ہے۔ ان کے ہاں حسن و عشق کے معاملات میں وارفتگی اور والہانہ پن اور خلوص و صداقت کی فراوانی ملتی ہے۔[5] جگر نے قدیم و جدید کے امتزاج سے تغزل میں ایک خوشگوار توازن قائم کیا، ان کے کلام میں بلا کی آمد، سیل رواں کی تیزی و تلاطم اور جذبات میں

---

[1] سید عبداللہ: اردو ادب کی ایک صدی ص ۱۲۱۔ [2] احمد لاری: حسرت موہانی ص ۴۱۴۔

[3] عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری ص ۲۷۲ (حیدرآباد سنہ ۳۲ء)۔

[4] رشید احمد صدیقی: جدید غزل ص ۶۰ (سنہ ۵۵ء)۔

[5] ڈاکٹر محمد اسلام: جگر، حیات اور شاعری ص ۴۳۱ (طبع اول سنہ ۶۶ء)

طوفان کی شدت پائی جاتی ہے۔ مضامین میں تنوع، جدت، تازگی اور اثر آفرینی ہے۔[1]

پریم چند (۱۸۸۰ء۔۱۹۳۶ء) نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ اردو زبان کا دامن بڑے قیمتی موتیوں سے مالامال کیا ہے۔ ان کی نمایاں خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے شہری زندگی کے بجائے دیہاتی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کی بڑی کامیابی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ پریم چند مثالیت پسند نقطہ نظر کے مالک تھے، انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندو معاشرہ کے بعض غلط رسوم و رواج کے خلاف کثرت سے لکھا ہے۔ محنت کش طبقہ کے مسائل، سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و جور کی تصویر، گاندھیائی فلسفہ عدم تشدد کا پرچار بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

> "پریم چند کے ناول اپنے دور کی سیاسی و معاشی اور اقتصادی حالت کی بڑی جاندار اور زندہ تصویریں ہیں، جنھیں زبان کی سادگی اور مشاہدہ کی وسعت نے دیرپا رنگ بخش دیئے ہیں"۔[2]

پہلی عالمی جنگ سے ۳۶ء تک کا زمانہ حقیقت نگاری اور رومانیت کے شباب اور پھر بتدریج ان کے زوال کا زمانہ ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے ہنگامہ عمل نے نوائے ادب کو واضح طور پر متاثر کیا۔ غزل نے نشاۃ ثانیہ حاصل کی، گیت نے ترقی کی، اور نظم کے لئے میدان ہموار ہوا۔ اس دور میں جوش انگیزی اکثر شعراء کا مطمح نظر تھا۔ اس نسل کے جن فنکاروں نے اردو شعر و ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لے کر اسے تغیر پذیر عہد کا ترجمان بنایا۔ ان میں شاعروں میں جوش، حفیظ اختر، احسان دانش، نظم طباطبائی، سیماب، روش اور ساغر نظامی۔ ڈرامانگاروں میں آغا حشر، بیتاب بنارسی، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، اور ڈاکٹر عابد حسین۔ مزاح نگاروں میں ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور عظیم بیگ چغتائی۔ افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، سدرشن، اعظم کریوی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری،

---

[1] ڈاکٹر محمد اسلام: جگر، حیات اور شاعری ص ۴۳۳۔

[2] سید عبداللہ: اردو ادب کی ایک صدی ص ۷۸۔

سلطان حیدر جوش، علی عباس حسینی اور حجاب امتیاز علی کے نام خصوصیت کے ساتھ جبینِ ادب کا نور ہیں۔

۱۹۳۵ء میں بعض نوجوان ادیب وقت کا نیا پیغام لے کر اٹھے، جن کا عقیدہ تھا کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور یورپ کے ادبی و اشتراکی نظریات سے متاثر ان کے بعض اور ہندوستانی دوستوں نے مل کر لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور ایک مینوفیسٹو کے ذریعہ اپنے مقاصد کا اعلان کیا۔ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو اس انجمن کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند کی صدارت میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوئی[۱] اس میں ایک اعلان نامہ منظور ہوا، جس پر اس وقت کے اکابر ادیبوں اور شاعروں نے اپنے دستخط ثبت کئے[۲]۔ اس تحریک کے بنیادی مقاصد زندگی کی بدلی ہوئی قدروں سے شعر و ادب کو ہم آہنگ کرنا، ادب کو عام پسند اور عوام پسند بنانا، آزادی ملک کی جدّوجہد میں مصنفین کا عملی حصّہ لینا، ادب میں سچائی، حقیقت پسندی اور عقلی صداقتوں کی ترجمانی، جبر و استحصال، اور غلامی کے خلاف صف آرائی، اسلوب و ہیئت اور موضوع تینوں اعتبار سے ادب کو وسیع تر امکانات سے ہمکنار کرنا قرار دیئے گئے تھے۔

بلاشبہہ ترقی پسند تحریک نے علی گڑھ تحریک کے بعد ادبی مضامین میں ایک نئی ہلچل پیدا کردی۔ اس تحریک کے اثر سے حساس و ذہین اور نوجوان طبقہ میں اشتراکی خیالات عام ہوئے۔ لینن و مارکس کے اثرات نئی نسل نے قبول کئے۔ اور روسی ادیبوں کے زیر اثر ادب و فن کے جدید نظریوں کی تبلیغ ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک مقصدی حیثیت سے نہایت اہم اور افادیت کی حامل تھی۔ اس نے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑ کر مزدوروں، کسانوں اور غربت و افلاس کے ماروں کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا، ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:۔

"ترقی پسند تحریک سر سید کے بعد اردو ادب کا سب سے پرجوش

---

[۱] سنراج رہبر: ترقی پسند ادب ص ۳۳ (آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ء)۔ [۲] اسی کانفرنس میں پریم چند نے اپنا وہ مشہور خطبہ صدارت پڑھا تھا جسکے ایک جملہ "اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" کی گونج ترقی پسند حلقوں میں مدتوں سنائی دیتی رہی۔

> اور پر زور تخلیقی مظاہرہ تھا۔ اس نے اپنے برگ و بار کے اعتبار سے بڑا گراں بہا سرمایہ پیدا کیا اور شعور کے لحاظ سے زندگی کی بعض ان بصیرتوں کا ادراک کیا اور کرایا جو سماجی حقائق اور عمرانی تقاضوں کے عین مطابق تھیں۔"[1]

لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس تحریک نے ایک منفی شکل اختیار کر لی۔ جس سے بعض سخت نقصانات بھی ہوئے۔ مثلاً اس کی روایت شکنی، شدیدیت، اور حقیقت نگاری کی خوشنما اصطلاحوں کے پردے میں قدیم ادبی و تہذیبی ورثہ کی تضحیک کی گئی۔ روحانی و اخلاقی قدروں کو پامال کیا گیا۔ مشرقی تہذیب و تمدن سے ذہنی رشتہ منقطع کر دیا گیا۔ ذہنی بے راہ روی، عریانی، فحاشی اور بداخلاقی کی تشہیر کی گئی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ادب میں اس کے مظاہرے کافی شدت سے ہوتے رہے۔ اسی باعث یہ اہم تحریک اس حد تک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی جس کی واقعی وہ مستحق تھی۔

اسی زمانے میں حلقہ ارباب ذوق کے نام سے نوجوان ادیبوں کی ایک اور تنظیم وجود میں آئی، جس کا بنیادی مقصد ادب میں آزاد تجربوں کو وسعت دینا تھا، اس کے اثر پذیر حلقہ میں داخلیت پسند، خارجی حقائق سے واسطہ رکھنے والے، رمز نگار اور جنس نگار ہر طرح کے لوگ داخل تھے۔ ترقی پسندوں کی طرح مذہبی اقدار کے یہ بھی قائل نہ تھے۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی قیادت میں ادب نے بہت سی منزلیں طے کیں۔ ان دونوں تحریکوں نے بعض خاص اصناف ادب کو بہت ترقی دی۔ اول الذکر نے نظم اور خصوصاً آزاد نظم سے خاص طور پر دلچسپی لی، اور ثانی الذکر نے تنقید، افسانہ اور ہر قسم کی شاعری کو اپنا مرکز توجہ بنایا۔ اس دور کے ممتاز نظم گویوں میں میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اور اختر الایمان کے نام لائق ذکر ہیں۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں فن افسانہ کو ترقی و مقبولیت کی معراج نصیب ہوئی۔ کرشن چندر، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی

---

[1] سید عبداللہ: مباحث حصہ اول ص ۳۶۱ (مدینہ پریس بجنور ۱۹۶۸ء)۔

وغیرہ اس عہد کے روشن چراغ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں علی گڑھ تحریک نے شعر وادب کو درباروں اور خانقاہوں سے نکال کر عوام پسند اور مقبول عام بنانے کے جس مبارک کام کا آغاز کیا تھا وہ ارتقاء کی منزلیں بتدریج طے کرتا ہوا بیسویں صدی کے اواسط کے شعراء وادباً کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچا اور پھر قدیم اصناف ادب کی ترقی کے ساتھ مواد وہیئت کے نئے نئے تجربے منصۂ شہود پر آئے۔ فن میں سماجی شعور کا پرتو پوری تابناکی کے ساتھ نظر آنے لگا۔ پہلی بار صحافت کے فن کو بھی بارگاہ ادب میں باریابی نصیب ہوئی۔ سرزمین ادب کی اس باد بہاری کے جھونکوں نے اس عہد کے ہر اہل علم کو متاثر کیا۔ جس کے نتیجہ میں طبقہ علماء نے بھی اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت اس کی ایک روشن مثال ہے۔

بابِ دوم (الف)

سوانحِ حیات

علامہ سیّد سلیمان ندوی ۲۲؍ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳؍ صفر ۱۳۰۲ھ بروز جمعہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ[1] ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے[2]۔ اس گاؤں میں سادات کرام کا ایک قدیم خاندان آباد تھا۔ جس کے مورث اعلیٰ مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ سیّد صاحب اسی خاندان کے لعل بے بہا تھے ان کو دادھیال اور نانہال دونوں جانب سے سیادت کا شرف حاصل تھا یعنی پدری سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا اور مادری امام زید تک پہونچتا ہے[3]۔ سیّد صاحب کا سلسلۂ نسب ۳۷ واسطوں سے حضرت حسینؓ سے مل جاتا ہے۔ دادھیالی نسب نامہ حسب ذیل ہے۔

سیّد سلیمان ندوی بن سیّد ابوالحسن بن محمد شیر عرف حکیم محمدی بن میر عظمت علی بن میر وجیہ الدین عرف میر جگن. بن میر رجب علی بن میر محمد شیر بن میر سیّد صدر الدین بن میر سیّد سلیمان. بن میر سیّد عثمان بن سیّد حسن شہید بن سیّد شمس الدین بن میر سیّد خلیل. بن میر سیّد عرب ثانی بن میر سیّد مالک بن میر سیّد منیر بن میر سیّد محمد بن میر سیّد شمس محمد بن سیّد معین محمد بن میر محمد. بن سیّد عرب اول بن سیّد امیر برّاں بن میر سیّد میران بن میر سیّد احمد بن میر سیّد محمد بن میر سیّد محمد یوسف. بن میر

---

[1] دیسنہ پٹنہ سے ۱۶ میل اور بہار شریف سے مشرقی جانب ۸ میل پر واقع ایک قدیم گاؤں ہے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں اپنی مردم خیزی کی وجہ سے پورے صوبہ میں امتیاز و شہرت رکھتا ہے۔ اس کی خاک سے بکثرت علماء و فضلاء، اطباء و ڈاکٹر، انجینیر و گریجویٹ، اور صلحاء و اتقاء پیدا ہوئے۔ یہاں کا کتب خانہ الاصلاح نہ صرف صوبہ بہار بلکہ پورے ملک میں اپنی نادر و نایاب کتابوں اور رسالوں کی قدیم ترین فائلوں کے لئے مشہور رہا ہے یہ قیمتی ذخیرۂ کتب اس وقت دیسنہ کلکشن کے نام سے خدابخش لائبریری پٹنہ کی زینت ہے۔

[2] سیّد صباح الدین؛ سوانح حیات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۱۔

[3] ابوظفر ندوی؛ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۴۷۔

سیّد اسحاق بن میر سیّد یعقوب بن میر سیّد حسن بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام سیّد محمد باقر بن سیّد زین العابدین بن امام سیّد حسین شہید کربلا بن حضرت فاطمہ زہرا بنت حضور اکرم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم۔

سیّد صاحب کا ننہالی سلسلہ حسب ذیل ہے۔

سیّد سلیمان ندوی بن بی بی قطبن بنت سیّد حیدر حسین بن سید کاظم حسین بن سید خادم حسین بن سیّد رحمت اللہ بن سیّد امین اللہ بن سیّد محمد فاضل بن سیّد غلام حیدر بن سیّد عبد الہاشم بن سیّد عبد اللہ بن سیّد علاؤ ل بن سیّد ملوک بن سیّد چاند شہید بن سیّد یحییٰ بن سیّد محمد عرف سیّد ہیبت بن سیّد یحییٰ بن سیّد محمود بن سیّد فرید بن سیّد مسعود جاجینری بن سیّد محمود بن سیّد ابو الفرح واسطی بن سیّد داؤد بن سیّد حسین بن سیّد یحییٰ بن سیّد زید بن سیّد عمر بن سیّد ابا بکر علی بن سیّد حسین بن سید علی بن سیّد محمد بن سیّد ابو یحییٰ علیسیٰ بن امام زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین شہید کربلا بن حضرت فاطمہ زہرا بنت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم۔[1]

یہ خانوادہ علم وفضل، تہذیب وشائستگی اور تدین وتقویٰ میں بڑا ممتاز تھا۔ اس میں کئی پشتوں تک نامور اطباء ہوتے رہے۔ چنانچہ سیّد صاحب کے جدامجد حکیم میر محمدی اور نانا حکیم حیدر حسن اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے۔ میر محمدی ایک صاحب دل صوفی بھی تھے۔ انھوں نے سہروردی مشائخ کے حالات میں ایک رسالہ نور محمدی کے نام سے لکھا تھا جو طبع ہو چکا ہے۔ فن طب میں ان کی دو کتابیں قرابادین محمدی اور مخزن الحکمۃ یادگار ہیں[2]۔ سیّد صاحب کے والد بزرگوار حکیم سیّد ابوالحسن بھی اپنے اجداد کی طرح ایک سنجیدہ عالم دین، ریاست اسلام پور کے ایک شاہی طبیب اور نقشبندی ابو العلائی سلسلہ کے شیخ کامل تھے[3]۔ ان کے بڑے بھائی سید ابو حبیب طبی مہارت کے ساتھ زہد واتقاء

---

[1] سید نجم الہدیٰ: نسب نامہ سادات وملوک دیسنہ ص ۲ (معارف پریس اعظم گڈھ سنہ ۱۹۶۰ء)۔

[2] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۳۔

[3] احمد سعید: بزم اشرف کے چراغ ص ۷۰ (الاشرف مطبوعات لاہور سنہ ۱۹۷۵ء)۔

میں بھی ممتاز تھے۔ سلسلہ مجددیہ کے ایک بزرگ شاہ ابو احمد بھوپالی سے بیعت تھے۔ وہ سید صاحب سے عمر میں اٹھارہ سال بڑے تھے۔ سید صاحب کی ولادت پر ان کے جد امجد نے ایک طویل تاریخی قطعہ کہا تھا۔ جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

یکایک سروشے ز تاریخ و سال ؛ چو جستیم تاریخ او ز خسرو
شدہ مہر تاباں زبرج کمال[1] ؛ بگفتا کہ بے داد شد مصرعے
۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ پیدائش ایسی ساعت ہمایوں میں منصہ شہود پر آئی تھی کہ حرف بحرف صدائے غیبی بن کر صحیح ثابت ہوئی۔ اور سید صاحب حقیقۃً برج کمال کا مہر تاباں بن کر ضوفشاں ہوئے۔

سید صاحب کا نام ان کے جد امجد حکیم محمدی نے انیس الحسن اور کنیت ابو نجیب رکھی تھی لیکن پھر ایک پر لطف واقعہ کی بنا پر سلیمان نام پڑ گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سید صاحب کے عہد طفلی میں سلیمان ناخدا[2] نام کے ایک دیندار رنگونی تاجر کا بحری بیڑہ دریائے گنگا میں کلکتہ اور پٹنہ کے درمیان چلتا تھا۔ تاجروں کا مال اس کے ذریعہ کلکتہ کے بازار میں پہونچتا تھا۔ جب اس کا جہاز سامان تجارت لے کر خلیج بنگال میں داخل ہوتا تو مشرقی ہندوستان میں ایک دھوم مچ جاتی اور ہر شخص کی زبان پر سلیمان ناخدا کا نام رہتا تھا۔ ایک دن سید صاحب کے والد نے تاجران چرم میں سلیمان ناخدا کے تجارتی بیڑے کا چرچا سنا، گھر میں آئے تو سید صاحب جن کی عمر اس وقت دو ڈھائی سال تھی۔ لگن میں پانی ڈال کر کھلونے کی ناؤ سے کھیل رہے تھے اور چند ہم عمر بچے بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ”سلیمان کا بیڑا آیا تو کیا، میرے اس سلیمان کا بیڑا ابھی تو آگیا“ بس پھر اسی دن سے ہر شخص انھیں سلیمان کہنے لگا، اور اس نام کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اصل نام گم ہو کر رہ گیا۔[3]

سید سلیمان ندوی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور

---

[1] غلام محمد: تذکرہ سلیمان ص ۳۱۔ [2] کلکتہ میں زکریا اسٹریٹ پر واقع مشہور زمانہ وسیع و خوبصورت مسجد انھیں نے تعمیر کرائی تھی اسی لئے وہ مسجد ناخدا کے نام سے مشہور ہے۔ [3] عبد القدوس ہاشمی: ”سید سلیمان ندوی“ (مضمون) مشمولہ یادگاری مجلہ مرتبہ صبیح محسن ص ۹ (ولیسنہ ایسوسی ایشن کراچی ۱۹۷۶ء)

پھر مولوی مقصود اکھدوی سے حاصل کی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں "میزان منشعب" اپنے بڑے بھائی سیّد ابو حبیب سے پڑھی۔ اس کے بعد مزید تحصیل علم کے لئے اپنے والد کے پاس اسلام پور چلے گئے۔ وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ آئے یہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں قیام کرکے مولانا محی الدین سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ یہیں کے دوران قیام میں شاہ سلیمان پھلواروی کی بارگاہ علم میں بھی زانوئے تلمذتہ کیا اور ان سے منطق کے بعض اسباق کا درس لیا۔[۱] پھلواری سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے۔ یہاں چند مہینے رہے اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں "تعلیم نسواں" پر ایک ایسا مضمون پڑھ سنایا کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوگئیں۔[۲]

سیّد صاحب ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور یہاں پانچ سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی۔[۳] ندوہ میں انھوں نے مفتی عبداللطیف سنبھلی، سیّد علی زینبی، مولانا شبلی فقیہ جیراجپوری، مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور حکیم عبدالحیّ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا۔ اور ان سے عربی اخبارات پڑھوا کر سنے۔ اس امتحان میں سید صاحب اول آئے۔ انھوں نے نواب صاحب موصوف کی مدح میں ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا۔ اس زمانہ کے اخبارات میں شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ "انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔"[۴]

۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی نعمانی ندوہ کے معتمد تعلیم ہوکر لکھنؤ آئے تو اپنی جوہر شناسی سے اس جوہر قابل کو تاڑ لیا اور سید صاحب کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا،

---

[۱] غلام حسنین: یگانہ عصر صوفی (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۵۸۔ [۲] سید صباح الدین: سوانح حیات، معارف سلیمان نمبر ص ۵۔ [۳] حکیم عبدالحیّ: نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۶۳ (دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۹۷۰ء)۔
[۴] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۳۹۔

مولانا شبلی کے ظل تربیت میں انھیں مضمون نگاری کا ذوق پیدا ہوا[1]۔ اور رسالۃ الندوہ میں ان کا پہلا مضمون علم حدیث پر شائع ہوا۔ ندوہ میں انھوں نے مولانا حفیظ اللہ سے حدیث وہیئت کی تحصیل کی۔ منطق، فلسفہ اور ادب عربی میں مولانا فاروق چریاکوٹی سے مہارت حاصل کی۔ فقہ مفتی عبداللطیف سے پڑھی۔ علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اپنے ایک مضمون "میری محسن کتابیں" میں سید صاحب نے تفصیل سے اپنی ان محبوب کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا انھوں نے بار بار اور گہرا مطالعہ کیا تھا اور جو ان کی فکری نشو و نما پر اثر انداز ہوئیں۔ ان کتابوں میں شاہ عبدالعزیز کی بستان المحدثین اور عجالہ نافعہ، امام مالک کی موطا، حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، ابن حجر کی فتح الباری، ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، ابن خلکان کی وفیات الاعیان، شہرستانی کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔[2]

اسی زمانہ (۱۹۰۶ء) میں سیّد صاحب نے عربی میں بھی مضمون نگاری شروع کر دی تھی اور عبداللہ عمادی کے عربی رسالہ "البیان" (لکھنؤ) اور مصر کے شہرۂ آفاق عربی اخبار "المنار" میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں سید صاحب نے "علوم قدیم و جدید کے موازنہ" پر اردو میں تقریر کی۔ اور پھر سامعین کی فرمائش پر عربی میں برجستہ ایسی تقریر کی کہ لوگ ورطۂ حیرت میں پڑ گئے اس کے بعد اسی جلسہ میں خواجہ غلام الثقلین نے یہ آزمائش کرنے کے لئے کہ ممکن ہے یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہوں ایک بر وقت موضوع "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" دیا۔ سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے نہایت فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کر دی جسے دیکھ کر ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہونے لگے۔ علامہ شبلی نے

---

[1] یوسف سلیم چشتی: خراج عقیدت (مضمون) مشمولہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۸۲۔

[2] سید سلیمان ندوی: میری محسن کتابیں (مضمون) مشمولہ کتاب مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں مرتبہ عمران خاں ص ۸

غایت مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔[1]

سید صاحب نے ۱۹۰۶ء میں ندوہ سے سند فراغت حاصل کر لی تو ان کے بڑے بھائی حکیم ابو حبیب سے علامہ شبلی نے پوچھا کہ اب سلیمان کے بارے میں کیا ارادہ ہے، "انھوں نے جواب دیا" میں طبیب ہوں، میرے والد طبیب تھے۔ طبابت میرا خاندانی پیشہ ہے سلیمان بھی طبیب بن کر ہمارا جانشین ہوگا۔ علامہ موصوف نے یہ سن کر حکیم صاحب سے کہا کہ "اگر استاد کا بھی کچھ حق ہے تو یہ حق میں آپ سے مانگوں گا اور میں سلیمان کو طبیب کے بجائے ادیب بناؤں گا۔" بالآخر بڑی بحث کے بعد آخری فیصلہ خود سید صاحب کے رجحان اور صوابدید پر چھوڑ دیا گیا اور انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ "میں طبیب کے بجائے ادیب بننا ہی پسند کروں گا۔" آخر کار بڑے بھائی نے بھی اپنی رضامندی دے دی۔[2]

اسی سال علامہ شبلی نے رسالہ "الندوہ" کی سب ایڈیٹری ان کے سپرد کر دی، اور سید صاحب نے اس رسالہ میں متعدد علمی و تحقیقی موضوعات پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے اور تحریری سلیقہ کا ثبوت دیا۔ ۱۹۰۸ء میں الندوہ میں شائع شدہ سید صاحب کے مضامین "ایمان بالغیب" اور مکررات القرآن کی داد خود علامہ شبلی نے ایک خط میں سید صاحب کو دی۔[3]

اسی سال وہ دارالعلوم ندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے اور درس و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈریں مرتب کیں۔ جو آج تک عربی مدارس میں رائج و مقبول ہیں۔

۱۹۱۰ء میں جب علامہ شبلی نے سیرت النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اس کے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ اور اس کام میں انھوں نے استاذ کی پوری مدد کی۔ وہ مئی ۱۹۱۲ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ الندوہ کی نائب ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو اس سے ہندوستان کے

---

[1] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۲۹۔ [2] حفیظ الحق دسنوی: "علامہ سید سلیمان ندوی" (مضمون) مشمولہ یادگاری مجلہ دیسنہ ایسوسی ایشن کراچی ص ۳۰۔

[3] سید صباح الدین: سوانح حیات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۵۔

مسلمانوں میں ایک شور برپا ہوگیا اور ان کی سیاست میں ابال آگیا۔ سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے اور خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست کے میدان میں آئے۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا جس نے ملکی اور اسلامی سیاست میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ اپنے سیاسی مسلک سے ہم آہنگ پاکر سید صاحب مئی ۱۹۱۳ء میں الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے، اس کے چند ہی ماہ بعد اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے بعض حصوں کے جبری انہدام کا حادثہ فاجعہ پیش آیا۔ جس میں نہتے مسلمانوں اور معصوم بچوں پر بیدردی سے گولیاں چلائی گئیں۔ اس خونی سانحہ سے متاثر ہوکر سید صاحب نے ۱۲؍ اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خون دل سے ”مشہد اکبر“ کے عنوان سے ایک دردانگیز مضمون لکھا۔ حکومت نے اس کی تاب نہ لاکر اس شمارہ کو ضبط کرلیا۔ سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر علامہ شبلی کے دفتر سیرت میں لکھنؤ آئے۔ لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے اواخر میں علامہ شبلی کے ایما پر دکن کالج پونا میں عربی و فارسی کی معلمی قبول کرلی۔[1]

پونا میں قیام کو ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی راہی ملک عدم ہوگئے۔ مرض الموت میں شفیق استاذ نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا۔ تار تو ان کو نہ ملا مگر دل کی آواز پر از خود جب وہ پہونچے تو علامہ شبلی موت و زیست سے آخری نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ استاذ نے معاہدہ کے طور پر سیّد صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا، ”سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو“۔ سیّد صاحب نے ایک سعادت مند شاگرد کی طرح جذبات سے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”ضرور ضرور“۔[2]

علامہ شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا خاکہ تیار کرلیا تھا۔ مگر اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔ سیّد صاحب ان کی رحلت کے بعد پونا کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ آئے اور مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی[3] اور اپنی مشہور تصنیف ”ارض القرآن“ کی پہلی جلد

---

[1] سیّد سلیمان ندوی؛ حیات شبلی ص ۲۲۷ (طبع اول ۱۹۴۳ء) [2] غلام محمد؛ تذکرۂ سلیمان ص ۵۲۔

[3] شاہ معین الدین؛ حیات سلیمان ص ۸۵۔

کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کا آغاز کیا۔ اہلِ علم نے اس کتاب کے آئینہ میں دارالمصنفین کے درخشاں مستقبل کا نقشہ دیکھا۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک سیّد صاحب نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا۔ وہ سیاسی مسلک میں بھی اپنے استاذ علامہ شبلی ہی کے متبع تھے یعنی ملکی سیاست میں آزادی کے حامی اور اسلامی سیاست میں اتحادِ اسلامی پر ایمان رکھتے تھے۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں انھوں نے دارالمصنفین کے علمی آرگن کے طور پر رسالہ "معارف" جاری کیا۔[1] جس کی ضیا پاشی سے دنیائے علم آج تک منور ہے۔ قیامِ دارالمصنفین کے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے اس کی علمی شاخ قائم کرنے اور اسے ترقی و شہرت کے بامِ عروج پر پہنچانے کے لئے انتھک جدوجہد اور جانفشانی کی۔ اور ان ہی کی جانکاہ کوششوں اور حسنِ نیت کا ثمرہ تھا کہ ملک میں دارالمصنفین کا علمی وقار بہت جلد قائم ہوگیا۔

۱۹۱۹ء میں مجلسِ خلافت کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو سیّد صاحب نے اس میں علماء اور اربابِ سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام کیا اور ایسی پردرد تقریر کی کہ مسندِ صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزمِ ماتم بن گئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اسی سال انھوں نے مولانا حسرت موہانی کی نظر بندی سے رہائی کی تقریب میں "نظر بندانِ اسلام" کے عنوان سے معارف میں ایک طویل سلسلۂ مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔ فروری ۲۰ء میں مولانا محمد علی کی قیادت میں مجلسِ خلافت کا جو وفد جزیرۃ العرب کے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ اور ترکی کے معاملات میں انصاف طلبی کے لئے انگلستان بھیجا گیا تھا، اس میں خلافت کی مذہبی رہنمائی کے لئے سیّد صاحب کا انتخاب ہوا[2]۔ اس وفد میں سیّد صاحب کی حیثیت محض ایک معزز رکن ہی کی نہیں تھی بلکہ ایک محقق، مفکر اور فاضل کی تھی۔ انھوں نے اس سفر میں نہ صرف برطانوی وزیرِ اعظم لائڈ جارج اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے سیاسی مذاکرات کئے بلکہ انڈیا آفس،

---

[1] سیّد صباح الدین، سوانح حیات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۱۱۔

[2] رئیس احمد جعفری: علی برادران ص ۴۳۳ (نفیس اکیڈمی کراچی)۔

برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے قیمتی کتب خانوں سے اپنے علمی ذوق کو بھی شاد کام کیا۔

سید صاحب نے اپنے مجموعہ خطوط "برید فرنگ" میں اس وفد کی کارگزاری اور سفر کے مشاہدات و تاثرات کا بہت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

؁۲۰ء کے آخر میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ سیّد صاحب نے سفر یورپ سے واپسی کے بعد اس میں سرگرم حصّہ لیا اور ملک کا دورہ کرکے جابجا اس کی تبلیغ میں تقریریں کیں اور اخبارات میں مضامین لکھے۔ تحریک عدم تعاون میں تعلیم گاہوں کو ملنے والی سرکاری امداد بھی شامل تھی۔ اس وقت ندوہ کو بھی پانچ سو ماہوار کی سرکاری امداد ملتی تھی۔ چنانچہ اس کی واپسی کا بھی سوال اٹھا۔ ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے بہت سے ارکان سرے سے عدم تعاون کی تحریک ہی کے مخالف تھے۔ اس لئے ندوہ کو ملنے والی سرکاری امداد کی واپسی کے مسئلہ میں سخت اختلاف رائے ہوا۔ مگر سید صاحب کی کوشش سے کافی بحث و مباحثہ کے بعد مجلس انتظامیہ نے سرکاری امداد کی واپسی کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے آج اس رقم کی اہمیت محسوس نہ ہو مگر اس زمانہ میں یہ رقم ندوہ کے لئے اس قدر اہمیت رکھتی تھی کہ بقول سیّد صاحب" اس کے ہٹ جانے کے بعد ندوہ کی زندگی گویا معرض خطر میں آگئی۔[1]

اواخر دسمبر ؁۲۰ء میں سیّد صاحب کانگریس کے ناگپور سیشن میں شریک ہوئے۔ یہ وہی تاریخی اجلاس ہے جس میں ترک موالات کے رزولیوشن کی توثیق کی گئی۔ اس کے بعد پورا ہندوستان تحریک عدم تعاون سے گونج اٹھا۔ یوپی میں اعظم گڑھ اور خاص طور پر دارالمصنفین اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا اور سید صاحب کی ذاتی دلچسپی اور کوشش سے پورے ضلع میں خلافت کمیٹی کی شاخیں اور پنچایتیں قائم ہوگئیں۔ عدالتوں سے مقدمات تقریباً ختم ہوگئے۔ شراب کی دکانیں بند ہوگئیں۔ ایک نیشنل اسکول بھی قائم ہوگیا۔[2]

؁۱۹۲۱ء میں کانگریس کا ایک اجلاس احمدآباد گجرات میں ہوا۔ سید صاحب اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اسی موقع پر وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔[3]

---

[1] سید سلیمان ندوی: شذرات معارف نومبر ؁۱۹۲۰ء ص ۳۲۳۔ [2] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۲۲۱۔

[3] یوسف سلیم: خراج عقیدت (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۸۴۔

ایک خط میں خود ہی لکھتے ہیں:۔

> "کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دس ممبروں میں سے ایک میرا انتخاب ہوا۔ بڑے بڑے مدعیان سیاست اور ارباب عمائم اس عزت کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے بالآخر بلا توقع یہ عزت میرے حصہ میں آئی مگر بجا اعتراف ہے کہ اس سے مجھ کو ایک ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ صرف محمد علی کی وصیت اور حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا امتثال امر ہے"۔ [1]

سید صاحب کی کوششوں سے سنہ ۱۹۲۲ء تک دار المصنفین کا آفتاب شہرت عین نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔ علامہ شبلی کی سیرت النبی اور سید صاحب کی بعض تصانیف کے علاوہ عبد السلام ندوی، عبد الباری ندوی، محمد یونس فرنگی محلی اور عبد الماجد دریا بادی کی متعدد علمی تالیفات نے ارباب علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ رسالہ "معارف" کی مقبولیت ملکی وسعتوں سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی ۔ اور مستشرقین یورپ تک اس کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی تحسین وتوصیف میں رطب اللسان ہوگئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں جب سلطان عبد العزیز آل سعود نے شریف حسین کو شکست دے کر حجاز پر قبضہ کر لیا تو وہاں جمہوری اور شرعی حکومت کے قیام کی کوشش اور ابن سعود و شریف حسین کا تنازعہ طے کرانے کے لئے مجلس خلافت نے سید صاحب کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا۔ اس وفد کے دوسرے ارکان میں مولانا عبد الماجد بدایونی اور مولانا عبد القادر قصوری تھے۔ سید صاحب نے دو ماہ جدہ میں قیام کرکے اپنے مفوضہ فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے، لیکن شریف حسین کے لڑکے شریف علی کی ہٹ دھرمی کے باعث اس وفد کی جدوجہد بار آور نہ ہوسکی اور وہ اپنے مشن میں ناکام ہندوستان واپس آگیا۔ [2]

---

[1] بحوالہ حیات سلیمان مؤلفہ شاہ معین الدین ندوی ص ۲۲۲۔

[2] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۶۰۔

یوں تو سید صاحب ایک زمانہ سے ندوہ کے معتمد تعلیم تھے۔ مگر ؁۲۵ء میں اس کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اس سال فروری میں اس کا سالانہ اجلاس بڑے اہتمام اور تزک واحتشام کے ساتھ کرایا، جس میں ہندوستان کے علماء اور اکابر قوم نے غیر معمولی تعداد میں شرکت کی۔ ؁۲۶ء میں سید صاحب اپنی قیادت میں مجلس خلافت کا ایک دوسرا وفد[۱] لے کر حجاز گئے۔ شاہ سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی نمائندہ ایک مؤتمر[۲] مکہ معظمہ میں طلب کی تھی۔ اس میں بکثرت ملکوں کے وفود شریک ہوئے۔ تمام ملکوں کے نمائندوں نے سید صاحب کو مؤتمر کا نائب الرئیس منتخب کیا[۳]۔ اس کانفرنس میں سید صاحب نے جو عالمانہ تقریریں کیں ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی عظمت کا گہرا نقش شرکاء مؤتمر کے دلوں پر قائم ہوا۔

اس وفد سے واپسی کے بعد سید صاحب زیادہ تر علمی، مذہبی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہے۔ اور پروفیسر مارگولیتھ اور ڈاکٹر گولیم وغیرہ بعض مستشرقین یورپ سے کئی قلمی جہاد کئے۔ اکتوبر ؁۲۷ء میں جنوبی ہند کا علمی و تعلیمی سفر کیا۔ ؁۱۹۲۸ء میں ہندوستانی مسلمانوں میں ساردا ایکٹ کا ہنگامہ گرم ہوا۔ جس کی رو سے نابالغی کی شادی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سید صاحب نے اپنی زبان وقلم سے اس ایکٹ کی شدید ترین مخالفت کی۔ سید صاحب کے نزدیک کم سنی کی شادی قابل اصلاح ضرور تھی۔ لیکن اس بل کے بارے میں ان کا ذاتی موقف یہ تھا کہ بعض حالات اور مصالح کی بنا پر نابالغوں کی شادی کر دینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اسی باعث شریعت نے بھی ایسی شادی کو ناپسندیدہ قرار دینے کے باوجود اس کی ممانعت و مخالفت نہیں کی ہے۔ قانون بن جانے کے عمومی حیثیت سے اس میں خرابی تھی کہ مجبوری اور ضرورت کے وقت بھی نابالغوں کی شادی ممنوع رہتی۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس کے علاوہ دوسری خرابی یہ تھی کہ شریعت نے جس چیز کی اجازت دی ہے وہ حرام قرار پاتی اور پھر

---

[۱] اس وفد کے دوسرے ارکان میں علی برادران اور شعیب قریشی تھے۔

[۲] جس کا مقصد خطرات سے حرمین کی حفاظت، اہل حرمین کی خدمت اور حجاج کے راحت و آسائش کے وسائل پر غور و فکر اور اسی قسم کے دوسرے اختلافی امور تھے۔

[۳] حکیم عبدالحئی: نزہۃ الخواطر ج ٨ ص ١٦٥۔

مسلمانوں کے دوسرے عائلی قوانین میں بھی حکومت کی مداخلت کا دروازہ کھل جاتا۔[1] ان ہی وجوہ سے سید صاحب آخر آخر تک اس بل کی مخالفت اور جرأت حق گوئی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

مارچ ۳۳ء میں انجمن اردوئے معلیٰ کی دعوت پر سید صاحب نے مسلم یونیورسٹی کا سفر کیا اور وہاں مختلف علمی موضوعات پر کئی معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور خطبے پڑھے۔ سب سے بڑا جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا۔[2] جس میں سیّد صاحب نے "ہندوستان میں ہندوستانی" کے موضوع پر ایک خطبہ دیا، اس میں تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی ہے۔ انگریزوں کے تسلط سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی۔ اپریل ۳۳ء میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی تھی۔ اس میں سید صاحب نے "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا" کے عنوان سے ایک بے حد معلومات آفریں مقالہ پیش کیا جس میں بڑی تلاش و تحقیق اور مستند شہادتوں سے مدلل کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ تاج محل کا معمار درحقیقت نادر العصر استاذ احمد معمار ہے۔ جو ہندسہ، ہئیت اور ریاضیات کا بڑا عالم تھا۔[3]

جولائی ۳۳ء میں سید صاحب سیرت پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے اور وہاں سے بھڑوچ، راندیر، سورت اور ڈابھیل گئے۔ اسی سال اکتوبر میں نادر خاں شاہ افغانستان کی علمی و تعلیمی دعوت پر ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کی معیت میں کابل کا سفر کیا، وہاں شاہ موصوف اور دوسرے ماہرین تعلیم کو افغانستان کی مذہبی و عربی تعلیم کے نصاب کے سلسلہ میں گرانقدر مشورے دیئے اس سفر میں ان کا قلم بھی برابر رواں رہا اور نتیجہ کے طور پر سفر افغانستان کے نام سے ایک کتاب مرتب ہو گئی جو پہلے معارف میں قسط وار اور پھر علیحدہ

---

[1] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۲۶۱۔

[2] سیّد صباح الدین: سوانح حیات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۸۵۔

[3] سیّد سلیمان ندوی: مقالات سلیمان ج ۱ ص ۲۹۳ (معارف پریس ۱۹۶۶ء)۔

کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

فروری ؁۳۴ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر سید صاحب نے جامعہ ملیہ دہلی میں مصر کے ڈاکٹر بہجت وہبی کے توسیعی خطبات کے جلسوں کی صدارت کی اور اسی سال جون میں صوبہ بہار کے وزیر تعلیم سید عبد العزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی تشریف لے گئے۔ حکومت بہار نے انھیں کئی بار پبلک سروس کمیشن کا ایکسپرٹ ممبر نامزد کیا۔[1]

؁۳۵ء میں اردو ہندی کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زبان کے ان روزافزوں جھگڑوں سے سید صاحب کو قلبی دکھ ہوا اور انھوں نے معارف کے شذرات ذریعہ اس سلسلہ میں مسلسل اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ اردو اور ہندی دونوں کے لئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کیوں کہ زمانے کا یہ فیصلہ ہے کہ نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے۔ اور نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہیں گی۔[2]

نومبر ؁۳۶ء میں سید صاحب نے دہلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔ اس میں انھوں نے جو خطبہ پڑھا وہ دنیائے اسلام میں اس قدر مقبول ہوا کہ مصر و شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے۔ اس وقت تک سید صاحب کی شہرت انتہائی بلندیوں تک پہونچ گئی تھی۔ اور انھیں مسلسل علمی اسفار سے فرصت نہ مل پاتی تھی۔ ؁۴۰ء میں جنوبی ہند اور پھر سرحد و پنجاب کے شہروں کا طویل سفر کیا اور مختلف علمی و تعلیمی اداروں میں تقریریں کیں اور اہل علم سے تبادلہ خیال کیا۔ ؁۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کر کے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا۔[3]

یہی سال ان کی زندگی کے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں ان میں ایک عظیم روحانی و باطنی انقلاب پیدا ہوا۔ عین اس وقت جب کہ وہ نہ صرف ہندوستان

---

[1] سید صباح الدین: سوانح حیات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۸۔

[2] سید سلیمان ندوی: شذرات معارف جون ؁۳۵ء ص ۴۰۴۔

[3] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۴۹۶۔

بلکہ پورے عالم اسلامی کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب، ایک وسیع النظر مؤرخ، ایک اچھے سیاسی مفکر اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ اور ان کی نجی زندگی بھی بڑی پاک و صاف تھی، لیکن باایں ہمہ جلالت علم و فضل انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانہ تصوف و معرفت پر اپنی جبین نیاز خم کر دی۔ مولانا تھانوی کو بھی علم و فن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی۔ اس تعلق کے بعد سید صاحب کے شب و روز ہی بدل گئے۔ اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گزری تھی۔ لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تقویٰ اور تورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا۔ عبادت و ریاضت بڑھ گئی[۱]۔ ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے۔ اس عظیم باطنی انقلاب کے بعد سید صاحب نے اپنی تمام پرانی تحریروں پر نظر ثانی کی اور جس میں ذرہ بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ”رجوع و اعتراف“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اور معراج جسمانی، فنائے نار، تصویر کشی اور زکوٰۃ جلی، (زیوروں کی زکوٰۃ) کے بارے میں اپنی سابقہ تحقیقات سے رجوع کر لیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں سید صاحب نے راہ سلوک و طریقت میں قدم رکھا اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء تک اس کے سب مراحل طے کر کے مرشد کی طرف سے سلاسل اربعہ میں خرقہ خلافت عطا ہوا۔ جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے تھے۔[۲]

۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو میں خط لکھ کر سید صاحب کو قومی زبان کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کے لئے واردھا بلایا۔ چنانچہ سید صاحب جو اس وقت ندوہ کی مالی امداد کے سلسلہ میں حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں واردھا اتر گئے۔ اور وہاں جو جلسہ ہوا اس میں گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان

---

[۱] احمد سعید: بزم اشرف کے چراغ ص ۸۰ (الاشرف مطبوعات لاہور ۱۹۷۵ء)۔

[۲] ” ” ” ” ص ۷۷ ” ” ” ” ۔

کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کی چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیئے۔ اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی ہندی اور سنسکرت و انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے، اس کو برقرار رکھنا چاہیئے اس قسم کے خیالات وہ ۱۹۳۷ء سے برابر پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۷ء کے راجندر، عبدالحق پیکٹ میں یہ طے پایا تھا کہ ہندوستان میں جو سرکاری زبان ہو وہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جانی چاہیئے۔ اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے۔ لیکن بہار اور وار دھا دونوں مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کر سکے اور یہ پیکٹ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے میں بہ گیا۔[1]

۱۹۴۵ء ہی سے سید صاحب کی صحت کا اضمحلال شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اپنے علمی مشن کی تکمیل کی دھن میں ان کی مصروفیات برابر بڑھتی جا رہی تھیں، مزید برآں عقیدتمندوں کے اصرار پر خرابی صحت کا خیال کئے بغیر دور دراز مقامات کے سفر بھی کرتے رہے۔ صحت کی خرابی کے بعد سید صاحب کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلماء میں جس کے وہ تقریباً چالیس سال سے معتمد تعلیمات تھے، مستقل قیام کر کے اس کی تعلیمی و مالی حالت درست کریں۔ لیکن بوجوہ اس کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔[2] اسی اثناء میں نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے ان کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دار القضاء اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور اسلامی رنگ میں کر دیں۔ سید صاحب نے عربی مدارس کی اصلاح و ترقی کے کام کو اپنے خالص ذوق کے مطابق پا کر اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ اور جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے منصب پر مامور ہوئے۔[3] لیکن دار المصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور قائم رہے۔ جس مقصد کے لئے انھوں نے بھوپال کا قیام منظور کیا تھا اس کی تکمیل میں اکتوبر ۱۹۴۹ء تک تگ و دو کرتے رہے۔[4] مگر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انقلابات نے ریاست کے

---

[1] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۴۴۷۔

[2] سید صباح الدین: سوانح حیات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۳۸۔

[3] ارشد تھانوی: سید صاحب منصب قضا پر (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۶۲۔

[4] حکیم عبدالحئی: نزہتہ الخواطر۔ ج ۸ ص ۱۶۵۔

لیل و نہار ہی بدل دیئے۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں سید صاحب اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے[1]۔ جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر الحاج بنائے گئے اور حجاز پہونچ کر شاہ سعود کے مہمان خصوصی ہوئے[2]۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں اس سفر سے واپس بمبئی پہونچے اور جنوری کے وسط میں بھوپال آئے۔ وہاں سے اپریل کے اواخر میں اپنا سرکاری تعلق منقطع کرکے اہل و عیال کے ہمراہ اعظم گڈھ پہونچے۔ اب خیال تھا کہ پھر مستقل دارالمصنفین میں قیام فرمائیں گے۔ لیکن یہاں بعض شرکارِ کار کے تکلیف دہ رویہ سے انھیں قلبی اذیت پہونچی۔ اور وہ دارالمصنفین سے بددل ہو گئے۔ اپنے خون جگر سے سینچے ہوئے اس باغ شبلی سے پل بھر کی جدائی بھی انھیں گوارا نہ تھی۔ مگر حالات نے مجبور کر دیا اور بالآخر ۱۴ر جون ۱۹۵۰ء کو وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔ شروع میں تو عارضی قیام کے ارادہ سے اور اعزہ و اقارب سے ملنے کی نیت سے گئے تھے[3]۔ مگر وہاں ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ مستقل سکونت کا ارادہ کر لیا۔ اس فیصلہ سے سید صاحب کو جو روحانی تکلیف ہوئی اس پر مکتوبات سلیمانی کا ایک ایک خط شاہد عدل ہے۔

پاکستان میں بھی سید صاحب کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی مشاغل جاری رہے۔ ذریعۂ معاش کے لئے مکتبۃ الشرق کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ حکومتِ پاکستان نے دستور سازی کے سلسلہ میں ادارہ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا تھا۔ سید صاحب کی خدمت میں اس کے عہدۂ صدارت کی پیش کش ڈیڑھ ہزار روپئے کا ماہانہ پر برابر کی جاتی رہی۔ مگر ایک عرصہ تک وہ اسے قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔ لیکن بعد میں کچھ شرائط کے ساتھ قبول کر لیا۔[4]

۱۹۵۳ء کے آخر میں سید صاحب پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے

---

[1] یوسف سلیم چشتی: خراج عقیدت (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۸۶۔

[2] غلام محمد تذکرۂ سلیمان۔ ص ۲۰۴۔

[3] غلام محمد: پاکستان کے تین سال (مضمون) مشمولہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۱۲۵۔

[4] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۵۸۱۔

ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اپنے خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازعہ کے سلسلہ میں اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا۔ پھر ڈھاکہ سے کراچی جاتے ہوئے ہندوستان میں بھی اپنے بعض اعزہ کے ہاں کچھ دن قیام کیا۔ کراچی پہونچ کر شدید علیل ہو گئے اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ء کی شب میں ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا اور ۷۱ سال تک ضیا پاشی کے بعد علم وفضل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ دوسرے دن نیوٹاؤن کراچی کی جامع مسجد میں مولانا تھانوی کے خلیفہ ڈاکٹر عبدالحیٔ نے نماز جنازہ پڑھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔[1]

سیّد صاحب نے تین شادیاں کی تھیں، پہلا عقد عنفوان شباب میں ۱۹۰۴ء میں ان کی چچازاد بہن سے ہوا تھا۔ تیرہ برس کی رفاقت کے بعد ان اہلیہ نے ۱۹۱۷ء میں داغِ مفارقت دیا۔ سید صاحب پر اس سانحہ کا غیر معمولی اثر ہوا اور فراق یار کے عنوان سے چند اشعار بھی موزوں کئے اور معارف کے شذرات میں مرگ یار کے عنوان سے ایک مؤثر منثور مرثیہ بھی لکھا۔ پہلی اہلیہ سے متعدد اولادیں ہوئیں مگر صرف ایک لڑکی سیدہ اور ایک صاحبزادہ ابوسہیل زندہ رہے سیدہ اور انکے شوہر کی جوانمرگی کا داغ بھی سیّد صاحب کو اپنی زندگی ہی میں سہنا پڑا۔ ابوسہیلؔ اس وقت کراچی میں ہیں۔[2]

سیّد صاحب نے اس کے بعد اپنے والد کے پیہم اصرار پر ۱۹۲۰ء میں عقد ثانی کیا۔ یہ اہلیہ مشکل سے ڈیڑھ سال حق رفاقت ادا کر کے جنت نعیم کو سدھار گئیں ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔[3] اس کے بعد، ۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو مظفر پور بہار کے ایک سادات خانوادہ میں تیسرا نکاح کیا۔ ان اہلیہ سے چار صاحبزادیاں شمیمہ، شکیلہ، شمسیہ اور تارا اور ایک فرزند ارجمند ڈاکٹر سیّد سلمان یادگار رہیں۔ چاروں لڑکیوں کی شادیاں سیّد صاحب کی زندگی ہی میں معزز خاندانوں میں ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر سیّد سلمان ندوی کو مبدأ فیاض نے الولد سر لأبیه کا مصداق کامل

---

[1] سید ابو عاصم: علالت سے وفات تک (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۳۰۲۔

[2] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۶۰۳۔ [3] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۲۹۴۔

بنایا ہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ ندوۃ العلماء میں تحصیل علم کے بعد وقت کے مشاہیر اساتذۂ فن مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی، مولانا یُوسف بنوری، شیخ خلیل عرب اور اپنے والد مرحوم سے اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد ؁۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامی تاریخ میں ایم اے اور پھر ؁۱۹۷۲ء میں شیکاگو یونیورسٹی امریکہ سے "عبد اللہ بن زبیر اور خلافت" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح تعلیم و ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے آج کل وہ ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ) کے شعبۂ دراسات اسلامیہ میں پروفیسر ہیں۔ راقم سطور کو موصوف سے پہلی بار دید و شنید کی سعادت اپنے ندوہ کے زمانہ طالب علمی میں حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت وہ غالباً سندھ یونیورسٹی (پاکستان) میں تاریخ اسلام کے استاذ تھے۔ پھر اس کے کافی عرصہ بعد ؁۱۹۸۲ء میں دوسری ملاقات دار المصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے موقعہ پر ہوئی جس میں شرکت کے لئے موصوف خاص طور پر جنوبی افریقہ سے تشریف لائے تھے۔ اُس وقت ان کے غیر معمولی کمالات وصلاحیتوں اور عربی، انگریزی و اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت کے گوناگوں جلوے مشاہدہ میں آئے۔

(۲)

ذیل میں سید سلیمان ندوی کی تصنیفات کی ایک مکمل فہرست مختصر کیفیت کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ ان میں سے ادبی تالیفات کا تفصیلی جائزہ آئندہ اوراق میں پیش کیا گیا ہے:-

(۱) **لغات جدیدہ**: ؁۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے۔ چنانچہ یہ کام سید صاحب کے سپرد کیا گیا۔ جسے انھوں نے دو برس میں پورا کر کے ؁۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ رشید رضا مصری تھے پیش کیا۔ یہی ڈکشنری "لغات جدیدہ" کے نام سے ؁۱۲ء ہی میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔

(۲) ارض القرآن : دکن کالج پونا کے زمانہ قیام میں سید صاحب نے اس اہم تصنیف کا آغاز کیا تھا۔ اس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی و تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ بقول شاہ معین الدین "یہ درحقیقت سیرت النبی جلد اول کا مقدمہ ہے۔ مگر چونکہ یہ زیادہ طویل ہو گیا۔ اس لئے اس کا صرف خلاصہ سیرت میں لیا گیا ہے"[1]۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد سنہ ۱۹۱۷ء اور دوسری جلد سنہ ۱۹۱۸ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد میں اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی اور تمدنی حالات پر بحث ہے۔ سنہ ۳۶ء میں مولوی مظفر الدین ندوی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

(۳) سیرت النبی جلد سوم تا ششم : سیرت النبی حصہ دوم اگرچہ علامہ شبلی کی لکھی ہوئی تھی مگر اس کے مسوّدہ میں جا بجا بیاضیں چھوٹی ہوئی تھیں۔ سید صاحب نے اس کو مکمل کیا اور سنہ ۲۰ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اسی زمانہ میں سیرت کی تیسری جلد لکھی۔ جس میں معجزہ کی حقیقت، اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیم، علم کلام، فلسفہ جدیدہ اور قرآن کے نقطہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے۔ یہ جلد سنہ ۲۴ء میں منصہ شہود پر آئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۲ء میں چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس کا موضوع منصب نبوت ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوت محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا[2]۔ اس جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کی شہرت میں بڑا اضافہ ہوا۔ سیرت کی پانچویں جلد سنہ ۳۵ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ عبادات پر مشتمل ہے، اور چھٹی جلد سنہ ۳۹ء میں شائقین کے ہاتھوں میں پہونچی۔ اس میں اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بلاشبہہ یہ سلسلۂ سیرت کی سب سے اہم جلد ہے۔ سیرت النبی کی تمام جلدیں ہند و بیرون ہند میں بے حد مقبول ہوئیں اور ان کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ ترکی، پشتو، عربی اور انگریزی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ بقول سید ابوالخیر کشفی :-

> "سیرت النبی اردو نثر کے تاج میں کوہ نور کی طرح چمک رہی ہے
> یہ چمک نگاہوں کے لئے نہیں۔ دل کی وادیوں کے لئے ہے۔"[3]

---

[1] شاہ معین الدین : حیات سلیمان ص ۶۷۔ [2] سید صباح الدین : سوانح حیات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۵۔

[3] ابوالخیر کشفی : سید صاحب، ایک تاثراتی تحریر (مضمون) مشمولہ یادگاری مجلہ ص ۲۵۔

(۴) **سیرت عائشہؓ:** یہ کتاب بھی ۲۴ء میں شائع ہوئی۔ سید صاحب نے اس کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی میں کیا تھا۔ مگر اس کی تکمیل بعد میں کی۔ ڈاکٹر اقبال کے مطالعہ سے جب یہ کتاب گزری تو انھوں نے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر فرمایا:۔

> "سیرت عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے۔"[1]

(۵) **خطبات مدراس:** سیّد صاحب نے اکتوبر ۲۵ء میں مدراس مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی دعوت پر مدراس کا سفر کیا اور وہاں سیرت نبوی پر آٹھ خطبات دیئے جو خطبات مدراس کے نام سے چھپ کر ۱۹۲۶ء میں منصۂ ظہور پر آئے۔ یہ خطبات سیرتِ نبوی کا جوہر اور عطر ہیں[2]۔ ان معرکۃ الآرا خطبات کا انگریزی ترجمہ Living Prophet کے نام سے سعید الحق دیسنوی اور عربی ترجمہ الرسالۃ المحمدیۃ کے نام سے مولانا محمد ناظم ندوی نے کیا ہے۔

(۶) **عرب و ہند کے تعلقات:** مارچ ۲۹ء میں سید صاحب نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر "عرب و ہند کے تعلقات" کے موضوع پر خطبات پڑھے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ان کا وہ عہد زرّیں یاد دلایا ہے۔ جب دونوں گوناگوں اور مختلف النوع تعلقات کے رشتوں میں منسلک تھے۔ بلاشبہہ یہ خطبات تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطبات کو ہندوستانی اکیڈمی نے ۳۰ء میں عرب و ہند کے تعلقات کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ سید صاحب کے ایک ہم وطن سعید الحق دیسنوی نے کیا تھا جو پہلے اسلامک کلچر حیدر آباد میں بالاقساط شائع ہوا اور بعد میں پاکستان میں کتابی شکل میں طبع ہوا۔

(۷) **عربوں کی جہاز رانی:** مارچ ۱۹۳۱ء میں سیّد صاحب نے حکومت بمبئی کے

---

[1] بحوالہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۱۳۔

[2] شاہ معین الدین، حیات سلیمان ص ۲۸۹۔

شعبۂ تعلیم کی فرمائش پر انجمن اسلام ہال بمبئی میں عربوں کی جہازرانی پر چار لکچر دیئے، ان میں زمانہ جاہلیت اور اسلام میں عربوں کی جہازرانی، عربوں کی دنیا کے سمندروں سے واقفیت، ان کے بعض بحری انکشافات، عربوں کے سامان و آلات جہازرانی اور ان کی بحر محیط کو عبور کرنے کی کوششوں وغیرہ سے مبسوط بحث کی گئی ہے[1]۔ یہ خطبات ۱۹۳۵ء میں معارف پریس اعظم گڈھ میں طبع ہو کر دارالمصنفین سے شائع ہوئے۔ ان کا انگریزی ترجمہ کتابی شکل میں چھپ چکا ہے۔

(۸) **خیام**: دسمبر ۳۲ء میں سید صاحب نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ سید صاحب نے اس میں رباعیات کے مباحث بڑھا کر ایک مستقل کتاب کی شکل دے دی۔ یہ کتاب اکتوبر ۳۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ سید صاحب کی اہم ترین تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے علمی و تحقیقی اور تنقیدی و ادبی پائے کو اکابر اہل علم نے سراہا ہے۔ زیر نظر کتاب کے باب سوم میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

(۹) **نقوش سلیمانی**: سید صاحب نے اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ سے متعلق جو مضامین لکھے تھے۔ اور اردو کانفرنسوں میں جو معرکۃ الآراء خطبے پڑھے تھے۔ ۳۹ء کے اواخر میں نقوش سلیمانی کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ یہ گویا گذشتہ ربع صدی کی ادبی تحریکوں کا ایک مرقع ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں داخل کی گئی۔ باب سوم میں اس کتاب کے مباحث و محاسن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱۰) **رحمت عالم**: ۴۰ء میں سید صاحب نے بچوں کے لئے آسان و سلیس زبان میں سیرت نبوی کی ایک مختصر کتاب تالیف کی۔ یہ اتنی مقبول ہوئی کہ ہندی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

(۱۱) **حیات شبلی**: سید سلیمان ندوی نے اپنے شفیق استاذ کی آخری وصیت

---

[1] شاہ معین الدین: حضرت الاستاذ کی دینی و علمی خدمات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۰۵۔

کے مطابق تمام کاموں سے فارغ ہو کر شبلی کی سوانح عمری لکھنا شروع کی۔ اور دو ڈھائی کی مسلسل جانکاہ محنت کے بعد اس کو مکمل کیا۔ ۸۴۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سنہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ ضخیم تالیف صرف ایک جامع و ہمہ گیر شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی مستند تاریخ ہے۔ اسی کتاب پر سید صاحب کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ سیرت النبی کی ساتویں جلد کے چند ابواب ہی لکھ پائے تھے کہ اس جہان رنگ و بو سے دائمی جدائی کا پیام آگیا۔

(۱۲) **مقالات سلیمان:** سید صاحب کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے معارف اور دوسرے رسائل میں منتشر سید صاحب کے علمی مضامین کو یکجا کر کے مقالات سلیمان کے نام سے شائع کرنا شروع کیا ہے جس کی تین ضخیم جلدیں اب تک طبع ہو چکی ہیں۔

(۱۳) **مکتوبات سلیمان:** سید صاحب کے خطوط و مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا مجموعہ "برید فرنگ" کے نام سے خود سید صاحب نے مرتب کر کے سنہ ۵۲ء میں مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع کیا، اس کا دوسرا اڈیشن مجلس نشریات اسلام کراچی سے حال ہی میں شائع ہوا ہے یہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے سنہ ۲۰ء کے وفد خلافت کے سفر میں یورپ سے اپنے احباب کو ہندوستان میں لکھے تھے۔ دوسرا مجموعہ مکاتیب سلیمان کے نام سے سنہ ۱۹۵۴ء میں مکتبہ چراغ راہ کراچی سے شائع ہوا۔ یہ سید صاحب کے ان ۱۴۵ خطوط پر مشتمل ہے جو مسعود عالم ندوی کے نام وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ سید صاحب کے مکاتیب کا تیسرا سب سے اہم مجموعہ دو جلدوں پر مشتمل مکتوبات سلیمانی کے نام سے عبدالماجد دریابادی نے مرتب کر کے علی الترتیب سنہ ۶۳ء اور سنہ ۶۷ء میں شائع کیا۔ دونوں جلدوں میں مجموعی طور پر چار سو خطوط تاریخ وار مرتب کئے گئے ہیں۔ سید صاحب کے مکتوبات کے مذکورۃ الصدر تینوں مجموعے گوناگوں علمی، تاریخی اور ادبی معلومات کا خزینہ اور بے حد افادیت کے حامل ہیں۔

باب دوم (ب)

کردار و شخصیت

(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف اپنے علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے پرکشش شخصیت کے حامل تھے، بلکہ مبدأ فیاض سے ان کو ظاہری سراپا بھی بے حد دلآویز عطا ہوا تھا راقم سطور کو کتب خانہ دار المصنفین میں مرحوم کی دو تصویریں آویزاں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں سے ایک ۲۰ء کی ہے۔ صاف رنگ، موزوں قامت، متناسب اعضاء، سڈول جسم سفید صافہ، تیز سیاہ رنگ کی گول ڈاڑھی اور سفید شیروانی میں ان کی شخصیت بڑی جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا بڑے سائز کا فوٹو اس وقت کا ہے جب پیری نے عہد شباب کے ایک ایک نقش و نگار کو "طاق نسیاں" کی زینت بنا دیا تھا لیکن بایں ہمہ اس میں بھی ان کے سراپا کا حسن علی حالہ قائم ہے۔ گداز بدن، براق سفید ڈاڑھی، چھوٹا دہانہ منہ، پتلے ہونٹ، مسکراتا چہرہ، کلغی دار صافہ، اس کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے صلحاء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے مجموعی سراپا سے تقدس و تقویٰ کی بارش ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

رئیس احمد جعفری نے اپنے زمانہ طالب علمی میں (یعنی ۱۹۲۴ء) جب سید صاحب کو پہلی بار ندوہ میں دیکھا ہے۔ اس وقت کا سراپا ان ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> "نہایت سیاہ ڈاڑھی، سر پر نہایت سفید خوبصورت عمامہ، ہاتھ میں خوش نما چھڑی، خوب رو، خوش قامت، پتلے پتلے ہونٹ، چہرہ دلآویز سحر آگیں آنکھیں، شیروانی کے تمام بٹن گلے تک لگے ہوئے، آواز نہ پست نہ بلند، لیکن اس میں ایک خاص قسم کا وقار، ہونٹ تبسم سے آشنا، بارعب باوقار[۱]"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۷ء میں سید صاحب کے حلیہ و لباس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> "قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، لباس نہایت صاف ستھرا، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف، اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے[۲]"

---

[۱] رئیس احمد جعفری: دید و شنید ص ۱۲۰ (کتاب منزل لاہور ۱۹۴۳ء)۔

[۲] سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ اول ص ۲۱ (مکتبہ فردوس لکھنؤ ۷۵ء)۔

اس کے ٹھیک دس برس کے بعد "مالک" دلی میں سید صاحب کی زیارت سے مشرف ہوئے تو اُس وقت ان کے سراپا میں کافی تبدیلی آچکی تھی، وہ لکھتے ہیں:

> "نسبتہً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی تیز آنکھیں، کشادہ اونچی۔ پیشانی، کسی قدر لمبی ناک جو پھنگ کے قریب قدرے موٹی ہوگئی تھی قص الشارب واعضاء اللحی کے مصداق چھوٹی لبیں اور گھنی کھچڑی ڈاڑھی جو بہت لمبی نہیں تھی۔ اور جس میں سفید بال زیادہ تھے اور سیاہ کم، صاف ستھرا کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ، جس کے دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا، نیچے سفید پاجامہ اور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر ایک خاص طریقہ سے اڑس رکھا تھا[1]"

سید صاحب کی رحلت کے بعد اُن کے ایک پاکستانی مستند اہل قلم غلام محمد صاحب نے "تذکرۂ سلیمان" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف کی تھی۔ اس میں انھوں نے سید صاحب کے عالم پیری کے سراپا کا بڑا دلکش نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میانہ قد، متوسط جسم توازنِ مزاج کی دلیل محکم، پُرنور ماہتابی چہرہ، خوبصورت سفید گھنی ڈاڑھی تقدس کا ہالہ، فراخ دمکتی ہوئی پیشانی عظمتِ سلیمانی کی نشانی رخسار ابھرے ابھرے روشن کہ عین مرض موت میں بھی ضعف و نقاہت کو جھٹلاتے رہے، آنکھیں بڑی مگر وفور حیا سے جھکی ہوئی، ابرو بھرے بھرے خمدار محبت و دلداری کے ضامن، بینی و گوش توازنِ حسن کو قائم رکھے ہوئے، کان کی لویں پستہ عقل و فراست اور قوت خطابت پر گواہ، ہونٹ پتلے پتلے اور دہن تنگ احتیاط و ایجاز پر شاہد، رنگ کھلا ہوا، مگر سفید نہیں بلکہ

---

[1] مالک رام: "علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم" (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص، ۳۵-

> انا ملیح والی جاذبیت لئے ہوئے ہاتھوں کے پنجے چھوٹے اور نرم توت وحسن تحریر کی دلیل بنے ہوئے۔ پاؤں چھوٹے قدم چھوٹے، رفتار پُروقار[1]،،

سید صاحب نہایت جامہ زیب تھے، وہ لباس نہایت قرینے سے اور اپنے حسب حیثیت پہنتے تھے۔ اور اس کے استعمال میں موقع ومحل اور موسم کی رعایت ضرور کرتے تھے۔ نوجوانی میں لباس فاخرہ کے شوقین تھے۔ قمیص، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ مگر کوچۂ تصوف کا رخ کرنے کے بعد سفید کرتا گھٹنوں کو چھپائے ہوئے اور چھوٹی مہری کا لٹھے کا پاجامہ ٹخنوں سے علانیہ اونچا استعمال کرنے لگے تھے[2] جاڑوں کے موسم میں کبھی سلک کا پتلون، چسٹر یا پشاوری جبہ پہنتے اور سر پر شامی رومال باندھتے تھے۔ جب باہر نکلتے تو پابندی سے براق سا سفید صافہ باندھتے تھے۔ یوں نجی صحبت میں سفید دوپلیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ سید الحق دسنوی نے لکھا ہے کہ ”میں نے سر سکندر حیات مرحوم کے سوا کسی دوسرے کے سر پر دستار کو اس طرح زیب دیتے نہیں دیکھا جیسا سید صاحب کے[3]،، رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

> ”سید صاحب کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے تھے۔ اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے۔ اس لئے کہ کبھی ان کے جسم پر میلا تو درکنار ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا گیا۔ موزہ بالعموم پہنتے جو ہمیشہ صاف اور ثابت ہوتا۔ رومال نہایت صاف رکھتے تھے اور بہت جلد بدل دیتے تھے[4]،،

سید صاحب جوتا کبھی پمپ اور کبھی سلیم شاہی پہنتے تھے۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنتے جس کے بیضوی حلقے میں ”سید سلیمان ندوی،، بخط ثلث کندہ تھا[5] خلافت اور

---

[1] غلام محمد : ”تذکرۂ سلیمان“ ص ۳۰۰ (آفسٹ لیتھو پریس کراچی سنہ ۶۰ء)۔

[2] شاہ معین الدین ندوی : حیات سلیمان ص ۶۰۵۔

[3] سید الحق دسنوی : ”کچھ سید سلیمان ندوی کے متعلق،، (مضمون) معارف ستمبر سنہ ۵۷ء ص ۱۷۲۔

[4] رشید احمد صدیقی : ہم نفسان رفتہ ص ۴۵۔

[5] غلام محمد : تذکرۂ سلیمان ص ۳۰۳۔

ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں سید صاحب نے اعلیٰ قسم کے لباس کے شوق کو خیر باد کہہ کر کھدر پوشی اختیار کر لی تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ان تحریکوں نے لباس کا شوق پورا نہ ہونے دیا" لیکن کھدر پوشی میں بھی نفاست اور خوش مذاقی رہی تھی [۱]۔

سید صاحب کا چہرہ شروع ہی سے ڈاڑھی کے نور سے معمور تھا۔ مولانا تھانوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد اور بھی بقعۂ نور ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین برنی نے سید صاحب کے انتقال سے صرف ایک یوم قبل یعنی ۲۱ر نومبر ۱۹۵۳ء اُن کی زیارت کی تھی۔ اس وقت ناسازیٔ طبع کے باعث سید صاحب فریش تھے۔ موصوف لکھتے ہیں :

> "ان کے چہرے کی نورانیت، جاذبیت اور روشنی ایسی ناقابل فراموش تھی کہ میں برابر اُن کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا [۲]"

(۲)

سید صاحب کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد کلام پاک کی تلاوت کرتے، ناشتہ کے بعد کتب خانہ دارالمصنفین میں لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے اور پھر دوپہر تک دنیا ومافیہا سے بے خبر رہکر کام میں مشغول رہتے ظہرانہ پر ان کے شرکائے طعام آکر بیٹھ جاتے لیکن ان کا اشہب قلم دوڑتا ہی رہتا۔ بار بار آدمی بلانے کے لئے جاتا مگر وہ قلم نہ چھوڑتے اور بالآخر بادل ناخواستہ اٹھ کر آتے۔ کھانے میں شریک ہوتے، پھر گھر چلے جاتے اور قیلولہ فرماتے، تھوڑی سی جھپکی لینے کے بعد اُٹھتے وضو کرتے مسجد میں ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے پھر کتب خانہ میں آکر بیٹھ جاتے اور عصر تک اسی انہماک سے کام میں مشغول رہتے [۳] جب قویٰ کمزور ہو گئے تو دوسرے وقت کا کام چھوڑ دیا تھا اور ظہر بعد سے عصر تک کا وقت گھر میں گزرتا تھا اس میں بھی بیکار نہ رہتے تھے، کلام پاک یا کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرتے [۴]۔

---

[۱] شاہ معین الدین ندوی : حیات سلیمان ص ۶۰۵۔

[۲] ضیاء الدین برنی : عظمت رفتہ ص ۳۵۶ (تعلیمی مرکز کراچی سنہ ۶۱)۔

[۳] صباح الدین عبدالرحمٰن : آہ سید صاحب (مضمون) معارف اعظم گڈھ جنوری سنہ ۵۴ء ص ۹۔

[۴] شاہ معین الدین ندوی : حیات سلیمان ص ۶۲۹۔

نماز عصر کے بعد سے مغرب تک اُن کے برآمدہ میں مشترک نشست ہوتی تھی، تمام رفقائے دارالمصنفین ان کے پاس جمع ہوجاتے۔ سید صاحب کے انشراح کا یہی وقت ہوتا تھا، بڑی محبت و شفقت سے باتیں کرتے زیادہ تر مذہبی اور علمی گفتگو ہمہ تن گوش ہوکر سنتے تھے نماز مغرب سے کچھ قبل یہ مجلس ختم ہوجاتی تھی اور سید صاحب اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو گود میں لے کر احاطۂ دارالمصنفین کی گول سڑک پر ایک دو چکر لگاتے۔ یہی ان کی گویا روزانہ کی ورزش تھی

نماز مغرب سے فارغ ہوکر سید صاحب زنان خانے میں چلے جاتے تھے۔ اس وقت ان کی خانگی مجلس ہوتی تھی وہ گھر میں ایک کھری چارپائی پر لیٹ جاتے اور ان کے چھوٹے بچے آکر کبھی ان کے سینے سے چمٹ جاتے اور کبھی پیٹ پر لیٹ رہتے۔ سید صاحب اپنے بچوں کو بھی "آپ" کہہ کر مخاطب کرتے اور اُن کو ڈانٹنے جھڑکنے میں بھی ان کی فطری متانت، سنجیدگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ جب بھی ان کو کوئی قصہ کہانی سناتے تو وہ بھی سچی اور سبق آموز ہوتی تھی۔ اس خانگی مجلس میں زیادہ تر تفریحی گفتگو ہوتی تھی۔

سید صاحب پُرخور تو نہ تھے مگر خوش خوراک تو ضرور تھے۔ بالفاظ دیگر غذا کم تھی لیکن عمدہ ہوتی تھی۔ ان کے گھر میں کھانا بہت خوش ذائقہ پکتا تھا۔ آموں کے بیحد شائق تھے۔ اپنے وطن دیسنہ میں بہت شوق سے اس کا باغ بھی لگوایا تھا[1] ان کی کم خوری کا یہ عالم تھا کہ دو چپاتی اور دو چار نوالے چاول سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔ آخر عمر میں تو اس میں بھی مزید کمی ہوگئی تھی[2] کھانے بڑے سلیقہ اور بڑی نفاست سے تناول فرماتے تھے اور یہ نفاست پسندی ان کی فطرت کا جزو لازم تھی، جس کی کارفرمائی نہ صرف کھانے میں بلکہ ہر چیز میں اور ہر جگہ نظر آتی تھی[3] سید صاحب آداب طعام کی تلقین اپنے رفقاء کو بھی کرتے رہتے تھے۔ وہ چائے عمدہ پیتے تھے اور کھانے سے زیادہ اس میں اہتمام کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے چائے اچھی ملنی چاہیئے اس لئے کہ کھانا زندہ رہنے کے لئے مگر چائے تو تعیش ہے[4]"، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سید صاحب کی نفاست پسند

---

[1] مسعود عالم ندوی : "استاذ مرحوم" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۱۴۹۔

[2] شاہ معین الدین ندوی : حیات سلیمان ص ۲۰۶۔

[3] رشید احمد صدیقی : ہم نفسان رفتہ ص ۴۵۔

[4] سعید الحق دسنوی : "کچھ سید سلیمان کے متعلق" (مضمون) معارف ماہ ستمبر ۵۵ء ص ۱۰۲۔

فطرت کے مظاہر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ”وہ لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا اور سجل رکھتے تھے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست ہوتی۔ بستر بند کٹا پھٹا، میلا کچیلا، تڑا مڑا نہ ہوتا ہینڈ بیگ پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا۔ تکیہ کا غلاف اور چادر نہایت صاف، اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ، وافر، خوشنما۔ لوٹا گلاس، ناشتہ دان، صابون، صابون دانی سب منجھا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا اور دبیز اور بہت صاف دُھلا ہوا.......... کلام پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوبصورت جزدان میں ہوتی[1]،،

(۳)

سید سلیمان ندوی سراپا وقار اور مجسم متانت تھے۔ ضبط و تحمل اور صبر و شکر ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ کم آمیزی، عافیت جوئی اور سنجیدگی ان کی طینت تھی۔ سید صاحب کم سخنی اور خاموش طبعی کے باعث بچپن میں اُن کے اساتذہ ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے اور ان کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر ان کی طرف نسبتہً زیادہ اعتنا کرتے تھے[2] پھر حصول فضل و کمال کے بعد جب دنیا میں ان کی شہرت کا غلغلہ بلند ہوا تو ان کی اسی کم سخنی کے باعث لوگوں کو اس پر خود بینی اور کبر کا شبہ ہوتا تھا[3] سید صاحب کو جب یہ علم ہوا کہ لوگ ان کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں تو پھر رفتہ رفتہ اپنی افتاد طبع کو بدلنا شروع کیا اور آخر میں تو وہ ”حیوان ظریف،، نہ سہی زاہد خشک بھی نہ رہ گئے تھے۔ بلکہ بقول سید ابوظفر ندوی ”آخر عمر میں سید صاحب اس قدر شگفتہ ہو گئے تھے کہ ان کی مجلس سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا[4]،،

بعض دوسرے اہل قلم کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ سید صاحب میں صرف

---

[1] رشید احمد صدیقی: ”گنج گرانمایہ“ (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۱۲۷۔

[2] سید ابوظفر ندوی: ”بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات“ (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۸۴۔

[3] مناظر احسن گیلانی: ”سید الملت کی مکتبی زندگی،، (مضمون) ماہنامہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۲۴۔

[4] ابوظفر ندوی: ”بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات،، (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۵۰۔

خشک علمی وقار نہ تھا، بلکہ اپنے احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج، سبک روح اور خوش مذاق تھے، لیکن بایں ہمہ اُن کے مزاح میں بھی ایک علمی شان ہوتی تھی۔ متانت وظرافت کا اتنا حسین ومعتدل امتزاج بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ سید صاحب کی متین ظرافت اور لطیف مزاح کے ثبوت میں درج ذیل واقعہ قابل ذکر ہے:۔

> "ایک بار ہندوستان کی ایک بلند پایہ شخصیت سید صاحب کی مہمان تھی۔ دونوں اکابر شبلی منزل کے سبزہ زار پر چہل قدمی کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک گدھا احاطہ میں گھس آیا، مہمان نے ازراہ مزاح میزبان پر طنز کیا "اچھا یہاں گدھے بھی رہتے ہیں"۔ سید صاحب نے نہایت سادگی سے جواب دیا "جی نہیں باہر سے آجاتے ہیں"۔ [1]

متانت وظرافت کے اس دلکش امتزاج کے ساتھ سید صاحب کا ذوق جمال بھی نہایت بلند تھا، ان کی ایک ایک ادا خوش ذوقی اور جمال پسندی کی آئینہ دار تھی۔ چنانچہ جب ان کے ہاں ریڈیو خریدا گیا تو اس کے غلاف پر کاڑھنے کے لئے کوئی عبارت تجویز کی درخواست کی گئی۔ سید صاحب کی موزونی طبع اور حسن ذوق کا کمال ملاحظہ فرمائیے کہ اس کے لئے فوراً یہ آیت لکھ دی:۔

"انطقنا اللہ الذی انطق کل شیٔ"۔ [2]

اسی طرح اپنے لیٹرہیڈ (Letter Head) کے سرنامہ پر چھاپنے کے لئے یہ آیت تجویز کی:۔

"إنہ من سلیمان وإنہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

ایک مسترشد نے جو فونٹن پن کے تاجر تھے اپنے کاروبار میں برکت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ سید صاحب نے دعا فرمادی اور ساتھ ہی تبسّم زیر لب کہا کہ اپنی دکان میں یہ آیت

---

[1] ضیاء الدین برنی: عظمت رفتہ ص ۳۵۷۔

[2] اس اللہ نے ہمیں قوت نطق عطا کی جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت دی ہے۔

لکھ کر آویزاں کر دیجئے:۔

"نٓ وَالقلم وَمَا یسطرُوْنَ"[1]

علامہ سید سلیمان ندوی کے مزاج میں شروع ہی سے حلم و بردباری، تحمل و صلح جوئی اور عفو و درگزر کا مادہ تھا، اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ انھیں کوئی مشتعل نہیں کر سکتا تھا[2]۔ سید صاحب کو زندگی میں متعدد مواقع پر بعض شدید صدمے پہونچے، لیکن کمال حلم و تحمل سے انھوں نے سب کو انگیز کیا اور اپنے آئین صلح پسندی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

سیّد صاحب سیاسی، مذہبی یا علمی مسائل اور مناقشہ میں دوسروں کا موقف بڑی متانت اور تحمل کے ساتھ سنتے تھے۔ بحث میں وہ کبھی جز بز نہ ہوتے تھے۔ نہ آواز بلند کرتے اور نہ قطع کلام سے کام لیتے۔ کوئی پھبتی یا فقرہ کسنے یا دلآزاری کی بات کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا شخص کتنا ہی نامناسب لب و لہجہ کیوں نہ اختیار کرتا۔ سید صاحب کے رکھ رکھاؤ، سنجیدگی اور بردباری میں ذرہ فرق نہ آتا تھا۔[3]

ان کے حلم اور بردباری کے جلوے صرف معمول کی زندگی ہی میں نمایاں نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کے باعث سید صاحب کے خامۂ گوہر فشاں کی جبین پر بھی کبھی جھنجلاہٹ اور غیظ و غضب کی سلوٹیں ظاہر نہیں ہو سکیں۔

(۴)

محبّت، اعتماد اور مسامحت تاحیات سیّد صاحب کا شعار (Motto) اور دستور العمل رہا، اپنے ایک تلمیذ رشید مولانا مسعود عالم ندوی کو ۹ راپریل ۱۹۴۱ء کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:۔

"گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط، ہمارا اصول ہے۔ محبّت،

---

[1] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۳۱۴۔ [2] عبدالباری ندوی: سیرت السیّد کے کچھ انمول سبق (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۴۰۸۔ [3] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۶۱۴۔

> اعتماد اور مسامحت ہمارا دستور العمل ہے۔ جس دن یہ بات نہ رہے گی میں نہیں رہوں گا، کونوا عباد اللہ اخوانا"۔ [1]

سید صاحب نے اپنی ۶۸ سالہ طویل زندگی اور وسیع تعلقات میں شاید ہی کسی شخص کو نقصان پہونچایا یا اپنی ذات کے لئے اس سے انتقام لیا ہو۔[2] نہ تو ان کی زبان ہی کسی درشت کلمہ سے آلودہ ہوئی اور نہ ان کے قلم سے کسی کی دل آزاری ہوئی۔ یہاں تک کہ گھر کے ملازموں اور بچوں تک پر سختی نہ کر سکتے تھے۔ عبدالقدوس ہاشمی نے سید صاحب کے اس خلق کریم کے بارے میں لکھا ہے کہ "پچاس سالہ مشغول مدت میں کسی معاصر نے یہ شکایت نہ کی کہ سیّد صاحب کے قلم یا زبان سے اسے کوئی گزند پہونچا ہے۔ وہ اپنی محفلوں میں معاصرین کا تذکرہ نہ تو مبالغہ کے ساتھ کرتے اور نہ تخفیف واستہزا کے ساتھ"[3] وہ کسی کے متعلق بری رائے نہ رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ "میں جب کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا ہی سمجھتا ہوں اور اس وقت تک سمجھتا رہتا ہوں جب تک وہ خود اپنے کو برا نہ ثابت کردے"۔[4]

سید صاحب کا کسی سے اختلاف رائے علمی ونظری ہوتا تھا، ذاتی نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی سے آخر عہد میں بعض سیاسی اختلافات کے باوجود ان کے بے حد مداح اور بڑے گرویدہ تھے جس پر وہ دلدوز ماتم اور منثور مرثیہ شاہد عدل ہے جو پہلے معارف میں شائع ہوا اور پھر یاد رفتگاں کی زینت بنا۔ اسی طرح حافظ محمود شیرانی سے سید صاحب کی برابر علمی چشمک رہی۔ شیرانی مرحوم نے شبلی کی "شعر العجم" کی تنقید لکھی تھی جس سے سیّد صاحب کو کچھ تکدر اور ملال تھا۔ لیکن بایں ہمہ جب حافظ محمود شیرانی کی وفات ہوئی تو سیّد صاحب اس خبر سے بے حد ملول وافسردہ ہوئے اور معارف کے شذرات میں بہت کھل کر شیرانی مرحوم کے فضل وکمال کا اعتراف کیا۔

---

[1] مکاتیب سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی ص ۱۱۳۔ [2] سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ اوّل ص ۶۲۔

[3] عبدالقدوس ہاشمی: "سید صاحب کی یاد" (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۳۵۔

[4] سیّد صباح الدین عبدالرحمان: "اخلاق وسیرت کے کچھ جلوے" معارف سلیمان نمبر ص ۳۷۔

دراصل سیّد صاحب کے نزدیک دوستوں کے ساتھ تلطف اور دشمنوں سے مدارا ہی میں "آسائش دوگیتی" کا راز پنہاں تھا۔ مولانا علی میاں اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں :-

> "میرے سامنے ایک مرتبہ امین آباد (لکھنؤ) میں ایک نوجوان نے سید صاحب سے بطور یادگار ایک منتخب شعر لکھنے کی فرمائش کی۔ سید صاحب نے خواجہ حافظ کا مشہور شعر لکھا ؎
>
> آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرفست
> با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
>
> میرے خیال میں ان کا یہ انتخاب محض اتفاقی اور سرسری نہ تھا یہ ان کا اصول زندگی تھا جس پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔"[1]

مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے ایک مضمون میں سید صاحب کا اپنے نام ایک معذرت نامہ نقل کیا ہے، جو درحقیقت سید صاحب کے حسن خلق کا ایک یادگار نمونہ ہے اور اس سے سید صاحب کی صاف باطنی اور بے نفسی کی ایک دلکش تصویر ابھرتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

> "پرسوں میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا وہ ہلکا ہو جائے۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اُس خط کو لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ میں نے رات اللہ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو۔ بایں وجہ میں نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک راز سربستہ کی طرح دفن کر دیجئے۔ اور مجھے معاف کیجئے۔ میں نے گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے اور آیندہ کے لیے حسن معاونت کی خاطر لکھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ مجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا۔ اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں اور میری اس

---

[1] سیّد ابوالحسن علی ندوی : پرانے چراغ حصّہ اول ص ۶۲۔

> تحریر کو بھی میرے گزشتہ اعمال بد کا ایک جزو سمجھ لیں۔ اس وقت مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے"۔ [1]

سید صاحب نے بڑی مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ اسی باعث اختلاف و کشمکش سے ہمیشہ گریزاں رہے اور مسابقتؔ و مقابلہ سے بہت گھبراتے تھے۔ اگر کسی معاملہ میں کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی تو نہایت خاموشی سے خود کو اس سے الگ کر لیتے تھے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے عالم شباب میں سید صاحب اس کے بہت سرگرم کارکن اور مبلغ تھے۔ مگر جب اختلاف و کشمکش کی صورت پیدا ہوئی تو اس سے الگ ہونے کو تیار ہو گئے۔ چنانچہ اپنے چچا سید عبدالحکیم دسنوی کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۴ رجنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "میں نے بعد کو مولانا محمد علی اور شوکت علی سے کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے مجھے دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں لیکن دونوں نے نامنظور کیا"۔ [2]

(۵)

سیّد صاحب کو اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی سے عقیدت ہی نہیں عشق تھا، وہ جب ان کا ذکر کرتے تو طرز بیان اور گفتار کی ہر ادا سے والہانہ عقیدت و محبت تراوش کرتی تھی، استاذ کا نام آتے ہی ان پر عجب سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ سیّد صاحب خود کو علامہ شبلی کا فرزند معنوی کہا کرتے تھے۔ استاذ محبوب کی دائمی مفارقت پر سیّد صاحب کا کیا عالم ہوا۔ خود ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:۔

> "مجھ پر اتنا شدید غم کبھی عمر بھر طاری نہیں ہوا۔ مجھے وفور غم سے اپنی زندگی کی کوئی توقع باقی نہ تھی اور دیکھنے والے بھی محسوس

---

[1] عبدالباری ندوی: "سیرت السید کے انمول سبق" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۹۲۔

[2] مکاتیب سید سلیمان ندوی بنام سید عبدالحکیم دسنوی مطبوعہ معارف اعظم گڑھ۔

کرتے تھے کہ میرا خون جل گیا ہے اور چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔"[1]

سید صاحب علامہ شبلی کے احسانات کا بڑے جذباتی اور والہانہ انداز میں ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ان سے مدۃ العمر قریب رہنے والوں کا بیان ہے کہ حیات شبلی کی تصنیف کے دوران سید صاحب عجب کیف و سرور کے سمندر میں غرق نظر آتے تھے۔ اکثر آنکھیں آنسوؤں کا نذرانہ بھی پیش کرنے لگتیں۔ اتنی مستقل مزاجی کے ساتھ شاید ہی انھوں نے کوئی کتاب لکھی ہو کہ پوری تصنیف (حیات شبلی) کے دوران دو سال تک انھوں نے دارالمصنفین سے باہر قدم نہیں نکالا۔ غلام محمد صاحب جو آخری تین سالوں میں سید صاحب کی خلوت و جلوت اور سفر و حضر ہر وقت کے ساتھی تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ وفات سے چند ماہ قبل:۔

> "میں نے مولانا شبلی کا تذکرہ چھیڑا، حضرت والا صوفہ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ فوراً سیدھے ہو بیٹھے اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا "مولانا کے احسانات کا شمار ہی کیا ہو سکتا ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اُن ہی کا رہین منت ہے۔ یہ دو جملے ابھی درد بھری زبان سے ادا بھی نہ ہو پائے تھے کہ آنکھوں نے سبقت کی، اور ہدیہ اشک محسن کی یاد میں نچھاور کر دیئے۔"[2]

اسی طرح سید صاحب اپنے ہم درسوں اور مکتب کے ساتھیوں سے بھی بڑا اخلاص اور گہری مودت رکھتے تھے۔ مرغ شہرت کے بال و پر نکل آنے کے بعد بھی جہاں کہیں کوئی ہمدم دیرینہ مل جاتا اس سے بڑے تپاک، اخلاق و محبت اور بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان کو چاہ و پیار سے بھرپور خط لکھتے تھے۔

سید صاحب اپنے معاصرین میں ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مناظر احسن گیلانی، مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور ابوالقاسم بنارسی سے بہت قلبی تعلق اور بڑا گہرا دلی لگاؤ رکھتے تھے اور جب ان میں سے اکثر ہم عصر مشاہیر ان کی زندگی ہی میں دائمی مفارقت اختیار کر گئے تو سید صاحب نے

---

[1] [2] غلام محمد: تذکرہ سلیمان ص ۴۳، ۴۴۔

اشکبار آنکھوں، پرنم دل، لرزاں قلم اور مضطرب قلب وجگر کے ساتھ "معارف" کے شذرات میں ماتم لکھ کر اپنے خلوص کا نذرانہ پیش کیا۔ ایسے شذرات جو نسبتاً تعداد میں کم ہیں درحقیقت محض صفحۂ قرطاس پر روشنائی کے چند حروف نہیں بلکہ درحقیقت چشم بصیرت کے لئے دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔

سید صاحب کے دل میں صلحاء واخیار کی بے پناہ عقیدت، اہل علم کی قدر اور علماء کا بے حد احترام تھا، انھوں نے جن اساتذہ سے اکتساب فیض کیا یا جو اکابر عصران کے شیوخ کی صف کے تھے[1] سید صاحب ان سے غایت درجہ اکرام واحترام اور تواضع کے ساتھ ملتے تھے[2] یہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد ان کے فضائل وکمالات اور محاسن اخلاق کا "معارف" کے صفحات میں دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

(٦)

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے استاذ شبلی کی طرح ہونہار و باصلاحیت نوجوانوں کی تربیت کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی جوہر شناس نگاہوں سے لائق اور ذہین طلبہ کو منتخب کر کے ان کی علمی رہنمائی بڑی شفقت اور توجہ کے ساتھ کرتے۔ چنانچہ کتنے ذرّے اس خورشید تاباں کی شعاعوں سے چمک اٹھے۔ خود مصنف اور محقق ہونا یقیناً مشکل کام ہے لیکن محقق ساز اور مصنف گر ہونا دشوار تر ہے۔ سید صاحب اس سلسلہ میں امتیاز خاص کے مالک تھے۔ ان میں دوسروں کی علمی نگرانی اور رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا۔ رفقائے دارالمصنفین کو توخیر اپنے قائد وامام سے براہ راست فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل تھی مگر اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشوں میں جو نوجوان علمی ذوق سے بہرہ ور تھے وہ بھی اگر سید صاحب سے استفادہ و رہنمائی کے طالب و خواہش مند ہوتے تو وہ کبھی ان کو مایوس نہ کرتے تھے۔ سید عزالدّین ندوی سید صاحب کے اس وصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

---

[1] مثلاً شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا عبداللہ، مولانا حفیظ اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ۔

[2] محمد اویس ندوی: "آئی جوان کی یاد" (مضمون)، ریاض کراچی سلیمان نمبر ص، ۵۔

رقمطراز ہیں :۔

> " سید صاحب اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ حدیث "خیر الناس من ینفع الناس" کی زندہ تفسیر تھے. علم پروری اور نفع رسانی ان کے خمیر کا ایک جزو بن گئی تھی .... وہ اپنے معاصرین کو بھی فائدہ پہونچانے سے گریز نہیں کرتے تھے. ندوۃ العلماء کے وابستگان میں کوئی ایسا نہیں جو ان کا ممنون کرم نہ ہو۔" [1]

سید صاحب نوجوان اہل قلم کو جہاں قیمتی علمی مشورے دیتے، ان کی لغزشوں پر کبھی سرد کبھی گرم تنبیہ بھی کرتے، مستند ماخذ کی نشاندہی کرتے اور زبان و بیان کی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ وہیں اگر کسی کا کوئی مضمون یا کوئی فقرہ پسند آجاتا تو اس کی حوصلہ افزائی بھی دل کھول کر کرتے تھے. مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنے نام سید صاحب کے خطوط کا جو مجموعہ "مکاتیب سلیمان" کے نام سے شائع کیا ہے اس میں اس قسم کے بکثرت خطوط ہیں۔ ۷/اگست سنہ ۱۹۲۹ء کے ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :۔

> " النظرات کیا پڑھنے کی چیز ہے؟ المثل السائر، مقدمہ ابن خلدون کتاب الصناعتین اور کتاب العمدۃ ابن رشیق وغیرہ پڑھو، اہل مصر کی موجودہ عربی معیار سے پست ہے. ساتھ ہی عربی لکھنے کی مشق جاری رکھو۔" [2]

سید صاحب کی دلی تمنا اور عین خواہش تھی کہ جیسی ہمہ گیری اور جامعیت، جیسی اعتدال پسندی اور حق پژوہی، جیسا شیوۂ محبت و مسامحت خود ان کے اندر ہے، وہ ہر ندوی میں پیدا ہوجائے اپنے خطوط میں بھی اور زبانی طور پر بھی برابر اپنے تلامذہ اور منتسبین کو اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ [3]

---

[1] سید عزالدین ندوی : علامہ سید سلیمان (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۱۰۳۔

[2] مکاتیب سلیمان بنام مولانا مسعود عالم ندوی ص ۲۶۔

[3] مجیب اللہ ندوی : "تحریک ندوہ اور سید صاحب" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۸۲۔

اسی حوصلہ افزائی، خورد نوازی اور شفقت و محبت اور حسن تربیت کا ثمرہ تھا کہ سیّد صاحب کی حیات ہی میں ممتاز اہل قلم ندویوں کی پوری ایک جماعت تیار ہو گئی تھی، ان کے چراغ سے بکثرت چراغ روشن ہو گئے۔ جن کی ضیا باری سے سید صاحب کی علمی امانت دارالمصنفین ہمیشہ جگمگاتا رہا ہے۔

(۷)

کثرت مطالعہ اور تلاش و تحقیق سید صاحب کی شخصیت کے خاص جوہر تھے۔ شدید بیماری اور ضعف و نقاہت کے عالم میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا تھا، سید صاحب کی طبعی کم آمیزی نے ان کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بہت درست لکھا ہے کہ "گو وہ ۱۹۰۷ء میں ندوہ کی عرفی طالب علمی سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ لیکن طالب علمانہ روح زندگی بھر ان کے ساتھ لگی رہی اور شہرت و عظمت کے اوج کمال تک پہونچ جانے کے بعد بھی کتابوں سے اخذ و استفادہ میں کمی نہیں آئی"[1] شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:۔

> "سیّد صاحب کی کتب بینی کا شغف آخر عمر تک قائم رہا، فارغ اوقات میں بھی کبھی بیکار نہ بیٹھتے۔ کچھ نہ کچھ پڑھا کرتے تھے، لکھے ہوئے کاغذ کا کوئی ٹکڑا بھی مل جاتا تو اس کو پڑھے بغیر نہ چھوڑتے۔ ایک زمانے میں رات کو بھی مطالعہ کرتے تھے، لیکن جب کثرت مطالعہ نے صحت پر اثر ڈالا تو رات کا مطالعہ چھوڑ دیا تھا۔ کتبخانہ دارالمصنفین کی ساری کتابیں، جن کی تعداد ہزاروں تک ہے، ان کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں، جس پر ان کے نوٹ شاہد ہیں۔ جس کتاب میں جو کام کی بات مل جاتی اس کو شروع کتاب کے سادہ صفحہ پر نوٹ کر دیتے۔ مشکل ہی سے کوئی کتاب ان کے ملاحظات سے خالی مل سکتی ہے۔

---

[1] سیّد ابوالحسن علی ندوی: "پرانے چراغ" حصّہ اول ص ۵۹۔

> ابن خلکان کا ایک نسخہ جو زمانہ طالب علمی سے ان کے مطالعہ میں تھا، نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔"[۱]

سید صاحب جب کسی اہم موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تو پہلے اس کے متعلق کافی مطالعہ کرتے اور جہاں کہیں بھی انھیں اپنے موضوع کے متعلق معلومات ملنے کی توقع ہوتی اس کو وہاں سے اخذ کرتے تھے، اور حتی الوسع تحقیق وتنقید کے بعد جمع شدہ مواد نہایت سلیقہ اور عالمانہ طریقہ سے سجاتے تھے۔[۲] حیات شبلی میں سید صاحب نے بلا دیورپ کے بارے میں معلومات کا انبار لگا دیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے جو محنت وکاوش اور جانکاہی کی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۳۹ء میں جب سید صاحب کرنال اور پانی پت کے اپنے ایک طویل علمی سفر سے واپسی میں جامعہ ملیہ دہلی میں مقیم ہوئے تو پہونچتے ہی:-

> "ایک ندوی فاضل سے جو اس وقت جامعہ میں پڑھتے تھے ملاقات ہوئی، ملتے ہی فرمایا کیا تمہارے کتب خانے سے قنوج کی تاریخ پر فلاں انگریزی کتاب مل سکتی ہے۔ شام کا وقت تھا اور سید صاحب کی آنکھوں میں تکلیف تھی .... لیکن سید صاحب نے اسی وقت کتاب حاصل کر کے اس سے استفادہ کیا۔"[۳]

اسی انہماک وشغف کے باعث انھوں نے ایسا عظیم ویادگار علمی ذخیرہ چھوڑا جو پوری ایک جماعت کو مصنف بنانے کے لئے کافی ہے۔ بقول مولانا علی میاں "یورپ اور ایشیا میں کئی کئی آدمی مل کر زندگی کی تمام راحتوں اور سہولتوں کے ساتھ بعض اوقات اتنا علمی وتصنیفی کام نہیں کر پاتے جو سید صاحب نے تنہا انجام دیا۔"[۴]

---

[۱] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۶۲۲۔

[۲] محمد زبیر صدیقی: ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اور ان کا تشخص (مضمون) معارف سلیمان نمبر، ۳۳۷۔

[۳] [۴] سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ اول ص ۳۳، ۶۰۔

سید صاحب اپنے طریقہ تصنیف اور طرزِ تحقیق و جستجو میں اپنے استاذ و مربّی علامہ شبلی کے مسلک و روایت کے کامل متبع تھے۔ اس بارے میں وہ خود ایک جگہ رقمطراز ہیں :-

> "...... تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد ہر کونے اور گوشہ میں اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے۔ اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اس سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالے کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے۔ حوالہ میں سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے۔" [1]

سید صاحب کی علمی گفتگو بھی کثرتِ معلومات سے پر ہوتی تھی، ان کی ہم نشینی سے جو قیمتی معلومات حاصل ہوتے وہ بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے وہ ہر مسئلہ زیرِ تحقیق کے متعلق خواہ وہ علمی و مذہبی ہو یا سیاسی و معاشرتی۔ ایک سوچی سمجھی پختہ رائے اور اس کے متعلق مستقل نظریات رکھتے تھے۔ [2]

سید صاحب تحریر و تقریر میں بے حد محتاط تھے۔ لکھنے کے بعد موقع نکال کر تحریر کے مسوّدہ کو دوبارہ سہ بارہ ضرور دیکھ لیا کرتے تھے۔ اپنے تلامذہ کو بھی برابر اس کی تنبیہ و تلقین کرتے رہتے تھے کہ کسی موضوع پر لکھنے کا ارادہ اس وقت تک نہ کرو جب تک بقدرِ امکان اس پر مطالعہ کر کے کافی مواد نہ جمع کر لو۔ پھر اپنی تحریروں کو اشاعت کے لئے اس وقت تک نہ دو جب تک دوبارہ سہ بارہ اس پر نظرِ ثانی نہ کر لو۔ "حیات شبلیؒ" کا مسوّدہ تیار ہونے کے بعد اس کو پریس میں دینے سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مسعود علی ندوی، اور بعض دوسرے متعلق حضرات کو دکھایا کہ شاید کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اصلاح ہو جائے۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کے لئے رحمتِ عالم تصنیف فرمائی تو طباعت سے قبل

---

[1] سید سلیمان ندوی: "میں جن سے متاثر ہوا" (مضمون) معارف ماہ جولائی ۱۹۵۰ء ص ۹ -

[2] شاہ معین الدین: حیات سلیمان ص ۶۳ -

اس کو اپنے شاگردوں کے سپرد کر دیا اور ہر لفظی و معنوی گرفت کے لئے ان کو پوری آزادی دے دی۔[1]

ایک بار سید صاحب حیدر آباد کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی کسی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے تشریف لے گئے۔ وہاں ملک کے دوسرے اکابر اہل علم بھی بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے، لیکن کانفرنس سے پہلے دوسرے لوگ تو خوش وقتی میں مصروف تھے۔ اور سید صاحب نے حیدر آباد پہونچتے ہی کتب خانہ آصفیہ سے کسی کتاب کی روٹو گراف کاپی منگوائی اور رات گئے تک اپنے کمرے میں تنہا مقالہ کے اوراق سامنے رکھ کر اس پر بار بار نظر ثانی اور حک و اصلاح کرتے رہے۔ اس طرح دس بار نظر ثانی کی۔ اس بار بار کی ترمیم و اصلاح اور حک و اضافہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب کا مقالہ بالاتفاق اس کانفرنس کا سب سے قیمتی مقالہ قرار دیا گیا۔[2]

(۸)

سید صاحب اپنے استاذ و مربی علامہ شبلی کی طرح کثیر الاشواق، جامع الاذواق اور متنوع الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت نے علم و فن کے مختلف میدانوں میں جولانیاں دکھائی ہیں۔ وہ بیک وقت مفسر بھی تھے محدّث بھی، فقیہ بھی، متکلم بھی، صوفی بھی، معلم بھی، نعت نویس بھی، محقق بھی، مورخ بھی ادیب بھی، شاعر بھی، خطیب بھی، سیاسی مفکر بھی اور سب سے بڑھ کر تقویٰ، طہارت اور مہر و محبت کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ سید صاحب کی شخصیت کی یہ بوقلمونی اور جامعیت ان کے تاج کمال اور کلاہ افتخار کا وہ درآبدار تھی جس نے ان کو علمائے ہند کی صف میں انفرادیت عطا کی۔ بلا شبہہ اس جامعیت و انفرادیت کی نظیر کم از کم جدید ہندوستان کی تاریخ میں نادر الوجود ہے۔[3] وہ جس میدان کا بھی رخ کرتے اس میں

---

[1] محمد اویس ندوی: "آئی جوان کی یاد" (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۵۷۔
[2] عبدالقدوس ہاشمی: "سید صاحب کی یاد" (مضمون) " " " ص ۳۴۔
[3] سید ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ ص ۵۳۔

اپنی عظمت اور علوئے مرتبت کا سکہ جاری کر دیتے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:۔

> " واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان و بیرون ہند کی سیاحت کی،
> اور ممالک اسلامیہ کی قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن
> خاں شروانی جیسا جامع اوصاف اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا
> جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔" [1]

سید صاحب کی اس ہمہ گیری کی بنیاد زمانۂ طالب علمی ہی میں پڑ گئی تھی۔ انھوں نے مختلف النوع ارباب کمال سے حدیث و تفسیر، تاریخ و رجال، منطق و کلام، فقہ و اصول اور شعر و ادب کی تحصیل کی تھی، اور سید صاحب کو ان تمام ہی فنون پر یکساں عبور اور دسترس حاصل تھی اس لئے یہ فیصلہ بہت دشوار ہے کہ ان کے شغف و مہارت کی اصل جولانگاہ کیا تھی۔ جو اہل نظر سید صاحب کی کسی موضوع پر تحقیقات سے زیادہ متاثر ہوا، اس نے اسی کو ان کے فکر و شغف کا خاص الخاص میدان قرار دے دیا۔ چنانچہ مولانا علی میاں نے قرآنیات اور علم کلام کو سید صاحب کا امتیازی مضمون قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید و علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا۔" اور "علم کلام و عقاید پر سید صاحب کی نظر بہت وسیع تھی۔" [2]

یوں تو سید صاحب نے ہر موضوع پر داد تحقیق دی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا اصل ذوق تاریخ تھا۔ سید صاحب نے "یاد رفتگاں" میں ایک جگہ مولانا شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ "یوں تو ان کی کئی حیثیات ہیں مگر ان کا مخصوص فن صرف تاریخ اور علم کلام رہا۔" [3] اس کا بعینہٖ اطلاق خود سید صاحب پر بھی ہوتا ہے۔ ان کی کوئی کتاب اور مقالہ بھی تاریخ یا کلام کے اثر سے خالی نہیں ہے جس طرح علامہ شبلی نے اپنی سوانح عمریوں کو تاریخ سے گلے ملایا ہے۔ اسی طرح سید صاحب نے بھی اپنی سوانحی کتابوں سیرت عائشہ، حیات امام مالک، خیام، رحمت عالم اور حیات شبلی کے دائرہ کو وسیع کر کے تاریخ کے حدود میں داخل کر دیا ہے۔ یہ تمام کتابیں صرف عام سوانح عمریاں نہیں ہیں بلکہ

---

[1] [2] سید ابو الحسن علی ندوی: پرانے چراغ ص ۷، ۵، ۵۸۔

[3] سید سلیمان ندوی: یاد رفتگاں ص ۱۳۔

اپنے اپنے عہد کے رجحانات اور ماقبل کی تاریخ و واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

سیّد صاحب بہت اچھے مقرر و خطیب بھی تھے۔ انھیں تقریر و خطابت پر ۱۹۰۷ء ہی میں پوری قدرت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کی تفصیل سید صاحب کے سوانح حیات میں گزر چکی ہے کہ لکھنؤ کے "رفاہ عام کلب" میں انھوں نے "علوم قدیم و جدید کے موازنہ" کے موضوع پر اردو میں اور "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی" کے موضوع پر عربی میں برجستہ ایسی پرزور تقریر کی کہ پورا جلسہ نعرۂ تحسین و آفریں سے گونج اٹھا، اور علامہ شبلی نے فرط انبساط سے اپنا عمامہ سر سے اتار کر عزیز شاگرد کے سر پر رکھ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے سید صاحب کی خطابت پر اپنے مخصوص انداز میں بہت تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:۔

> "آواز میں اتار چڑھاؤ نہ ہوتا۔ چہرہ پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے۔ ہاتھ پاؤں نہ پھینکتے نہ ٹپکتے۔ کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شور تحسین اٹھے۔ باتیں بڑی واضح کہتے۔ الفاظ و عبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی۔ البتہ کبھی ایک آدھ فقرے رعایت لفظی کے کہہ جاتے مگر یہ رعایت لفظی محض تفریحی نہ ہوتی۔ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا۔ سید صاحب جس بات کو چھپا کر اجاگر کرنا چاہتے یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے وہاں اس طرح کے مناسبات لفظی سے کام لیتے۔ سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی۔"
>
> "سیّد صاحب تقریر میں کہیں اٹکتے نہ تھے ..... ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلمبند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد کے ساتھ دُہراتے جا رہے ہوں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کب ختم ہو گی، کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے ..... ان کی تقریر سے دل نہ اکتاتا تھا۔"[1]

اردو زبان تو سید صاحب کے گھر کی لونڈی ہی تھی، وہ فارسی اور عربی پر بھی

---

[1] رشید احمد صدیقی : ہم نفسان رفتہ ص ۴۵۷۔

کامل عبور اور انگریزی و عبرانی پر دسترس رکھتے تھے۔ عبرانی زبان دکن کالج پونا میں معلمی کے ایام میں ایک یہودی عالم سے سیکھی تھی تاکہ عربی الفاظ کے عبرانی ماخذ پر عبور حاصل ہو جائے۔ ارض القرآن کی تالیف میں ان کو اس سے کافی مدد ملی[1]۔ انگریزی لکھ بول تو نہیں سکتے تھے، لیکن اخبار و کتب کا مطالعہ بآسانی کر لیتے تھے۔ فارسی کی بنیاد ایام صغر سنی ہی میں وطن کے مکتب میں مستحکم ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں مکاتب میں بھی فارسی زبان و ادب پر پورا زور دیا جاتا تھا اور اردو کی تعلیم برائے نام ہی ہوتی تھی۔ فارسی زبان کی اس مضبوط بنیاد کا نتیجہ تھا کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیمات ہو کر آئے تو سید صاحب نے ان کی تشریف آوری کی تقریب مسرت میں ایک فارسی قصیدہ کہا[2]۔ عربی زبان و ادب کی تحصیل انھوں نے بڑی محنت و شغف کے ساتھ کی تھی۔ خوش بختی سے ان کو مولانا فاروق چریاکوٹی کا فیضان صحبت حاصل ہو گیا جو عروض و ادب کے مسلم الثبوت استاذ شمار ہوتے تھے۔ ان کے خرمن کمال سے سیّد صاحب نے جی بھر کر خوشہ چینی کی۔ ان کا یہ ذوق برابر ترقی پذیر رہا۔ یہاں تک کہ جب ندوہ میں علامہ شبلی کی عہد آفریں آمد ہوئی تو سید صاحب نے ان کی صحبت سے استفادہ اور ان کے پاس مصر و شام سے آنے والے عربی اخبارات و رسائل کا بالالتزام مطالعہ کر کے اپنے ذوق مزید جلا دی۔ اور پھر خود سیّد صاحب ہی کے الفاظ میں ان کو "جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی[3]"۔ اس کے بعد سیّد صاحب نے عربی میں مضمون نگاری شروع کر دی۔ اس زمانہ میں مولوی عبدالعلی آسی کی نگرانی اور عبداللہ عمادی کی ادارت میں "البیان" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا جس میں عربی اردو دونوں زبانوں میں مضمون شائع ہوتے تھے۔ سید صاحب نے اس رسالہ میں عربی کے بہت سے مضامین لکھے اور اسی زمانے میں ان کے بعض عربی مضامین علامہ رشید رضا مصری کے شہرۂ آفاق رسالہ "المنار" میں بھی شائع ہوئے۔[4]

سنہ ۱۹۳۲ء میں سیّد صاحب کی سرپرستی اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت

---

[1] ابوظفر ندوی: بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۵۲۔

[2] نجم الہدیٰ: سید صاحب کی یاد میں (مضمون) رسالہ معارف شمارہ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء ص ۳۲۸۔

[3] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۳۴۔ [4] صباح الدین عبدالرحمان: سوانح حیات (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۶۰

میں ندوہ سے ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" کا اجراء عمل میں آیا جس کے پہلے شمارہ کا اداریہ (Leading Article) سید صاحب نے سپرد قلم کیا، اس کے بارے میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، جو عصر حاضر میں عربی زبان کے صاحب طرز انشاء پرداز شمار ہوتے ہیں، رقمطراز ہیں:-

> "یہ ان کی عربی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عربی لکھنے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے اور قلم کے مسافر کو ایک نئی وادی درپیش ہے۔ سید صاحب نے اس مضمون میں ہندوستان میں عربی صحافت کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے اور اس کی ضرورت بھی بیان کی ہے۔ اس مضمون میں کہیں کہیں عبارت کی بے ساختگی، بے تکلف مسجع اور استعارات وتشبیہات کی ندرت، اُن کے پرانے عہد کی یاد تازہ کرتی ہے۔"[1]

سیّد صاحب کی اقلیم جامعیت میں ان کے ذوق شعر و سخن کو بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ آئندہ اوراق میں ایک مستقل باب کے تحت اس پر شرح وبسط کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس لئے یہاں اس کے ذکر سے گریز کیا جاتا ہے۔

(۹)

سیّد صاحب کی پوری زندگی سادگی وقناعت اور استغنا وبے نیازی کا مرقع تھی۔ ایثار وقربانی تاحیات ان کا شعار رہا۔ اپنے علم کو کبھی بالقصد حصول جاہ ومال کا وسیلہ نہیں بنایا۔ زندگی کا بیشتر حصہ محض بقدر کفاف آمدنی میں بسر کیا۔ اور کبھی فراخی وکشادگی نصیب بھی ہوئی تو اس سے دوسرے احباب واعزہ نے فائدہ اٹھایا۔ خود ان کی معاشرت کی سادگی تازیست یکساں برقرار رہی۔ بھوپال میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب پر فائز ہونے کے بعد انھیں ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ ملنے لگا تھا لیکن اس

---

[1] سیّد ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ ص ۲۳۔

فارغ البالی کا بڑا حصہ بعض رشتہ داروں کی شادی انجام دینے اور متعلقین خاص کی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہوا۔ [1]

دار المصنفین کے دوران قیام میں جب ان کے آفتاب فضل و کمال کی شعاعوں نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو منور کیا تو ان کی خدمت میں مختلف جگہوں سے بڑی خطیر تنخواہ پر ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ لیکن سید صاحب نے غایت درجہ شان استغنا کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات (Theology) کی صدارت، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ اسلامیات (Islamic Studies) کی صدر نشینی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی صدارت کے مناصب جلیلہ ان کے پائے استغنا کو جنبش نہ دے سکے۔

ایک بار سید صاحب ایک اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لے گئے۔ وہاں نواب زادہ سر عبدالقیوم خاں نے تمام علماء کو اپنے ہاں مدعو کیا اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی۔ جب وہ سید صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے تو مصافحہ کرتے وقت سو روپے کا نوٹ ان کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس وقت تو سید صاحب خاموش رہے لیکن لکھنؤ پہونچتے ہی اس رقم کو دار العلوم ندوہ کو دیدیا اور اس کی باضابطہ رسید سر عبدالقیوم کے پاس بھجوا دی۔ [2]

سید صاحب نے ماہانہ مشاہرہ کے علاوہ دار المصنفین سے کبھی اور کوئی مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ۱۹۳۵ء میں جب وہ ذات الجنب کے مرض میں کئی مہینے سخت بیمار رہے تو معالجہ کے سلسلہ میں کافی زیر باری ہو گئی ارا کین مجلس انتظامیہ کی رائے ہوئی کہ علاج کے تمام اخراجات ادارہ کی طرف سے ادا کئے جائیں۔ مگر سید صاحب نے اسے گوارا نہیں کیا۔ [3] اسی ایثار و قربانی اور شانِ استغنا کا ثمرہ ہے کہ وہ آسمان علم و شہرت پر علامہ سید سلیمان ندوی بن کر چمکے، اور دار المصنفین علم و تحقیق کا تاج محل بن گیا۔

(۱۰)

سیّد صاحب کی شخصیت جدت و قدامت کا سنگم اور قدیم و جدید دونوں طبقوں کے

---

[1] [2] [3] سید صباح الدین عبدالرحمن: اخلاق و سیرت کے جلوے (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۷۵۔

درمیان حلقۂ اتصال تھی۔ وہ اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار و تصورات، نئے رجحانات اور عصر حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش و تحقیق اور نقد و نظر کے جدید طریقوں کے ماہر تھے، انھوں نے "جام و سنداں" اور "شیشہ و آہن" کو جس طرح یکجا کیا اور جس طرح قدیم ماحول میں رہ کر زمانے کے جدید تقاضوں کو محسوس کیا وہ حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس سے ان کی فطرت کی ارجمندی اور ان کے جوہر کی تابانی پر روشنی پڑتی ہے۔

سیّد صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے ایک ایسے زمانے میں قدیم و جدید دونوں طبقوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ جب ان کے درمیان شدید رقابت تھی، اور کوئی شخص بیک وقت دونوں قلم روؤں سے رسم و راہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن سید صاحب کے علم و اصابت رائے سے دونوں گروہ اپنے حلقہ میں فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ سید صاحب کی تعلیم و تربیت تمام تر روایتی طرز پر اور پرانے استاذوں و بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ ان کے قلب میں بڑی وسعت اور فکر و نظر میں نہایت بلندی تھی، اس کا ایک سبب تو ان کی فطری صلاحیتیں تھیں اور دوسرا اہم سبب ان کے وطن اور خاندان کا ماحول تھا۔ ان کے بیشتر اعزۂ ہم وطن یونیورسٹیوں اور کالجوں میں زیر تعلیم تھے۔ سید صاحب جب تعطیلات میں وطن جاتے تو ان ہی دوستوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر وہ جدید رجحانات اور نئے افکار سے متاثر ہوتے رہے، اور نتیجۃً ان میں روشن دماغی، روشن ضمیری، وسیع النظری اور عالی ظرفی کی صفات پیدا ہوئیں۔

مزید برآں ندوہ میں قیام نے ان میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے بانیوں نے جامعیت کا جو تخیل پیش کیا تھا۔ سید صاحب اس کا عملی نمونہ اور مثالی پیکر تھے۔ وقت کی اس عظیم تعلیمی و اصلاحی تحریک کی کسی قدر تفصیلی تعارف باب اول میں آچکا ہے یہاں صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ ندوہ کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس درسگاہ سے آج کے سائنسی دور میں ایسے علماء تیار ہو کر نکلیں جو پرانے زنگ خوردہ آلات کو ترک کر کے نئے سازوسامان سے لیس ہوں۔ جن کو زمانہ کے تغیر پذیر حالات کا اندازہ ہو اور نئی روشنی سے جو زہر پھیل رہا ہے وہ اس کا تریاق بن سکیں۔ وہ وقت کے تقاضوں سے باخبر ہوں۔ نئی تہذیب و

معاشرت کا اندازہ کریں۔ وہ کتاب و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ فقہائے اسلام کی کاوشوں سے واقف ہوں۔ متکلمین کے کارناموں پر ان کی نظر ہو اور جدید علوم و آداب سے باخبر ہوں، تاکہ قدیم صالح اور جدید نافع کے حسین امتزاج سے وہ اکسیر تیار ہو جو ملت کے امراض کہنہ کو دور کردے اور اس کے تن ناتواں کے اندر روح پھونک دے[1]۔ بلاشبہہ ندوۃ العلماء کی تحریک نے اس طویل مدت میں پر سکون سمندر میں ارتعاش پیدا کرکے اور فضا کے جمود کو توڑ کر وہ خدمات انجام دی ہیں جو تعلیم قدیم و جدید دونوں کے سامنے مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں[2]، اس روشنی میں سید صاحب دراصل ندوہ کا حاصل اور کمائی تھے۔ علامہ شبلی نے ندوۃ العلماء کے اجلاس سنہ ۱۹۱۲ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> "ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا۔ ایک سلیمان پیدا کیا، یہی کافی ہے۔"[3]

عبقری استاذ کا یہ فرمان ایک لائق شاگرد کے لئے مستند ترین اور مایۂ صد افتخار سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید صاحب کی شخصیت پر طبقۂ علماء اور جدید تعلیم یافتہ گروہ دونوں کلی اعتماد کرتے تھے، پھر علماء کے حلقہ میں بھی ہر مسلک و خیال کے لوگوں سے ان کے روابط و مراسم تھے اور ہر مکتب فکر کے علماء میں ان کا وقار و مرتبہ مسلم تھا۔ اس حیثیت سے وہ اپنے استاذ علامہ شبلی سے زیادہ خوش بخت اور بلند مرتبہ تھے۔ کیوں کہ دیوبند، ندوہ اور علی گڑھ تینوں ہی جگہ شبلی کی خاطر خواہ قدر افزائی نہ ہوسکی بلکہ بیشتر وہ ہدف تنقید و ملامت رہے۔ نہ قدیم ان سے مطمئن تھے نہ جدید خوش۔ لیکن سیّد صاحب کی پذیرائی دونوں حلقوں میں یکساں ہوئی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ متضاد افکار و نظریات اور متحارب رجحانات و میلانات کے حامل افراد کا یکساں اعتماد حاصل کر لینا سید صاحب کی عبقریت کی زندہ دلیل ہے۔

---

[1] عبدالسلام قدوائی: ندوۃ العلماء کا تخیل اور پیغام ص ۱۲ (نامی پریس لکھنؤ سنہ ۶۵ء)۔

[2] حبیب الرحمٰن شیروانی: ندوۃ العلماء: اس عہد میں اس کا نام اور پیغام ص ۱۶۔

[3] بحوالہ ماہنامہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۷۰۔

(١١)

سیّد صاحب کی ہمہ گیری کے حدود خارزار سیاست تک وسیع تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ عملی سیاست کے مردِ میداں نہ تھے۔ ان کا اصل ذوق خالص علمی تھا۔ اور ظاہر ہے علمی کام سکون واطمینان خاطر کا طالب ہوتا ہے۔ سیاسی ہنگامہ آرائیاں اس کے لئے سمِّ قاتل کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لئے سید صاحب سیاست کے گرداب میں پھنسنے سے ہمیشہ گریزاں رہے[1]۔ مگر جب پورے ملک میں ان کی تصانیف اور فاضلانہ مضامین کی شہرت وعظمت کا آفتاب نصف النہار پر پہونچ گیا تو جملہ قومی وملی امور کے سلسلے میں ہر خاص وعام کی نگاہیں بجا طور پر ان کی جانب اٹھنے لگیں۔ اور خود سید صاحب کے لئے بھی ملی مسائل کے پیش نظر مسلمانوں کے مسائل سے بے تعلق رہنا مشکل تھا اس لئے چار وناچار ان کو اپنے عہد کی تمام قومی وسیاسی تحریکوں میں حصہ لینا پڑا لیکن محض نظری یا زیادہ سے زیادہ نیم عملی طور پر۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دوسرے خالص سیاسی لیڈروں کی طرح کلیتہً سیاست کے میدان عمل میں نکل کر جدّوجہد کی ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اپنے استاذ علامہ شبلی کی طرح سیّد صاحب بھی میدانِ سیاست میں ازخود کبھی نہیں آئے۔ مسلم سیاست داں ان کو زبردستی زاویۂ علم سے کھینچ کر سیاسی کانفرنسوں کی مسند صدارت کی زینت بناتے اور سیّد صاحب اس میں اپنا بصیرت افروز خطبہ صدارت پڑھتے جس سے قوم کے دلوں میں ان کی مآل اندیشی، اصابت رائے، فراست اور تبحرِ علمی کا گہرا نقش قائم ہوتا۔ انھوں نے بعض وفود میں مسلمانانِ ہند کی ترجمانی کے لئے غیر ممالک کا سفر بھی کیا۔ لیکن جوں ہی اس ہنگامہ خیزی سے فارغ ہوتے فوراً اپنے کنج عافیت میں گوشہ گیر ہو کر علمی نکات کی گتھیا سلجھانے میں منہمک ہو جاتے۔ بس سیاست کے خارزار سے سیّد صاحب کا تعلق اسی حد تک تھا۔ جو ظاہر ہے نظری زیادہ ہے اور عملی کم، سیّد صاحب کی رائیں اور خیالات بلاشبہ بہت گہرے اور دوررس ہوتے تھے۔ جن کو وہ وقتاً فوقتاً وہ معارف کے شذرات میں ظاہر کرتے رہتے تھے۔

---

[1] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان۔ ص ۵۴۶۔

پاکستان کے دوران قیام میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے سانحۂ ارتحال کے بعد جب جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت کا مسئلہ پیش آیا تو ایک گروہ نے سید صاحب سے اس کو قبول کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے فرمایا:۔

> "پالٹیکس بڑی گندی چیز ہے۔ میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود کو خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا کبھی شوکت علی نے، اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا ؎
>
> حافظ ز خود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
> اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا"[1]

اور عملی سیاست سے گریز کا سبب بھی خود ہی بیان کر دیا:۔

> "ڈپلومیسی کے معنیٰ تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانتدار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانتدار مانا جائے۔ اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانتدار سمجھا جائے۔ اور پھر اگر اس کی بد دیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کر لیا جائے"[2]

بس اسی پاکیزگی مشرب کے باعث وہ کبھی عملی سیاست کے کانٹوں میں نہیں الجھے۔ لیکن اس پرہیز و گریز کے باوصف اللہ جل شانہٗ نے ان کی جامعیت کی تکمیل کرنے کی خاطر متعدد بار قوم و ملت کی ترجمانی و رہنمائی کے مواقع ان کو فراہم کئے۔

سید صاحب پرانے قوم پرور تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس احمد آباد کے موقع پر وہ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے[3]۔ اور ایک زمانہ تک اس پر فائز رہے۔ مذکورہ بالا اجلاس کے موقع پر ہی مہاتما گاندھی جیسے زمانہ شناس سیاستداں سیّد صاحب

---

[1] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۶۰۔

[2] " : پاکستان کے تین سال (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۱۴۳۔

[3] شاہ معین الدّین ندوی: حیات سلیمان ص ۲۲۲۔

کی رنگا رنگ شخصیت سے متاثر ہوئے اور انھیں "چاتر مولوی" کا خطاب دیا۔[1] سید صاحب کو کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند تینوں جماعتوں کے سیاسی کاموں سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے زمانے کی ان تینوں ترقی پسند اور قوم پرور جماعتوں کے پلیٹ فارم سے ملک وملت کی جو قابل قدر خدمات انجام دیں ان پر حصہ سوانح میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے یہاں اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

لیکن ان تمام سیاسی مشاغل اور تگ و دو میں سید صاحب کبھی اپنے علمی ذوق وانہماک سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہے۔ وہ لندن و کیمبرج گئے یا مصر و حجاز اور کابل، ہر جگہ سیاسی مصروفیات کے دوش بدوش اپنے فطری و اصلی ذوق کی تسکین کا سامان بھی فراہم کر لیتے تھے۔ چنانچہ قیام لندن کے دوران میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں جہاں اردو کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے، جا کر بار بار اس کو دیکھا۔ اور انڈیا آفس کی اردو کتابوں پر ایک مضمون لکھا جو ماہ جون سنہ ۱۹۲۰ء کے رسالہ معارف میں شائع ہوا۔ "برید فرنگ" کے مکاتیب میں اس لائبریری کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح آخری وفد حجاز کے سلسلہ میں "حجاز کے کتب خانے" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو "معارف" کے کئی نمبروں میں چھپا۔ بلاشبہ یہ سیّد صاحب کا قابل ذکر کمال و اعجاز ہے کہ قعر دریا میں رہ کر بھی مانند گوہر ان کا دامن تر نہ ہو سکا۔ یعنی تمام تر سیاسی تگ و دو کے باوجود وہ کبھی سیاست کی آلائشوں میں مبتلا نہ ہوئے۔ رشید احمد صدیقی نے بہت درست لکھا ہے کہ:۔

> "کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہوا اور سیاست کی آلائش سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہونچنے کے کبھی درپے نہ ہوتے۔ انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی، اس پر اخیر دم تک قائم رہے

---

[1] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۵۸۔

یہ سیّد صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔"[1]

(۱۲)

سیّد صاحب کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ اور ان کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا روحانی وباطنی انقلاب ہے۔ جس نے ان کے ذوق ورجحان اور بعض نظریات وخیالات میں بہت سی دوررس تبدیلیاں پیدا کیں۔ سید صاحب کا مزاج ابتدا ہی سے دینی تھا کسی دور میں بھی دین خالص سے انحراف اور جادۂ مستقیم سے ان کا قدم نہ ہٹ سکا، انھوں نے اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں جتنے علمی کام کئے سب کا محور صرف دین ومذہب کی خدمت تھا۔ سید صاحب کی کتابوں بالخصوص خطبات مدارس، سیرت عائشہ اور حیات امام مالک نے ہزاروں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا۔ اور ان سب سے بڑھ کر ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی ضخیم مجلدات ہیں۔ ان تمام علمی نقوش میں سیّد صاحب کے "خون جگر" کی آمیزش تھی۔

لیکن دنیا کے بکثرت مشاہیر اہل علم وقلم کی طرح عمر کے آخری مرحلہ میں جب کہ ان کا طائر شہرت آسمان کی بیکراں وسعتوں میں محو پرواز تھا۔ انھوں نے بھی اپنے اندر روحانی تشنگی محسوس کی۔ امام غزالیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ علم وشہرت کے بام عروج پر پہونچنے کے بعد ان کو اپنی علمی زندگی اور ذہنی کدوکاوش سُراب نظر آنے لگی اور وہ علم ویقین کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں نکلے تحقیق حق اور انکشاف حقیقت کے شوق میں بیاباں نوردی کی اور بالآخر سیراب وکامران واپس آئے۔ پیہم مجاہدات وریاضات نے قلب میں ایسی صفائی پیدا کردی تھی کہ تمام حجابات

---

[1] رشید احمد صدیقی: ہم نفسان رفتہ ص ۴۰۔ ۱۹۳۵ء کے بعد سیّد صاحب نے سیاست سے تعلق باقی نہیں رکھا تھا، لیکن تقسیم ہند کے زمانے میں جب کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ سیّد صاحب اس گروہ اور فریق کے حامی تھے۔ جو تقسیم کا مخالف تھا۔ وہ اگرچہ کانگریس پر فرقہ پروروں کے غلبہ اور ملک کی اکثریت کی ذہنیت سے بے حد مایوس تھے۔ مگر ان کو تقسیم ہند کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی پوزیشن کا پورا احساس تھا اسی باعث وہ تقسیم کے حامی نہ تھے۔ اپنی نجی مجلسوں میں اکثر کہا کرتے تھے "اگر ہندوستان تقسیم ہوگیا تو یہاں کے مسلمانوں کا کیا انجام ہوگا۔" (حیات سلیمان ص ۵۴۶)

اٹھ گئے۔ اور شکوک و شبہات کا یکسر خاتمہ ہوگیا۔[1] بعینہٖ یہی کیفیت سید صاحب کی ہوئی کہ تمام دنیاوی وجاہتیں اور بلندی مرتبت حاصل کر لینے کے بعد ان کو اس دولت بیدار کی طلب ہوئی جس کو حدیث میں "احسان" اور قرآن میں "تزکیہ" کہا گیا ہے۔

گو سید صاحب نے باضابطہ طور پر سنہ ۱۹۴۰ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانۂ طریقت پر حاضری دی، لیکن تلاشِ شیخ میں اضطراب و خلش اس سے قبل کامل دس سال تک ان کے شب و روز کے سکون خاطر کو زیروزبر کئے رہی۔[2] یہ درحقیقت اس پاکیزہ ماحول اور موروثی فضا کا اثر تھا، جس کے حامل و امین سید صاحب خاندانی طور پر تھے۔ سید صاحب کا خاندان صوفیہ کا مجمع تھا۔ وہ تصوف کی گودوں میں پیدا ہوئے۔ پرورش پائی اور پروان چڑھے۔ ان کے جد امجد حکیم سید محمد شیر عرف حکیم محمدی، والد ماجد حکیم سید ابو الحسن اور برادر اکبر سید ابو حبیب سب بادۂ تصوف و معرفت سے سرشار اور آستانۂ طریقت کے حاضر باشوں میں تھے۔ ان نسبتوں سے اگر سید صاحب نے بھی بالآخر کوچۂ سلوک و تصوّف کا رخ کیا تو اس میں کسی استعجاب و حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن چونکہ سید صاحب کی زندگی کا یہ اہم انقلاب جدید ہندوستان کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ تھا کہ ایک عبقری وقت نے جس کی علمی و تصنیفی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ہو۔ وہ روحانی تشنگی فرو کرنے کے لئے کسی شیخ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہو۔ اس لئے سید صاحب کے عقیدت کیشوں کو ان کے اس اقدام سے بے حد مایوسی ہوئی بلکہ اس واقعہ پر شور و غل سے پورا ماحول گونج اٹھا۔ سیّد صاحب نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا:۔

> "لوگ مجھ کو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں۔ مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں۔ آخر یہ لوگ اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے کہ اگر اُن کے خیال کے مطابق میں واقعی محقق اور علامہ ہوں تو کیا بے وجہ

---

[1] شبلی نعمانی: الغزالی ص ۲۸ (نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۰۲ء)۔

[2] خود کہتے ہیں کہ "کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا۔ لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آئی جو میرے درد کی درمانی کر سکے۔ بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کاش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے (بحوالہ تذکرۂ سلیمان ص ۸۳)

> میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما۔ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ
> میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا۔"[1]

اس باطنی انقلاب نے سید صاحبؒ کے دل و دماغ کی دنیا کو بالکل الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ پھر نہ تو علمی و تعلیمی اداروں سے ان کو دلچسپی باقی رہ گئی اور نہ تصنیف و تالیف سے بلکہ دوسرے اہل علم و قلم میں بھی وہ اسطرح کا انقلاب چاہنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا تھانوی سے بیعت کے بعد سید صاحب نے خود کو اتنا مٹا اور فنا کر دیا تھا کہ اس کی نظیر تصوف کی تاریخ میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ بقول سید حسین "مقام فنا سے گزرنے کے بعد سید صاحب "مُوتوا قبل أن تموتوا" کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔"[2]

بہرحال یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سید صاحب اپنی شخصیت میں سلوک و معرفت کی چاشنی کے اضافہ سے روحانی بلندی اور وصول الی اللہ کی سعادت سے تو ضرور بہرہ ور ہو گئے، لیکن علم و تحقیق کے بارے میں ان کے فکر و نظر میں جو انقلاب عظیم رونما ہوا اور تحریر و تصنیف سے ان کے اندر جو استکراہ پیدا ہو گیا۔ اس سے دنیائے علم و فن کو نقصان عظیم پہونچا، اور مسند علم کو الوداع کہنے کے بعد سید صاحب نے حیات شبلی کے علاوہ (جو ان پر اپنے محسن استاذ کا واجب الادا قرض تھا) کوئی علمی کارنامہ انجام نہیں دیا۔

(۱۳)

عقیدۃً سیّد صاحب کا رجحان ابتدا میں اہل حدیث کی جانب تھا۔ "تراجم علمائے اہل حدیث" مصنّفہ ابو محمد امام یحیٰی خان نوشہروی پر سید صاحب نے جو مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے اس کے درج ذیل اقتباس سے ان کے فقہی مسلک پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے:۔

> "اس میں بعض ایسے علماء حدیث کے حالات بھی شامل ہیں
> جو غلو و افراط سے خالی، توحید و سنت کے متبع اور سلف صالحین

---

[1] اویس ندوی: "آتی جوان کی یاد" (مضمون) ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۵۳۔

[2] سید حسین: حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲۔

کے پیرو ہیں۔ اور حق کو کسی امام خاص میں منحصر نہیں سمجھتے، باقی میں اپنی نسبت کیا کہوں ؎

دوستاں ایں تہمت شیوہ بما نیز کنند

میں سنّت کا پیرو اور توحید خالص کا معتقد ہوں۔ سنت کو دلیل مانتا ہوں اور علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھُلا جانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں کسی ایک میں منحصر نہیں سمجھتا۔ اب آپ اس پر مجھے جو چاہے سمجھ لیں ؎

آزادہ رو ہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے "[1]

شاہ معین الدین احمد ندوی کی رائے ہے کہ سید صاحب عمر کے ابتدائی مراحل سے آگے بڑھ کر فقہیات میں عموماً فقہ حنفی پر عامل رہے مگر اس میں بھی مقلد جامد نہ تھے[2]۔ حقیقت امر یہ ہے کہ سیّد صاحب نے عقاید کے معاملہ میں سلف صالحین کا کامل تتبع کیا ہے لیکن فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی پوری تقلید نہیں کی ہے۔ بلکہ دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے مگر کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو۔ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن قیم، حافظ ابن تیمیہ، اور شاہ ولی اللہ کی تحقیقات پر زیادہ اعتماد کیا ہے[3]۔ غلام محمد نے لکھا ہے کہ "فقہیات میں حضرت والا کا یہی مسلک ابتداء سے آخر تک قائم رہا۔"[4]

سیّد صاحب اپنے طریق تحقیق میں بھی مولانا شبلی کے متبع ہونے کے باوجود ایک حد تک آزادانہ خیال کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے بعض علمی و تاریخی مسائل میں اپنے استاذ سے مؤدبانہ اختلاف رائے کر کے حریت فکر اور آزادانہ تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ درحقیقت اسی

---

[1] سید سلیمان ندوی: مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۴۳ (جید برقی پریس ۱۹۳۸ء)

[2] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۶۷۶۔ [3] سیّد سلیمان ندوی: شذرات بعنوان "رجوع و اعتراف"، معارف جنوری ۱۹۴۳ء ص ۳۔ [4] غلام محمد: تذکرۂ سلیمان ص ۱۴۷۔

وسعت نظر اور اعتدال و توازن کے باعث سیّد صاحب کو ہر طبقہ و جماعت اعتماد حاصل تھا۔

(۱۴)

فن کو شخصیت کا اظہار کہا گیا ہے۔ اس لئے کسی فنکار کی شخصیت اس کے تخلیقی عمل سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ کوئی بھی تخلیق یا تصنیف نہ تو اپنے عہد اور ماحول سے ماوراء ہو سکتی ہے اور نہ تخلیق کار یا مصنف کی شخصیت کے ارتسامات سے خالی۔ جس طرح کسی تصنیف کے آئینہ میں اپنے عہد و ماحول کا عکس نظر آتا ہے اسی طرح اس میں مصنّف کی شخصیت کے خط و خال بھی منعکس ہوتے ہیں۔ اس طرح فن اور شخصیت کا بہت گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے، دونوں ایک دوسرے کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ بسا اوقات شخصیت کے نقوش فن پر اتنے گہرے اور نمایاں ہوتے ہیں کہ اس تصنیف کی روشنی میں مصنف کی شخصیت کی امتیازی صفات کو بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ علامہ سیّد سلیمان ندوی کی پہلودار شخصیت ان کی علمی و ادبی تصنیفات، انتقادات اور اشعار میں نہ صرف مکمل طور پر جلوہ گر ملتی ہے، بلکہ بولتی چالتی اور چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔ گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ سیّد صاحب اپنے علمی تبحر اور فضل و کمال کے ساتھ بے حد بوقلمون، متنوع الصفات اور مختلف الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مؤرخ بھی تھے، اور محقق بھی، متکلم بھی تھے اور فلسفی بھی، فقیہ بھی تھے اور محدّث بھی، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، صوفی بھی تھے اور معلم بھی، نقادّ بھی تھے اور نعت نویس بھی۔ غرض اُن کے قلم کی جولانیوں سے کوئی میدان بھی محروم نہیں رہا۔ ادب و تنقید کا میدان ہو یا تاریخ و سیر کا، سیاسی موضوعات ہوں یا دقیق علمی بحثیں، ہر موضوع پر ہر وقت ان کا اشہب قلم یکساں جولانی دکھاتا تھا۔ اور ان سب تخلیقات کے پس منظر میں سید صاحب کی رنگا رنگ شخصیت قوس و قزح کی طرح نمایاں رہتی ہے، وہ اعتدال و توازن، وہ لینت و مروت، وہ متانت اور وقار، وہ خود رائی سے نفرت، وہ انکسار و تواضع، وہ سادگی و خاکساری، وہ وسیع النظری و عالی ظرفی، وہ احتیاط و دیانت، وہ حق گوئی

وثبات قدمی، وہ خوش طبعی وشگفتہ مزاجی، وہ کثرت مطالعہ اور ذوق جستجو، وہ جذبہ عفو ومسامحت، جو سیدصاحب کی سیرت وکردار کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ ان کے عکس ونقش سے سیّدصاحب کی کوئی بھی تصنیف اور تحریر خالی نہیں ملتی۔ سیرت النبی ہویاخطبات مدارس، حیات شبلی ہویاخیام، عرب وہند کے تعلقات ہویاعربوں کی جہازرانی، سیرت عائشہ ہو یاحیات امام مالک، نقوش سلیمانی ہویا برید فرنگ اوریادرفتگاں، سیّدسلیمان ندوی کی شخصیت کے نقوش ہرجگہ پرتوفگن ملیں گے۔

* * *

باب سوم ۳

ادبی تصانیف

نقوشِ سلیمانی

سید سلیمان ندوی نے اردو زبان اور اس کی تاریخ سے متعلق جو مضامین لکھے اور اردو کی مجالس میں جو خطبے پڑھے تھے۔ ۳۹؁ء کے آخر میں نقوش سلیمانی کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ بقول شاہ معین الدین احمد "یہ اردو زبان کی پوری تاریخ اور گذشتہ چوتھائی صدی میں اردو سے متعلق جو مسائل پیش آئے ان کی پوری سرگذشت ہے"[۱]

عبدالماجد دریابادی نے اس کے بارے میں لکھا ہے :۔

> "کتاب کیا ہے۔ سید صاحب کے کمالات ادبی و تنقیدی کی ایک مہر زدہ دستاویز"[۲]

نقوش سلیمانی تین ابواب میں منقسم ہے۔

(۱) خطبات (۲) مقالات (۳) مقدمات۔

اول الذکر میں وہ خطبے اور تقریریں شامل ہیں جو ہندوستان کی مؤقر اردو کانفرنسوں میں بحیثیت صدر پیش کی گئیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا ۱۹۱۵ء۔

(۲) خطبۂ صدارت ہندوستانی اکیڈمی (پانچویں اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۷؁ء)۔

(۳) خطبۂ صدارت شعبۂ اردو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ ۳۹؁ء۔

(۴) ہندوستان میں ہندوستانی، مقالہ انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۳۳؁ء)۔

(۵) ہماری زبان کا نام (تقریر شعبۂ اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڈھ ۳۷؁ء)۔

---

[۱] شاہ معین الدین ندوی : حیات سلیمان ص ۴۷۵ (معارف پریس اعظم گڈھ ۷۳؁ء)۔

[۲] عبدالماجد دریابادی : "نقوش سلیمانی" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲۔

(۶) ہماری زبان بیسویں صدی میں (نومبر ۳۶؁ء کی ایک ادبی کانفرنس کا صدارتی خطبہ)

ثانی الذکر باب یعنی "مقالات" کے تحت وہ ادبی مضامین درج ہیں جو ۱۹۱۵؁ء سے کتاب کی اشاعت (۳۹؁ء) تک رسالہ "معارف" اور دوسرے معیاری رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اس حصہ میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

(۱)	اکبر کا ظریفانہ کلام	معارف	اگست	۱۶؁ء
(۲)	اردو انسائیکلوپیڈیا	معارف	دسمبر	۱۶؁ء
(۳)	زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ	معارف	ستمبر	۱۷؁ء
(۴)	ہوم لینگویج (ملکی زبان)	معارف	اکتوبر	۱۷؁ء
(۵)	انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ	معارف	جون	۲۰؁ء
(۶)	انجمن اردوئے معلیٰ میں چند سوالوں کا جواب	سہیل علی گڑھ	جنوری	۲۶؁ء
(۷)	ہاشم علی کا مجموعہ مراثی	ہندوستانی	جولائی	۳۱؁ء
(۸)	اردو کیوں کر پیدا ہوئی	معارف	جولائی	۳۳؁ء
(۹)	بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت	ندیم گیا		۳۵؁ء
(۱۰)	سفر گجرات کی چند یادگاریں	معارف	ستمبر	۳۶؁ء
(۱۱)	بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق	ہندوستانی	جولائی	۳۸؁ء
(۱۲)	تمہید	معارف	جولائی	۳۹؁ء
(۱۳)	ہماری زبان			
(۱۴)	جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت	معارف	مارچ	۳۹؁ء

نقوش سلیمانی کے تیسرے حصہ میں یعنی "مقدمات" میں حسب ذیل نو ادبی و شعری کتابوں پر تقریظ و انتقاد کیا گیا ہے۔ یہ تمام مقدمات سید صاحب کے پختہ اور اعلیٰ تنقیدی شعور کے آئینہ دار ہیں۔

(۱) مکاتیب شبلی از علامہ شبلی نعمانی معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۱۷؁ء

(۲) مکاتیب مہدی از مہدی افادی آسی پریس گورکھپور ۳۸ء۔
(۳) گلستان امجد از امجد حیدر آبادی
(۴) کلیات شاد از شاد عظیم آبادی مطبع جامعہ ملیہ علیگڈھ ۱۳۴۱ھ۔
(۵) کلیات عشق از شاہ رکن الدین عشق
(۶) شعلۂ طور از جگر مراد آبادی
(۷) ختستان از اثر صہبائیؔ اقبال برقی پریس سیالکوٹ ۳۳ء۔
(۸) مسدس حالی از مولانا حالی ۱۸۷۹ء۔
(۹) خیاباں از محمود اسرائیلی تاج کمپنی لاہور ۱۹۳۷ء۔

(۲)

نقوش سلیمانی کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۹ء میں مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۴۷۶ صفحات ہے۔ اس میں خطبات، مقالات، اور مقدمات تینوں ابواب شامل ہیں۔ لیکن سید صاحب کے پاکستان میں مقیم ہونے کے بعد اس کتاب کی مقبولیت اور یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں داخل ہونے کے باعث ۱۹۵۱ء میں اس کو کلیم پریس کراچی سے دوبارہ چھپوایا اس بار کتاب کی ترتیب میں یہ تبدیلی کردی کہ ایک جلد میں صرف خطبات اور مقالات کو شائع کیا اور دوسری ایک مستقل جلد میں مقدمات کا وعدہ کیا۔ نہ معلوم یہ جلد شائع ہوئی یا نہیں۔

نقوش سلیمانی طبع ثانی پر سید صاحب نے ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں اس کتاب کی مختلف حیثیتوں سے اہمیت نمایاں کی ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ خود سید صاحب کی نگاہوں میں اپنے ادبی و تنقیدی مقالات کی کیا نوعیت و اہمیت تھی۔

(۱) یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور یہ اشارات سب سے پہلے ۱۹۱۵ء کے اجلاس

اردو کے خطبۂ صدارت میں کئے گئے تھے۔ پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں بھی ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی۔ شروع شروع میں تو اس تاریخی انکشاف کو طعن و تعریض کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر ۱۹۴۷ء میں تاریخ نے خود کو دہرا کر ماضی کی حقیقت حال کے پردے میں لا کر سب کے سامنے پیش کر دی۔ یہاں تک کہ ایک سندھی محقق پیر حسام الدین راشدی نے اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر انجمن ترقی اردو میں پیش کیا اور بعد کو وہ انجمن کے آرگن رسالہ "اردو" میں شائع ہوا۔

(۲) نقوش سلیمانی کی دوسری اہمیت اس میں شامل اس خطبۂ صدارت میں ہے۔ جو ۳۹ء میں کلکتہ میں پڑھا گیا تھا۔ یہ خطبہ موجودہ بنگلہ دیش (سید صاحب نے اس وقت کی صورت حال کے مطابق مشرقی پاکستان لکھا ہے) کے مسلمانوں کے آج بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے انہیں معلوم ہوگا کہ اردو کی اہمیت ان کے لئے کیوں ہے۔ اور انہیں کیوں اسے اپنی قومی زبان بنانا چاہیئے۔

(۳) اس کتاب کی تیسری اہمیت یہ ہے کہ اس کے خطبوں اور مضامین کے آغاز سے آج تک کی اردو کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کا آغاز اور اس کے عہد بعہد کی ترقی اور اس کے مطبوعات اور منشورات کی رفتار اشاعت معلوم ہو سکتی ہے اور اسی نہج پر آئندہ بھی کام ہو سکتا ہے۔

(۴) نقوش سلیمانی کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں اردو کی ضرورت، بقا اور اہمیت کے تمام دلائل، واقعات اور اسباب پوری تشریح سے جمع ہو گئے ہیں۔ اسی طرح مخالفین کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو تمام و کمال دفع کیا گیا ہے۔

(۵) پانچویں چیز یہ ہے کہ ان مضامین میں اردو، ہندی، اور ہندوستانی مباحث کے تمام پچھلے واقعات اور جس جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں متحدہ زبان کے نظریہ کے متعلق تبدیلیاں پیش آتی رہیں۔ ان کی پوری روداد جمع کر دی گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ پچھلے ستر برس کے عرصہ میں ملک کی زبان کا مسئلہ کس کس مرحلہ سے گذرا۔ اور سمجھوتہ کی کیا کیا کوششیں کی گئیں اور ان کا انجام کیا ہوا۔

(۶) اس مجموعہ میں شامل مضامین گو سیاسی نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زبان و ادب کے مسئلہ کو سیاسیات سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس سلسلہ میں مصنف کتاب کی حیثیت پوشیدہ نہیں۔ نقوش سلیمانی کے بعض مضامین مصنف کے خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

سید صاحب نے ان لوگوں کو جو مصالحت کی ہر پیش کش کو ٹھکرا کر سنسکرت آمیز ہندی کو راشٹریہ بھاشا بنانے پر مصر تھے۔ ان خطروں سے برابر ہوشیار کیا ہے جو دو قومی نظریئے کا سبب بنے اور بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے۔

(۳)

سیّد صاحب نے اپنے پہلے خطبہ (اجلاس شعبہ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا ۱۹۱۵ء) میں اردو کی پیدائش کا سبب بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے چونکہ ایک اچھے مؤرخ بھی تھے اس لئے اس خطبہ میں ادب و تاریخ کا حسین سنگم پیدا ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی کا واقعہ ہے اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس حملہ کی ابتدا مسلمانوں کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا۔ جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے بلکہ ایرانیوں کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی تھی۔ اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کی حفظ ماتقدم کے طور پر سندھ پر قبضہ ہے۔ تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر سے گذر کر ہمالہ کے پانچ دریاؤں میں آکر مل گیا۔ یہ اردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہے[۱]۔ اسی خطبہ میں سیّد صاحب نے ہندی اور اردو کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا اور اسکو ایک ناگوار قضیہ بتایا تھا۔ انہوں نے ساٹھ برس پہلے یہ بات کہی تھی کہ اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ میں ایک حریف مقابل سمجھی جاتی ہے۔ پنجاب میں اس کو پنجابی سے مقابلہ ہے، صوبہ متحدہ اور بہار میں ہندی زبان سے، اڑیسہ میں اڑیا زبان اس کی حریف ہے۔ بمبئی میں مرہٹی، سندھی، گجراتی، اور کنڑی چار پہلوانوں سے اس کا معرکہ ہے۔ مدارس میں تامل اور تلیگو سے دوچار ہے۔ سیّد صاحب نے اس سلسلہ میں اردو کو "دلی" کے قلعہ معلیٰ کا پہلوان کہا ہے[۲]،

---

[۱] [۲] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۴-۵، ص ۱۰

یہ پہلوان سب سے معرکہ آرائی میں آج بھی مشغول ہے۔

اس خطبہ کے اٹھارہ برس کے بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں سید صاحب نے ’’ہندوستان میں ہندوستانی‘‘ کے عنوان سے انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک مقالہ پڑھا جس میں ایک بار پھر اردو زبان پر بڑی پُرمغز بحث کی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مقالہ کیا لکھا تھا۔ ادب، تاریخ اور لسانیات کا ایک درس دیا ہے۔ اس میں علم کا عرفان، نظر کی وسعت، فکر کی گہرائی، اور تحقیق کی گیرائی پورے طور پر نظر آتی ہے۔ اس مقالہ کے وزن اور وقار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مسعودی کی مروج الذہب، البیرونی کی کتاب الہند، ابن ندیم کی الفہرست، ابن حوقل اور بشاری مقدسی کے سفرنامے، لطائف اشرفی (مجموعہ ملفوظات مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی) اور امیر خسرو کی غرۃ الکمال وغیرہ کے حوالے ہیں۔

سیّد صاحب لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھا تو اس ملک کی زبانوں کی نیرنگی اور بھاشاؤں کی کثرت دیکھ کر متحیر ہوگئے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے، عرب عربی، ایرانی فارسی، اور ترک ومغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی کا اثر غالب تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کر دی جائے اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی صوبہ کی زبان کو اختیار کر کے اسے پورے ملک پر محیط کر دیا جاتا۔ اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ میں گئے وہاں کی صوبائی زبان اختیار کی ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، اور علمی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں، ہزاروں الفاظ اس ملک کی زبان میں مجبوراً بڑھائے، وہی الفاظ ہندوستان میں رائج ہوگئے۔[1] سیّد صاحب نے ایسے بہت سے الفاظ کی فہرست دے کر ہمارے ذہنونکو ان کی طرف منتقل کیا ہے:۔ مثلاً اللہ، ایمان، روزہ، حج، زکوٰۃ، قاضی، دیوان، تحصیلدار، خزانچی، پیشکار، مالگذاری، روزنامچہ، سیب، خربوزہ، بادام، ناسپاتی، پلاؤ، فیرنی، بریانی، قورمہ، کباب، حلوا، فالودہ، بالوشاہی، قلاقند، چینی، کمخواب،

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۲۶۔

محمل، کامدانی، چکن، پاجامہ، توشک، قالین، بستر، رضائی، دولائی، غلاف، موزے، کمربند، اگالدان، خاصدان، رکابی، پیالہ، صابن، باورچی، رکابدار، خانساماں، قندیل، چلمن، پردے، سنگ مرمر، عقیق، دست بند، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر اور جوشن وغیرہ۔ یہ تمام دخیل الفاظ زندگی کے مختلف شعبوں مذہب، تمدن، معاشرت، سیاست، اور روزمرہ کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں۔ [1]

سید سلیمان ندوی کی تحقیق یہ تھی کہ شروع میں اردو کا نام اردو نہ تھا۔ یہ کہیں دہلوی، کہیں دکھنی، کہیں گوجری، کہیں ہندی و ہندوی اور کہیں قلعۂ معلیٰ کے لحاظ اردوئے معلیٰ کہلائی۔ اس کے ثبوت میں وہ لکھتے ہیں کہ "شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا ترجمہ جس زبان میں کیا اس کو انہوں نے ہندی کہا ہے" [2]

سید صاحب اپنے مضامین میں برابر اس کا اظہار کرتے رہے اور پیش نظر خطبہ میں بھی اس پر زور دیا ہے کہ اردو کا نام اگر ہندوستانی ہو جاتا تو اردو اس ملک کی مشترکہ زبان کی لڑائی جیت لیتی، شروع میں اس تحریک کی شدت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ سید صاحب کا یہ مشورہ عین اردو دوستی، حقیقت پسندی، دوراندیشی، اور مصلحت بینی پر مبنی تھا۔ سید صاحب کی تجویز اس سلسلہ میں یہ تھی کہ:—

> "ہم اس زبان کا نام اُردو جو صرف ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔ یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں اور اس کو شہرت دے کر عام کریں۔ دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے موسوم یا منسوب ہے۔ اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہونچے، احتراز کے قابل ہے اور اس کے بجائے اس کا ہندوستانی نام، ہندوستان اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۳۰، ص ۶۰

> ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ہندوستانی نام انگریزوں کا رکھا ہوا ہے۔ مگر یہ واقعہ نہیں۔ ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا۔ اور مغلوں کے لشکری استیلاء کی تاریخ سے جو لفظ "اُردو" میں چھپی ہے، ہم کو نجات دے گا،،۔[1]

اس رائے میں بلاشبہہ بڑا وزن اور وقار اور بڑی حقیقت پسندی پائی جاتی ہے اسی مقالہ میں سید صاحب نے اردو بولنے والوں کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اردو بول چال اور تحریر و تقریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو الفاظ آکر مل چکے ہیں۔ وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے لفظوں کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اِلّا یہ کہ علمی اصطلاحات اور کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی منگنی مانگنے کی ضرورت پیش آئے[2]۔ اسی طرح ان کا یہ بھی خیال تھا کہ لفظوں کی عربی و فارسی جمع، واوٴ عطف، اور فارسی اضافتوں سے جہاں تک ہوسکے بچا جائے۔ ان کی وجہ ہندوستان جمع اور عطف و اضافت کو رواج دیا جائے۔ ہندی کے جو لفظ ہندوستانی یعنی اردو میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سیکڑوں اچھے اور پیارے لفظ تھے جن کو ٹکسال سے بے سبب باہر کردیا گیا۔[3]

سید صاحب نے ۷۵ صفحات پر مشتمل اس طویل خطبہ میں ان لوگوں کو جو مصالحت کی ہر پیشکش کو ٹھکرا کر سنسکرت آمیز ہندی کو قومی زبان بنانے پر بضد تھے۔ ان

---

[1] [2] [3] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۷۵ - ۷۶، ص ۷۶، ص ۷۶۔

خطرات سے آگاہ و باخبر کیا ہے جو دو قومی نظریے کا سبب بن کر بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے۔ انہوں نے اہل وطن کو ۳۳ء میں ہوشیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہے گا اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا، اتنا ہی اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا۔ جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ وہ موجودہ ہمالہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالہ بنا رہے ہیں جو پہلے ہمالہ سے زیادہ اونچا ہوگا۔ ہمالہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے۔ مگر ہندوستان کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا ہمالہ کھڑا ہو جائے گا جو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گا،،[1]

اس کے بعد کلکتہ اردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء کے خطبہ صدارت کے پھر ان اندیشوں اور خطروں سے آگاہی دیتے ہوئے لکھا کہ:۔

> "میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے مختلف بسنے والے بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہ ہوسکیں ان کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے۔ جس نے تاریخ میں ان کو ہمالہ اور سمندر کی چہار دیواری میں بند اور ان میں چھوت چھات کی پرانی لڑائی ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے۔ اور جس نے تاریخ کے ہر دور میں انکے اندر کے مظلوم فرقوں کو مجبور کیا کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈیں اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بلائیں اور نتیجے میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کرائیں۔ یہ ایک تاریخی نکتہ ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مگر جس کو کسی موقع پر بھولنا نہ چاہیئے۔"[2]

اسی مقالہ میں ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں: آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ سنسکرتی

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۷۴۔
[2] " " " : " " (" دوم) ص ۱۵۸۔

ہندی ہی ہماری اصلی بولی ہونی چاہیئے۔ دیس کے اتحاد کو اور ایکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے[1] ،، اور پھر بہت ہی صاف اور روشن لفظوں میں ہشیار کرتے ہوئے لکھا کہ :۔

> ”ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہیکہ ہندوستانی اردو یا اس کو آسان ہندی کہہ لیجیئے، ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور خالص ہندی کی وہ حیثیت ہے جو مسلمان کی فارسی کی ہے۔ اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے۔ اگر ہم اس تصفیئے پر ایک ہو جائیں تو ہماری سب مشکلیں دور ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف ہندی کو بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہوا ہے۔ اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے قومی تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہونچ سکتا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے گا ،،[2]

اور سب سے آخر میں سید صاحب نے آخری تنبیہ ان لفظوں میں کی کہ ”ہندو مسلمان دونوں تنگ دلی اور جھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں اور اس کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے ،،[3]

مگر یہ سب تدبیریں اور سید صاحب کی خطرات سے آگاہی سب رائیگاں گئیں اور ہوا وہی جو کاتب ازل نے روز اوّل مقدر کر دیا تھا۔ اور اردو ہندی کا جو قضیہ ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا تھا ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کی صورت میں منتج ہوا۔

۳۷ء میں سید صاحب نے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی پانچویں اردو کانفرنس کی صدارت لکھنؤ میں کی اس میں انہوں نے جو فاضلانہ خطبۂ صدارت پیش کیا اس میں لکھنؤ میں اردو زبان و ادب کی جو سرگرمیاں شروع سے ہوتی رہیں۔ اس کا جائزہ

---

[1] [2] [3] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۷۰۔

اس عالمانہ اور محققانہ انداز سے لیا ہے کہ وہ اس شہر کی پوری علمی و ادبی تاریخ کا جیتا جاگتا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، یہ خطبہ سید صاحب کی تحریر کے ایجاز کے آرٹ کا بڑا عمدہ نمونہ ہے، اس کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے تاریخ اور ادب دونوں کا لطف ملتا ہے، اس خطبہ میں اردو کے مشاہیر (جن کی وفات اسی سال ہوئی تھی) کا ماتم، چمن زار لکھنؤ کی علمی خدمات، وہاں کی پرانی ادبی مجلسوں، لسانی خدمات بھولے بسرے مطابع، اخبارات اور اشخاص کا ذکر قلم کی شگفتگی بلکہ وارفتگی کے ساتھ کیا ہے منشی پریم چند کے ادبی اوصاف کا ذکر جس اختصار و جامعیت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ بہت سی طویل تحریروں پر بھاری ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

> "وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ اور درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی۔ ان کا قلم ہمارے پرانے کیریکٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا،،[1]

لکھنؤ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> "دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا موسم آیا۔ اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے۔ جنہوں نے اُڑ اُڑ کر اس چمن پر بسیرا لیا ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا،،[2]

لکھنؤ کی لسانی خدمات کو سید صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے۔ ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک[3] نے صحیح و غلط اور

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۷۸، ۷۹ [3] صحیح نام میر علی اوسط ہے یہاں سید صاحب سے تسامح ہوا ہے۔

سب لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر و انشاء کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لئے سند پیدا کی۔ لکھنؤ میں یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا۔ جس کا نام نفیس اللغۃ ہے۔ سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا۔ شیخ امداد علی بحر کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔ حکیم ضامن علی جلال نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے مالا مال کیا ہے۔ سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعراء، مجمع اللغات، گلشنِ فیض، اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں ،، ۱؎

(۴)

سید صاحب کو فن لغت اور اشتقاق الفاظ سے خصوصی مناسبت تھی۔ اس موضوع پر جب ان کا اشہب قلم جولانی دکھاتا تو تحقیق کا سمندر متلاطم ہوتا نظر آتا ہے اور پھر اپنے شگفتہ و دلچسپ اور اچھوتے انداز بیان سے وہ اس خشک موضوع کو بھی دلچسپ بنا دیتے تھے عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے :-

> "سید صاحب نے یقیناً فیلالوجی (لسانیات) پر اپنی کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی لیکن نقوش سلیمانی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فن لغت اور اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی اس میدان میں وہ اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے تھے کن کن آسمانوں سے تارے توڑ کر لایا کرتے تھے۔ اور خشک لغوی تحقیق کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھ دیتے تھے ،، ۲؎

ماجد صاحب کا یہ تبصرہ نقوش سلیمانی کے ایک مقالہ "بعض پرانے لفظوں کی نئی

۱؎ نقوش سلیمانی ص ۸۰ - ۸۱

۲؎ عبدالماجد دریابادی : نقوش سلیمانی (مضمون) رسالہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۴

تحقیق کے بارے میں ہے۔ سید صاحب نے یہ مقالہ ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد کی ادبی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا تھا۔ جس میں دام، اشرفی، کرانت، بیمہ، ڈاک، قمری، سوسی، فیرنی، رقم، ہندسہ، ریاضیات، سیاست وغیرہ بارہ الفاظ کی لغوی تحقیق اور تسمیہ سے بحث کی ہے اس کے بعد ۳۹ء کے معارف میں شائع کرتے وقت اس میں مزید اضافہ کیا، اور ناشتہ، نہار، فلسفہ، قاب، رکابی، قلیہ، قورمہ شوربا، شراب، کباب، قالین، شاگرد پیشہ، راج (معمار)، مستری، خراد، ساہول، گنیا، جہاز، جہیز، تجہیز، سرخی، (عنوان)، سل، نستعلیق، چلبلا، کفش، مادری، قلعی، اور تماشہ ۲۷ الفاظ کے اشتقاق اور تسمیہ کی موشگافیاں کی ہیں۔ اس طرح کل ۳۹ پرانے الفاظ پر بحث کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس مقالہ کی ابتداء وہ اس طرح کرتے ہیں :۔

> "ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فال نیک بن سکے"[1]

اس تمہید کے بعد وہ لفظ "دام" کی تحقیق میں یوں گوہر فشاں ہوتے ہیں :۔

> "ہماری زبان کا ایک پامال لفظ "دام" ہے۔ ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں اور دوسرے معنی ایک معمولی سکے کے ہیں، جسکی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے۔ جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے۔ اس لفظ کی تاریخ کے لئے ہم کو دوہزار برس پہلے لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشور کشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے۔ یونان کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکے کا نام درخم تھا۔ اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کر درم کی صُورت اختیار کی اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرا کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھا کر دام

---

[1] نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۲۹۰۔

ہوگیا۔ یہ لفظ جس طرح سکے کو بتاتا تھا اس کے وزن کو بھی بتاتا تھا۔ چنانچہ عربی طب میں دواؤں کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے۔ اس لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہوگیا۔ جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجوں، دواخانوں ورشفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے اور اب شاید کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ صرف آب وہوا، لہجہ اور صورت کا فرق ہوگیا ہے۔

اکبر کے زمانے میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکے کے بجائے تانبہ کے سکے کا نام تھا اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے۔ اور اب بھی کہتے ہیں یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا۔ پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے اب اس کو گنڈا کہتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں بھی اس کا نام ملتا ہے۔ اس تقسیم سے پورب کی زبان میں ایک محاورہ اور چلا ہے۔ ہر گاؤں یا ہر زمین دار کی حیثیت ۱۶ر فرض کی جاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں۔ ایک دام کا آدھا دھیلا اور $\frac{1}{4}$ پاؤلہ، $\frac{1}{8}$ دمڑی کہلاتا ہے۔ یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس درم (پیسے) تیار ہوتے تھے،،[1]

صرف ایک لفظ "دام" کی تحقیق میں سید صاحب نے کتنے مبسوط طریقہ سے ادب وانشار، تاریخ اور معاشیات کا اجتماع کردیا ہے۔ تمام ۳۹ الفاظ اسی انداز پر تحقیق کا موضوع بنے ہیں۔ لفظ "ڈاکٹ" کے بعد "قمری" کی لغوی تحقیق کرنی تھی۔ ان دونوں لفظوں میں ربط پیدا کرنے میں وہ ابداع ذہنی اور حاضر دماغی کا بہترین ثبوت دیتے ہیں:۔

---

[1] نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۲۹۰ - ۲۹۱۔

> "اگلے زمانے میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ملتے جلتے پرندہ کی نسبت بھی سن لیجیے"[1]

اسی طرح لفظ "شراب" کی تحقیق تسمیہ ملاحظہ فرمائیں :—

> عربی "شرب" (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا اور اسے ہندوستانیوں نے قبول کر لیا۔ شراب کے معنی عربی میں ہیں "جو چیز پی جائے" یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے۔ ایرانیوں نے جس کو شراب کہا اس سے متوالی شراب مراد لی۔ اس سے یورپی زبانوں میں "سیرپ" تیار ہوا جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا۔ لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت کا نام دیا۔ لفظ عربی ہے اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں"[2]

سیّد صاحب کی ان لغوی تحقیقات اور لفظی اشتقاقات سے کلی اتفاق ضروری نہیں ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ سے مضمون نگار کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ تبحرِ علمی اور فن لغت پر عبور، پھر ادب وانشا پر جس غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے، سیّد صاحب کے مذکورہ بالا مقالہ کی "معارف" میں اشاعت کے بعد ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے اس کے بعض حصّوں پر نقد کیا تھا جس کو سیّد صاحب نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ نہ صرف "معارف" میں شائع کر دیا بلکہ لفظ "شوربا" اور "مستری" کے سلسلہ میں اپنی تحقیق سے رجوع بھی کر لیا جو انکی عالی ظرفی کی بیّن دلیل ہے۔

(۵)

نقوش سلیمانی کا ایک اہم اور فاضلانہ مقالہ "تہنید" ہے۔ جس میں سید صاحب نے

---

[1] [2] نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۳۰۲ - ۳۱۶ - ۳۱۷ -

اردو کو عربی و فارسی کی ماتحتی سے نکال کر اس کی خود مختاری اور ایک مستقل بالذات حیثیت کی سرگرم وکالت کی ہے۔ جو بظاہر ایک خلاف توقع بات ہے۔ کیونکہ سیّد صاحب اصلاً عربی علوم متداولہ کے فاضل اور ایک عالم دین تھے۔ اس لئے طبعاً اردو پر عربی کی حاکمیت ان کے لئے باعث طمانیت و سرور ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے عربوں کی "تعریب" اور فارسیوں کی "تفریس" کی طرح اہل ہند کو "تہنید" کا پورا حق دلایا۔ لکھتے ہیں:-

> "تہنید کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو ہندیانا کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے چلی۔ وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خراد کر کے اس کو عربی بنا ڈالتے ہیں تو اپنے اس عمل کو تعریب کہتے ہیں۔ یہی قاعدہ فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اس کو "تفریس" کہا یعنی فارسی بنا لینا اب جب اہل ہند یہی کریں یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملا لیں تو اس کو تہنید کہیں گے"[1]

سیّد صاحب آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ: "یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور اور پھیلنے کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ یہ اصول دنیا کی قریب قریب سب ہی زبانوں میں چلتا ہے۔ اور اس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں کہ زبان ترقی کر سکے"[2] آج تو یہ ایک عام سی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ مرور ایام نے حالات و خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ لیکن جس زمانہ میں (جون ۳۹ء) سیّد صاحب کا یہ مضمون "معارف" میں شائع ہوا قدیم خیال کے اہلِ قلم کی طرف سے اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی۔ وہ اس پر مصر تھے کہ عربی و فارسی کے قاعدے اردو میں بھی چلائے جائیں۔[3]

---

[1] [2] نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۳۲۹، ۳۲۹۔

[3] عبدالماجد دریابادی: نقوش سلیمانی (مضمون) رسالہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۹۔

لیکن اس سلسلہ میں سید صاحب کا سیدھا سادا، صاف اور دلنشیں استدلال یہ تھا کہ:۔

> "ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ واحساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے۔ ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے مگر وہ ہماری ہندی کے حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا۔ وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نہ نکالے گا۔ اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا۔
>
> یہی حال ہندیوں کا ہے، عربی کے خاص حروف وہ ادا نہیں کرسکتے۔ "ع" اور "الف" میں، "ث" اور "ص" اور "س" میں، اور "ت"، "ط" میں وہ فرق نہیں کرسکتے۔ اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے ہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بے گانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بن جائے گا۔ وہ ہمارے دیس میں نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں۔ وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل وصورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں،، [۱]

بیس صفحات پر مشتمل اس مقالہ میں سید صاحب نے پچاسوں عربی لفظوں کی مثالیں دیکر دکھایا ہے کہ عربی میں ان کے معنی کچھ تھے اردو میں آکر کچھ ہوگئے زبان کا تلفظ عربی سے اردو ہوگیا یا ان کے واحد جمع بنانے میں اردو قاعدوں پر عمل ہوا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:۔

> "معمار کے معنی راج، کی اصل عربی اور فارسی میں راز ہے مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا۔ عربی کا صحیح لفظ تمنی ہے

---

[۱] نقوش سلیمانی۔ ص ۳۳۰۔

مگر فارس والوں نے اسے لیا تو تمنّا کر لیا اور ہم نے بھی اسی کو قبول کر لیا، عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا۔ لالٹین کی اصل لینٹرن ہے۔ مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے۔ بٹن انگریزی ہو تو ہو۔ مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے جو بٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے کہ اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادل کی کوشش زبردستی ہے[۱]۔"

اس مضمون میں اور آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"جناب کے معنی چوکھٹ کے ہیں، بادشاہوں سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوا جاتا تھا۔ اس لئے اس کے آستانے اور چوکھٹ کی طرف نسبت کر کے بات کہی جاتی تھی۔ اس سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہو گیا۔

حضرت بھی بڑے حضرت ہیں۔ حضرت کے اصل معنی حاضر ہونے کے ہیں۔ اس سے حضرت کے معنی عربی میں بادشاہ کے حضور اور پیشگاہ کے ہوئے۔ ہمارے ہندوستان میں اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہو گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مغلوں کے زمانے میں بنا۔ اس سے پہلے بندگی اور خدمت کے لفظ تھے۔ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔"[۲]

نقوشِ سلیمانی میں شامل ایک اہم مقالہ "اکبر کا ظریفانہ کلام" بھی ہے۔

زہد و اتقا اور سنجیدگی و متانت سید صاحب کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ لیکن با ایں ہمہ انہوں نے اکبر الہ آبادی جیسے پیکرِ شوخی و ظرافت کے ظریفانہ کلام پر معارف میں بڑا پر مغز اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ اکبر علامہ شبلی کے معاصر

---

[۱] [۲] سید سلیمان ندوی: نقوشِ سلیمانی (طبع اول) ص ۳۳۱، ۳۳۸۔

اور ان کے دوستوں میں تھے اور اسی نسبت سے سید سلیمان ندوی سے بھی خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ جس پر وہ خطوط شاہد ہیں جو اکبر نے کثیر تعداد میں سید صاحب کو لکھے ہیں، خطوط اکبر کا یہ نادر خزانہ کتب خانہ دارالمصنفین میں محفوظ ہے۔ سید صاحب اکبر الہ آبادی کی مقصدی شاعری سے بہت متاثر تھے اور باصرار فرمائش کر کے اکبر سے ان کا منتخب کلام طلب کرتے اور "معارف" میں بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ جب کلیات اکبر پہلی بار طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئی اور سید صاحب کے ملاحظہ سے گذری تو انہوں نے دلی تقاضے سے مجبور ہو کر اگست ۱۹۱۶ء کے معارف میں "اکبر کا ظریفانہ کلام" کے عنوان سے اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا۔ جو سید صاحب کے حسن ادب وانشاء اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا شاہکار ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے دقت نظر کے ساتھ اکبر کی ظریفانہ شاعری کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ نیز حسن انتخاب کے ساتھ اصل کلام سے اپنے بیانات کو مدلل ومزین کیا ہے۔ جب یہ تبصرہ اکبر کی نظر سے گذرا تو انہوں نے ایک خط میں اس پر اظہار سپاس کرتے ہوئے سید صاحب کو لکھا کہ :۔

> "آپ کے طرز سخن سے جو آگاہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے میرے ناچیز کلام کی نسبت جو بعض ریمارک کئے ہیں وہ میرے لئے باعث فخر ہیں .... میری خرافات نے مجلس علماء وفقہاء سے داد پائی۔ اس کو اپنی خرافات کا ارتقا سمجھتا ہوں"[1]

اب ذیل میں اکبر کے کلام پر سید صاحب کے ریویو کے چند اہم اقتباسات پیش خدمت ہیں :۔

> "میر صاحب کا اصلی مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام پُر معنی اور سنجیدہ ظرافت ہے۔ ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست ر قومیات جس موضوع پر کچھ کہنا ہوتا ہے۔ اس کا مغز سخن

---

[1] خطوط اکبر بنام سید سلیمان ندوی (ذخیرہ محفوظ نوادر کتب خانہ دارالمصنفین)

خواہ کچھ ہو۔ لیکن اس کا قشر بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے۔ ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خاں کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مقصد صرف تفریح طبع اور دل بہلانا تھا۔ ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے۔ اس کا مقصد بھی محض تفنن طبع تھا۔ اور لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے۔ جان صاحب کا ظریفانہ رنگ گو زنانہ لہجہ میں آکر بدنما ہو گیا تھا۔ تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریح طبع پر تھی۔ میر اکبر حسین کا احسان ہے کہ انہوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشار کی بولی میں اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل اور اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے۔ سید انشار کے زمانے کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی۔ وہ اسی شیرے اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے۔ اب انگریزی سرکاری زبان ہے۔ میر صاحب اس بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں،،

اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں کہ "میر اکبر حسین اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں۔ جس کو یوں پینا اس جدید دور لطافت میں ناممکن تھا۔ میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام امرار، حکام، مدعیان رہبری عام اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں۔ اور انکی چتون پر میل تک نہیں آتا،،[1]

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۱۶۵-۶۶۔

پھر اس کے چند صفحوں کے بعد رقمطراز ہیں۔ "جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک مجمع میں دیکھنے کے مشتاق ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے گویا وہ تعلیم سے عاری ہے میر صاحب اس دعوے کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی ٭ اب وہ شمع بزم ہے، پہلے چراغِ خانہ تھی

"شمعِ بزم" اور "چراغِ خانہ" کی تشریح سن کر عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا نہ ہو جائیں،،[1]

سیّد صاحب کی سطور بالا میں وزن بھی ہے، وقار بھی اور ادب و انشاء کی چاشنی بھی ہے۔ محض الفاظ کی بازی گری نہیں ہے۔ سیّد صاحب نے اس تنقید کے سلسلہ میں ویسے ہی ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں جیسے علاّمہ شبلی کرتے تھے۔ مثلاً

(۱) رعایت لفظی یا ضلع جگت۔

(۲) جدت قافیہ۔

(۳) دعوائے مخاطب کی تشریح۔

(۴) ایہام۔

(۵) قدیم شعراء کے خیالات کو دوسرے پیرائے میں ادا کرنا۔

(۶) جدید محاورات۔

(۷) جدّت تشبیہہ و استعارات۔

پروفیسر عبدالشکور نے لکھا ہے کہ عنوانات قائم کر کے تنقیدی مضمون لکھنا شبلی دبستان تنقید کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔ اور سیّد صاحب نے بھی اسی اصول پر عمل کیا ہے۔[2]

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۱۷۱۔

[2] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۱۸ (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ)۔

(۶)

سطور بالا میں ذکر آچکا ہے کہ نقوش سلیمانی وہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو زبان کے مولد کی تعیین و تشخیص کے سلسلہ میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سیّد سلیمان ندوی کو اپنی اس نئی تحقیق و دریافت پر اس عہد میں کافی تنقید و نکتہ چینی بلکہ طعن و طنز تک کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ مگر مرورِ وقت نے ایک عرصہ کو بعد بہت سے ماہرین لسانیات کو سیّد صاحب کے نظریہ سے اگر متفق نہیں تو کم از کم اس پر غور و فکر کے لئے ٹھہرنے پر مجبور ضرور کر دیا۔

اردو زبان کے مولد و منشا کا مسئلہ محققین اور ماہرین لسانیات کے درمیان ہمیشہ نہایت متنازعہ فیہ رہا ہے۔ ابتدا میں تو اس اختلاف آرار کی بنیاد علمی نظریوں پر استوار تھی۔ لیکن پھر بدقسمتی سے اس میں مقامی و صوبائی تعصّب کو راہ مل گئی۔ اور ہندوستان کے ہر خطہ کے ماہرین لسانیات نے اردو کے خمیر کو ایک خاص علاقہ سے ثابت کرنے کے لئے داخلی و خارجی شواہد کا انبار لگا دیا ہے ان متضاد اور باہم معارض بیانات سے جہاں ایک خالص علمی مسئلہ میں انتشار ذہنی اور عدم توازن پیدا ہوا۔ وہیں اس شر میں خیر کا پہلو یہ پیدا ہوا کہ اس کے نتیجہ میں بعض اہم اور گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ جن سے اردو کے علمی و لسانی سرمایہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہوا۔ اردو کے آغاز و ارتقار کے موضوع پر یوروپین ماہرین لسانیات نے بھی کافی دادِ تحقیق دی ہے جن میں جان بیمز کی ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، جیولز بلاک کی مرہٹی زبان، گریرسن کی ہندوستانی زبانوں کا لسانی جائزہ، دھٹنے کی لسان و مطالعہ لسان اور میکس مولر کی سائنس آف دی لینگویجز وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ ان محققین نے ہماری زبان کی بلاشبہہ بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اسی طرح ہندوستانی محققین میں پروفیسر محمود شیرانی، سید نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر محی الدین قادری زور، برجموہن دتاتریہ کیفی، سونیتی کمار چڑجی، سدھیشور ورما، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ہندوستانی لسانیات پر بڑی

محققانہ کتابیں تالیف کی ہیں۔ جن میں اردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما پر بھی خصوصیت کے ساتھ نہایت مبسوط بحثیں کی ہیں۔ ذیل میں ہم ان تمام لسانی نظریوں کے اجمالی تذکرہ کے بعد سید صاحب کے مخصوص نظریہ پر بحث کریں گے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ سید صاحب نے سندھ کو اردو کی جنم بھومی قرار دیتے ہوئے جو بنیادیں فراہم کی ہیں وہ کس حد تک سنجیدہ غور و فکر کی مستحق ہیں۔

ایک عرصہ دراز تک یہ غلط فہمی عام رہی کہ "مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی و فارسی کے الفاظ داخل ہونے لگے۔ جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کرلی"[1] میر امن، سرسید، امام بخش صہبائی، محمد حسین آزاد، عبدالغفور نساخ اور نصیر الدین ہاشمی سب نے برج بھاشا سے اردو کے خمیر کو اٹھایا ہے۔

اسی طرح تمام مسلمان اہل علم نے اردو کا سنگِ بنیاد دہلی میں رکھنے کے ساتھ اس کا نشو و نما غوریوں کے عہد میں دکھایا اور شاہجہاں کے عہد میں پروان چڑھتا ہے[2]۔ حافظ محمود شیرانی پہلے محقق ہیں۔ جنہوں نے پہلی بار اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "پنجاب میں اردو" (طبع اول سنہ ۱۹۲۸ء) کے ذریعہ اس روایتی مزعومہ کی حقیقت کو بے نقاب کیا اور تقابلی لسانیات کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ اردو برج بھاشا سے نہیں نکلی۔ بلکہ وہ پنجابی کی بیٹی ہے۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی باہمی مشابہت اس کا بین ثبوت ہے[3]۔ پروفیسر شیرانی نے پنجاب کو اردو کا مولد قرار دینے کے علاوہ اس کی مزید قدامت بھی ثابت کی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے آغاز کو مغلوں یا خلجیوں سے پیچھے ہٹا کر غزنویوں کے عہد تک لے گئے ہیں۔

پروفیسر محی الدین قادری زورؔ نے "ہندوستانی لسانیات" (طبع اول سنہ ۱۹۳۲ء)

---

[1] حکیم شمس اللہ قادری : تاریخ زبان اردو (یعنی اردوئے قدیم) اشاعت دوم ص ۱۷، (نولکشور لکھنؤ سنہ ۳۰ء)۔

[2] شوکت سبزواری : داستان زبان اردو ص ۳۸ (انجمن پریس کراچی سنہ ۶۰ء)۔

[3] محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ص ۳ (کریمی پریس لاہور سنہ ۲۸ء)۔

میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ مدلل طور پر شیرانی کے نظریہ کی تائید کی ہے۔ اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ان دونوں تحقیقات کے بعد ماہرین لسانیات کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اردو کے سرزمین پنجاب میں پیدا ہونے اور لسانی نشو و نما حاصل کرنے کا نظریہ مستحکم اور مسلّم الثبوت بن گیا[1]۔ یہ رائے صرف اس حد تک درست ہے کہ شیرانی اور زورؔ کی فاضلانہ کتابوں کے بعد اردو اور پنجابی کے قریبی تعلق پر سنجیدگی کیساتھ غور کیا جانے لگا۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں سید احتشام حسین نے جان بیمز کی کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے اردو ترجمہ پر مبسوط اور سیر حاصل مقدمہ لکھتے وقت اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے[2]۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" (جو غالباً پہلی بار ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی) میں اردو کا سرشتہ ہریانی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا[3]۔ زورؔ نے مسعود صاحب کے اس نظریہ پر شدید تنقید کی ہے کیونکہ اس کی روشنی میں شیرانی اور زورؔ دونوں کی تحقیقات پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔

پروفیسر اختر اورینوی اردوئے قدیم، اردوئے وسطیٰ اور معیاری اردو کے تین لسانی دور قائم کر کے اردو زبان کو بھاشا اور فارسی و عربی کے میل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ان کی رائے ہے کہ پروفیسر شیرانی نے بھی اپنی کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اردو کا معیاری سانچہ پنجابی سے لیا گیا ہے۔ پروفیسر اورینوی اس پر مصر ہیں کہ ماہرین لسانیات کی اکثریت آج بھی کھڑی بولی کو اردو کا معیاری سانچہ تصور کرتی ہے۔[4]

---

[1] محی الدین قادری: اردو کی ابتدا (مضمون) شمولہ اردوئے معلیٰ (دہلی یونیورسٹی میگزین) ج ۳ ش ۴۔

[2] احتشام حسین: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (مقدمہ) ص ۵۳ (بار اول) ۱۹۴۸ء۔

[3] مسعود حسین خاں: مقدمہ تاریخ زبان اردو (طبع چہارم) ص ۱۳ ۱۹۷۰ء۔

[4] اختر اورینوی: قدر و نظر ص ۱۹ (سرفراز پریس لکھنؤ)۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "اردو زبان کا ارتقا" تصنیف کی اور پالی زبان سے اردو کے تعلق کا ایک جدید لسانی نظریہ پیش کیا وہ لکھتے ہیں کہ پالی اور اردو کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفہ کی زبان ہے۔ اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی، پالی ادبی درجہ کو پاکر ٹھہر گئی۔ لیکن ہندوستانی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور اور پھلتی پھلاتی رہی۔ [۱]

لیکن تعجب ہے کہ سبزواری نے اپنی ایک دوسری تصنیف میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اردو جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا اردو اس کی فطری ترقی یافتہ صورتیں ہیں،، [۲]

ان تمام تحقیقات اور لسانی نظریوں کے ہجوم میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اردو کے ہیولیٰ کے وادی سندھ میں تیار ہونے کا ذکر کرکے ماہرین لسانیات کو چونکا دیا۔ شوکت سبزواری کے علاوہ تمام اہل علم نے ہندوستان میں اردو کے آغاز کو مسلمانوں کی آمد کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اسی بنیاد پر سید صاحب کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ چونکہ مسلمانوں کا قدم سب سے پہلے سندھ میں پڑے تھے اس لئے طبعی طور پر سندھی زبان کو اردو کی اصل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے سنہ ۱۹۱۵ء میں شعبہ ترقی اردو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس پونا کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے پہلی بار اردو اور سندھی کے خاندانی تعلق کی طرف ابتدائی اشارے کئے تھے۔ پھر سنہ ۱۹۳۳ء میں انجمن اردوئے معلیٰ علی گڈھ میں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھتے ہوئے اپنے اس نظریئے کو بڑے مدلل اور نہایت مبسوط طریقہ پر پیش کیا

---

[۱] شوکت سبزواری: اردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۶ (سو دلیتھو پریس دہلی)۔

[۲] شوکت سبزواری: داستان زبان اردو ص ۴ (انجمن پریس کراچی سنہ ۶۰ء)۔

انہوں نے وادی سندھ کو اردو زبان کا پہلا گہوارہ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہونچے ہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ عرب و فارسی بولنے والے مسلمان عراق، بندر ابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر، سندھ کے بندروں سے گذر کر بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے۔ پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا۔ یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی و عربی بولتے تھے۔ جہاز رانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی۔ خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی۔ خصوصاً جب ۱۳۲ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا اور سندھ کے پنڈت بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے لگے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصبوں پر سرفراز ہونے لگے،، [۱]

سیّد صاحب اپنی اس رائے کو ٹھوس تاریخی و لسانی شہادتوں سے مدلل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "اس زمانہ میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے۔ مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ ہے۔ پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے۔ جہاز کے خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) عود قماری (راس قماری کا عود) وغیرہ لفظ ہیں۔

دواؤں میں سب سے عجیب نام "بہط" معلوم ہوتا ہے جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا۔ مفاتیح العلوم میں نقل کیا ہے۔ جو ہمارے بھات کی خرابی ہے جو مریضوں کی غذا تجویز کی گئی ہے۔ پھلوں میں انبج (آم) اور لیموں ہیں،، [۲]

سیّد صاحب تاریخ کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے اپنے دعوے پر بکثرت تاریخی شواہد کا انبار لگا دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کی ریاستیں

---

[۱] [۲] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۳۱، ۳۱۔

تین سو برس تک قائم رہیں اور آخر سلطان محمود (المتوفی ۴۲۱ھ) کے ہاتھوں ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ ہوا۔ ان ریاستوں کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا۔ اور خراسان، عراق یمن، ایران اور مصر سے یہاں آنے والے تاجروں اور مسافروں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ سندھ اور ملتان میں دیسی بولیوں کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہے اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولیٰ تیار ہو،،[1]

خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بزرگ بن شہریار ملاح جو ۳۰۰ھ میں بحر ہند کے سواحل سے گذرتا رہتا تھا اس نے اپنے بحری سفرنامہ میں، جس کا نام عجائب الہند ہے، کئی ہندی لفظ استعمال کئے ہیں، وہ ۲۷۰ھ کا ایک اہم قصہ ہم کو سناتا ہے۔ شہر اُلور واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اس کو اس کی زبان میں اسلام کی خوبیاں بتا سکے۔ بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیاں جانتا تھا۔ چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت میں اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا[2]۔ بغداد کا سیاح اصطخری ۳۴۰ھ میں سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا۔ وہ کہتا ہے:۔

> ''منصورہ (یعنی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور انکے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے،،

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جس کی سندھ اور ملتان میں سیاحت کا زمانہ ۳۵۸ھ ہے۔ یہی کہتا ہے کہ:۔

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۳۲۔

[2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۳۲۔

> "منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی
> اور سندھی بولی جاتی ہے"[1]

اس کے چند سال بعد ۳۷۵ھ ۹۸۵ء میں بشاری مقدسی ملتان آیا۔ وہ لکھتا ہے:

> "اور یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے"[2]

پھر دیبل یعنی ٹھٹھ واقع سندھ کے حال میں کہتا ہے:

> "دیبل (ٹھٹھ) سمندر کے ساحل پر ہے۔ اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں۔ اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں۔ سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر ٹکراتا ہے۔ یہ سب سوداگر ہیں۔ ان کی زبان سندھی اور عربی ہے"[3]

ان معاصرانہ شہادتوں کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے۔ جس کی حد اس زمانہ میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں ایران، ترکستان، اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہِ راست ملتان ہو کر تھا۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا ہے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آکر ہندوستان کے جس پہلے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ملتان تھا چنانچہ سُلطان ناصر الدین قباچہ کے زمانہ تک جو سُلطان التمش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز ثقل ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔"[4]

---

[1] سفرنامہ ابن حوقل (عربی) ص ۳۲۲ (طبع لیڈن)۔

[2] سفرنامہ بشاری مقدسی ص ۴۸۱ (طبع لائڈن)۔

[3] سفرنامہ بشاری مقدسی ص ۴۷۹ (طبع لائڈن)۔

[4] سید سلیمان ندوی: **نقوش سلیمان** (طبع دوم) ص ۳۲۔

اس کے بعد سید صاحب نے لکھا ہے کہ "اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے، پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی، سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے۔ چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے۔ اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔" [1]

آخر میں سید صاحب نے اپنی تحقیقات کا خلاصہ و نتیجہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔ تینوں میں عربی و فارسی کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے جس کے رو سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا۔ اور آگے چل کر دار السلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی۔ اور پھر دار السلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی، علامہ بیرونی جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ تیار کیا ہے۔ اس نے اپنی اس کتاب میں جس لہجہ اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں ان سے ماہرین ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔" [2]

سید سلیمان ندوی نے اسی زمانہ میں ناگری پرچارنی سبھا کی فرمائش پر "اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟" کے عنوان سے اردو کے آغاز کی تاریخ پر ایک محققانہ مقالہ

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۳۴۔

[2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۳۵۔

لکھا تھا۔ جو جولائی ۳۳ء کے معارف میں شائع ہوا۔ اس میں بھی سید صاحب نے اپنے اسی مذکورۃ الصدر لسانی نظریہ کی مختلف صوتیاتی، تاریخی اور لسانی دلائل و شواہد سے توضیح کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: " ہر صُوبہ کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل جول ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا۔ اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ء میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے[1]"۔ سنہ مذکور میں فیروز شاہ ٹھٹھ پر ناکام حملہ کرکے جب واپس گجرات گیا تو ٹھٹھ والوں نے کہا :۔

"برکت شیخ تھبا، ایک موا ایک نٹھا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک (یعنی محمد تغلق شاہ) مرگیا اور دوسرا (یعنی فیروز شاہ) ناکام بھاگا[2]۔ اس سے یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے کہ ۷۶۲ء میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج اردو کہا جاتا ہے، پیدا ہوچکا تھا۔

نقوش سلیمانی کی اشاعت کے بعد جب عہد جدید کے محققین کے ملاحظہ سے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں سید صاحبؒ کا یہ جدید نظریہ گذرا تو انہوں نے اس کو شدید نقد و جرح کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ پروفیسر محی الدین قادری زورؔ نے اس سلسلہ میں سید صاحب کے مذکورہ بالا بیانات کو متضاد اور عجیب قرار دیتے ہوئے لکھا: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے پنجاب میں اردو اور ہندوستانی لسانیات جیسی تحقیقی و لسانیاتی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی"۔ موصوف مزید رقمطراز ہیں :۔

> "سید صاحب، صاحب لسانیات سے زیادہ تاریخ و ادب اور نقد شعر کے ماہر ہیں۔ اس لئے اپنے علم و فضل اور وسعت معلومات کے باوجود اصل مسئلہ سے دور ہوگئے یا شاید انہوں نے دوسرے

---

[1] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی (طبع دوم) ص ۲۵۹۔

[2] سید سلیمان ندوی : عرب ہند کے تعلقات ص ۳۸۸ (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)۔

مصنفوں کی تحقیق یا نظریئے سے ہم خیال ہونے کو اپنے بنجر کے کسرِ شان تصوّر کیا۔،،[۱]

پرُوفیسر اختر اورینوی نے سید صاحب کی پر زور اور مدلل حمایت کرتے ہوئے زورؔ صاحب کی مذکورہ رائے پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "پنجابی ریختہ کی اہمیت مسلم مگر اس میں کیا شک ہے کہ سندھی ریختہ کو پنجابی ریختہ پر تقدم حاصل ہے۔ کیونکہ عربی و فارسی بولنے والے پہلے پہل باضابطہ طور پر سندھ میں آئے اور دو سو سال تک جم کر رہے۔ وہیں سندھی بھاشا پر عربی و فارسی کے اثرات پڑے، لہذا اردو کا ہیولیٰ بلاشبہ سندھ میں بنا۔ کیونکہ ریختہ کا یہ اولین ہیولیٰ تھا۔ سید صاحبؒ نے اس کے کافی تاریخی دلائل پیش کئے ہیں،،[۲]

یہ بات بھی یقیناً قابلِ لحاظ ہے کہ بیشتر محققین اور ماہرینِ لسانیات کا اتفاق ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں کی مختلف صوبائی زبانوں کے ساتھ میل جول سے ایک نئی زبان (اردو کے نام سے) وجود میں آئی۔ اختلاف صرف اولین اور عمیق اثرات کے بارے میں ہے۔ محمود شیرانی بھی اس سے متفق ہیں کہ :-

"اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی تھی۔
جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کرلیا،،[۳]

شوکت سبزواری کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ شیرانی کے اس اصول کے مطابق مولانا سیّد سلمان ندوی کی رائے بجا نظر آتی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے پنجاب سے کئی سو سال پہلے سندھ کو فتح کیا۔[۴] غالباً اسی باعث خود ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کی نشو و نما کا سر رشتہ مسلمانوں کی فتوحاتِ ہند کے ساتھ جوڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی پختہ رائے ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کی دہلی میں آمد سے پہلے دہلی میں موجود تھی۔ اور بازار ہاٹ میں بولی جاتی تھی۔ اس کے ارتقار کو ابتدا سمجھ کر اردو کو مسلمانوں کی ساختہ

---

[۱] محی الدین قادری زور : اردو اور پنجابی (مضمون) رسالہ نقوش لاہور جولائی ۶۲ء [۲] اختر اورینوی: قدر و نظر ص ۲۹ [۳] محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ص ۲۶ [۴] شوکت سبزواری : داستان زبان اردو ص ۴۲۔

زبان قرار دے دیا گیا۔ [1]

بہر حال سید صاحب نے تاریخی حقائق اور لسانی شہادتوں کی بنیاد پر سندھ اور ملتان کو پہلی بار اردو کی جنم بھومی قرار دے کر اپنے عہد کے اکابر محققین کو متوجہ کر لیا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا شروع میں تو اس نظریہ کی شدید مخالفت کی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سنجیدہ غور و فکر کا مستحق بنتا گیا۔ خود شیرانی کے بعض بیانات سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ سید صاحب کے اس مخصوص نظریہ سے آج بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس حقیقت انکار ممکن نہیں ایک تاریخی و لسانی حقیقت کی طرف ذہن منتقل کر کے انہوں نے اردو زبان کے ممتاز نقادوں اور محققوں کی صف پیش میں جگہ حاصل کر لی ہے۔ راقم سطور کے نزدیک سید صاحب کے اس جدید لسانی نظریہ میں بڑا وزن ہے اس کی پشت پر تاریخی اور لسانی دلائل کا ایک انبار ہے۔ جب اردو کے وجود میں آنے کا سبب ہندو مسلمانوں کا اختلاط اور ان کے درمیان باہم تمدنی روابط کا قائم ہونا ہے تو پھر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی و فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا۔ لہٰذا یہ ایک واضح و روشن امر ہے کہ اردو کا اصلی مولد سندھ ہے۔

(۷)

نقوش سلیمانی کے آخری باب "مقدمات" میں سید صاحب کے تنقید و تبصرہ کی بہار دکھائی دیتی ہے۔ اس میں اردو نظم و نثر کی نو کتابوں پر مقدمہ سپرد قلم کرتے ہوئے اس کے محاسن و نقائص پر سیر حاصل تقریظ و انتقاد کیا گیا ہے۔ پہلا مقدمہ "مکاتیب شبلی" پر ہے۔ سید صاحب نے اپنے استاذ کے خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کر کے دار المصنفین سے شائع کیا۔ اور اس پر دس ۱۰ صفحے کا ایک جامع و پر مغز مقدمہ بھی لکھا۔ جو کئی حیثیتوں سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں نفس خطوط و مکاتیب کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"تاریخی انسانوں کے صحیح حالات جاننے کا ایک ذریعہ

---

[1] شوکت سبزواری: داستان زبان اردو ص ۴۲

ان کی سوانحمریاں ہیں، لیکن درحقیقت سوانح نگار کا قلم اپنے ہیرو کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہے وہ صرف اس کے ظاہری خط وخال کی نقاشی ہوتی ہے۔ عمق قلب کے اندر جو رموز اور اسرار ہیں اور جن سے اصل میں "انسانیت" عبارت ہے، ان کی تصویر کشی کے لئے جو رنگ درکار ہے وہ دوسروں کو میسر نہیں آسکتا۔ انسانوں کی خودنوشت سوانحمریاں (آٹو بیوگرافی) ایک حد تک اس کی تلافی کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ انسان یہ سمجھ کر اپنے حالات قلمبند کرتا ہے کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا۔ اس لئے اصل تصویر میں جہاں جہاں داغ ہیں، وہاں پر سیاہی پھیر جاتا ہے اس بنا پر یہ مرقع بھی اس کی صورت کی سچی شبیہ نہیں ہوتی۔ "صرف ایک ہی شے انسان کی حقیقی شکل وصورت کا آئینہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کے ذاتی اور نج کے خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے چونکہ لکھنے والے کو یہ کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظر عام پر آئیں گے۔ پھر بہت سے ایسے مکتوب الیہ ہوتے ہیں جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہیں۔ جن سے کوئی پردہ نہیں رہتا۔ اس لئے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس وپیش حوالہ قلم کرتا جاتا ہے۔ اس لئے اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ ہے۔"[1]

پھر علامہ شبلی کی خطوط نویسی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی حسب ذیل خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔

"۱ - نہایت مختصر خط لکھتے تھے۔ کبھی صرف ہاں، ناں پر اکتفا کرتے تھے۔

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۳۶۵۔

مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں دیتے تھے ۔

۲ ۔ مختصر نویسی کے ساتھ اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے باوجود معنیٰ میں پوری وسعت موجود ہے ۔ وہ دو ایک فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں ، ہم صفحوں میں انکو نہیں کھپا سکتے ، وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں ، اس زمانے کے سامری منتروں میں وہ روح نہیں پیدا کر سکتے ۔ یہ خصوصیت شبلی کی انشاء پردازی اور بلاغت کی جان ہے ۔

۳ ۔ آداب والقاب کی پروا نہیں کرتے تھے ۔ اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے تھے ۔

۴ ۔ خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن دیدیتے تھے ۔

۵ ۔ مولانا شبلی ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے ۔ مثلاً تلامذہ کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے ۔ پروفیسر عبدالقادر سے ادب و تاریخ فارسی کے مباحث پر گفتگو ، مولانا حمیدالدین سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات عبدالماجد دریابادی سے مغربیات کی باتیں ، مہدی افادی سے محاسن ادبی اور لطافت شعری پر گل افشانیاں نظر آتی ہیں ۔“

نقوش سلیمانی میں دوسرا مقدمہ ”مکاتیب مہدی“ پر ہے ۔ کس دل نشیں انداز میں اس کے محاسن بیان کرتے ہیں :-

> ”مہدی مرحوم کے خطوط پر نقد و تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو ایک ایک کرکے دکھانا ایسا ہی کام ہے جیسے کسی خوش رنگ اور خوشبودار پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے ، وہ پھول ہیں پھول پھولوں کی قدر یہی ہے کہ آپ ان سے لطف اٹھائیں بس ۔ جہاں آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے ۔ اور نازک پتیاں آپ کی

> انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں۔ بہتر سے بہتر صورت نزاکت ولطافت کی ان تصویروں کے لئے یہی ہے کہ دور ہی سے ان کی خوشنمائی، خوش قامتی اور خوشبوئی کی تعریفیں کی جائیں اور ان سے خود لطف اٹھائے اور دوسروں کو بھی لطف اٹھانے دے۔"[1]

تیسرا مقدمہ "گلستانِ امجد" پر ہے۔ امجد حیدر آبادی نے، سعدی کی گلستاں کا ترجمہ سہل اردو میں کیا ہے۔ اس کے بارے میں سیّد صاحب رقمطراز ہیں:-

> "کہنے کو تو یہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے۔ مگر حقیقت میں امجد کی تصنیف ہے اس میں امجد نے سعدی کے خزانہ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قابض کی مِلک ہوگیا ہے ......
> ترجمہ کی زبان آسان اور رَواں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مختصر جملے، ٹھیٹ محاورے، دلکش ترکیبیں، موٹے موٹے اور بڑے بڑے لفظوں سے پرہیز اس کتاب کی خاص خصوصیت ہے۔"[2]

چوتھا مقدمہ "کلامِ شاد" پر ہے، شاد عظیم آبادی اردو کے عظیم غزل گو شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے رنگ سخن کے بارے میں سیّد صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:-

> "شاد کی شاعری حسن وعشق کے عامیانہ وشوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاکبازانہ حسن وعشق اور رزم وبزم کی دلکش رُوداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوّف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شادؔ میں میرؔ کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن وعشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے، چھوٹے چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رقّت ہے۔ میرؔ کے اوزان وبحور ہیں۔ وہی انداز کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے۔

---

[1] [2] سیّد سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۸۰ — ۳۷۹، ۳۹۲۔

اس لئے شاد کو اس دور کا میرؔ کہا جائے تو بالکل بجا ہے،،[1]

پانچواں مقدمہ جہاں آباد کے ایک صوفی بزرگ شاہ رکن الدین عشق کے اردو کلیات پر ہے۔ ان کے صوفیانہ اور عاشقانہ کلام کا انتخاب نقل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:-

> "حضرت عشقؔ کے صُوفیانہ کلام کا عام انداز وہی ہے جو حضرت مظہر اور خواجہ درد کا ہے۔ کہیں کہیں زمین، بحر اور قافیہ کا بھی اتحاد ہے... ان کے عاشقانہ کلام کی اصل خوبی سادگی، لطافت، جوش بیان اور روانی ہے۔ مصرعوں میں اتنی برجستگی ہوتی ہے۔ کہ ہر شعر خوبی و فصاحت کی ایک صاف و مصفی سلسبیل ہے۔ نہ پیچیدگی ہے، نہ اشکال ہے، نہ ثقل تراکیب ہے۔ ساتھ فصاحت و بلاغت کی یہ جوئے رواں ابتذال اور مضامین پامال کے خس و شاک سے پاک ہے،،[2]

چھٹا مقدمہ "شعلۂ طور" پر ہے جو جگر مرادآبادی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ سید صاحب نے اس میں شاعری کی حقیقت و ماہیت یا جگر کی شاعری پر فنی حیثیت سے کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے بلکہ محض جگر کی ذات کا تعارف اور ان کی شاعری پر شاعرانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن اس سے جگر کی شاعری کی حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس تقریظ کا درج ذیل آخری پیراگراف پر کیف عبارت آرائی اور انشار پردازی کا شہ پارہ ہے:—

> "جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے نہ سُرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام نہ شکایت منظر عام۔ نہ اس کے کاشانہ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے۔ اس کے کوچہ میں شہدار کے دل و جگر کی گلکاری ہے۔ وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۳۹۹، ۲۱۸۔

> نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر۔ وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے، مگر نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے، مگر نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی تمنا کی آنکھیں کبھی بے حجاب دکھائی دیتی ہیں تو وہ ہاتھ اٹھا کر چھونا چاہتا ہے، مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔
>
> جگر مست ازل ہے۔ اس کا دل سرشار الست ہے۔ وہ محبّت کا متوالا اور عشق حقیقی کا جویا۔ وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود و فراموش ہو کر بزم ساقیٔ کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے۔
>
> جگر سرشار مگر در حقیقت بیدار ہے۔ اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے۔ اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں یہ اثر نہ ہو،،[1]

بلاشبہہ یہ اقتباس جگر کی شاعری کا خلاصہ اور عطر ہے، اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سیّد صاحبؒ نے جگر کو "مست ازل" اور "سرشار الست" اس وقت لکھا تھا جب جگر نہایت معمولی شراب پی کر کہیں نشہ میں چور دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے ظاہر بیں نگاہوں نے سیّد صاحب کے مذکورہ بالا الفاظ پر نکتہ چینی کی اور حیرت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن سیّد صاحب نے ۳۲ء میں جو کچھ لکھدیا تھا اس میں ترمیم کرنا پسند نہیں کیا۔ اور جگر کے بارے میں اپنی اس رائے پر قائم رہے۔ اور وقت نے سیّد صاحبؒ کے مذکورہ الفاظ کو حقیقت بنا کر عیاں کر دیا۔ جگر اپنی زندگی کے آخری دور میں فی الواقع "مست ازل" اور "سرشار الست" ہو گئے تھے۔ سیّد صاحب کے الفاظ گویا بشارت بن گئے۔

نقوش سلیمانی میں شامل آٹھواں مقدمہ "مسدّس حالی" پر ہے۔ مولانا

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۴۳۱ ۶۔

حالی کے مسدس مدوجزرِ اسلام کو جو شہرت اور قبول عام حاصل ہوا، اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت حالی کی حقیقت حال کی ترجمانی ہے۔

سیّد صاحب اس کی مقبولیت کا سبب بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> "مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی حالت و کیفیت کا آئینہ تھا جس میں اس کے چہرے کا ایک ایک خط و خال نمایاں تھا۔ اسکی پیدائش، اس کا نمو، اس کی جوانی، اس کا بڑھاپا، اس کے عوارض، اس کی کمزوری، ہر چیز اس میں نظر آرہی تھی۔ اس لئے ہر مسلمان کو جس میں ذرا بھی حس تھی اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا،،[1]

پھر مسدس پر نہایت ایجاز کے ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "اردو شاعری میں جو صرف تفریح طبع کا سامان رہ گئی تھی اور جس میں گل و بلبل کی حکایت، حسن و عشق کی روایت اور رقیب سیہ رو اور فلک پیر کی شکایت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ شاعر نے اپنی مسیحا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی رُوح پھونک دی، لفظ سیدھے سادھے ترکیبیں بے تکلف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و استعارہ سے پاک مگر ہر شعر جوش بیان سے لبریز، وفور احساس سے معمور اور درد و غم سے بھرا ہوا"[2]

اور پھر مسدس کے ساتھ خود مولانا حالی کی طبیعت و مزاج کی بھی تصویر کھینچکر رکھدی ہے لکھتے ہیں:۔

> "شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی۔ وہ ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا۔ اس کا مزاج سدا کا اداس تھا۔ وہ عالم کی نیرنگی زمانہ کی ناسازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی دیکھ دیکھ کر خود بھی اکثر

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۴۴۸، ۴۴۹۔

> روتا تھا۔ اور دوسروں کو رلاتا تھا .... اس انداز کا شاعر جب ملت مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ وجلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ اور اس کے لب کی ہر صدا فریاد کی ایک لے کیوں کر نہ بنجائیگی،،[1]

نقوش سلیمانی کا آخری مقدمہ محمود اسرائیلی کے مجموعۂ کلام "خیاباں" پر ہے۔ اسرائیلی وطن کی محبت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ وہ اسلام کے عاشق ہیں۔ اس لئے انہیں اسلام کا ہندی شاعر یا ہندوستان کا مسلمان شاعر کہا جاسکتا ہے۔ وہ شاعری میں شبلی، اقبال اور ظفر علی خاں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیات سید صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں :-

> "ان کی اخلاقی اور تاریخی شاعری میں شبلی کا تخیل ہے انکی سیاسی اور وطنی شاعری میں ظفر علی خاں کی پُرکاری ہے۔ ان کی حقیقت شناسی اور اتحاد اسلامی کے ساز میں اقبال کا ترانہ ہے... محمود اسرائیلی کی ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ انہوں نے غزل گوئی کے پامال کوچہ میں قدم نہیں رکھا اور عشق ومحبت کے جھوٹے موتیوں سے اپنے جیب ودامن کو نہیں بھرا۔ وہ زلف دراز کے گرفتار، چشم سیاہ کے مسحور، اور حسن عارض کے گرویدہ نہیں۔ ان کے سینہ میں دکھاوے کے غم عشق اور نمائش کی آہ ونالہ کی جگہ نہیں۔ گو "عاشقانہ" نظموں کا اس مجموعہ میں بھی ایک عنوان ہے، مگر عشق ومحبت کی اس داستان میں "آپ بیتی" نہیں "جگ بیتی" ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ شاعر کا داخلی نہیں خارجی رنگ ہے،،[2]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی (طبع اول) ص ۴۵۱ ، ۴۶۰ -

خیّام

یہ کتاب علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی زندگی کا اہم ترین کارنامہ اور ان کی وہ معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ جس نے ہندوستان کے محققین و دانشوروں کے علاوہ ایران و افغانستان کے فضلاء اور یورپ کے خاور شناسوں سے داد و تحسین حاصل کی۔ ایران میں فردوسی کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر حکومت افغانستان نے ایران کو جو نادر علمی تحائف دیئے تھے، ان میں ایک تحفہ سید صاحب کی یہ گرانقدر کتاب بھی تھی۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس زمانہ میں اسے پانچ سو روپئے کے انعام کا مستحق قرار دیا تھا[1]۔ ۵۰۹ صفحات کی ضخامت پر مشتمل یہ تصنیف پہلی بار ۱۹۳۳ء میں مطبع معارف اعظم گڈھ میں طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئی۔

سید صاحب نے "خیام" میں سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تحقیق، ماخذوں، سندوں اور حوالوں کے تفحص اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو و تلاش اور مختلف کتب خانوں کے مستند قلمی نسخوں کی مدد سے خیام کی خالص رباعیات کی جمع و ترتیب میں نہایت کد و کاوش اور جانفشانی کی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے درست لکھا ہے:۔

> "خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہو گیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی۔ جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مؤرخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معمولی سے معمولی دعوے کو مستند سے

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن: سوانح حیات (مضمون) رسالہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۷۔

مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے۔ ماخذات کے لئے کس کس بے کنار وسنسان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہوگا تب کہیں جاکر کسی رہرو کے قدم ملے ہوں گے اور جادۂ منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا۔ معلوم نہیں ،،[1]

اس کتاب کی تالیف کی تقریب یہ ہے کہ پنجاب کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی اور ان کے رفقاء پروفیسر اقبال و پروفیسر محمد شفیع وغیرہ نے رسالہ اردو اورنگ آباد میں مولانا شبلی کی شعر العجم پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جس میں ان لوگوں نے تاریخ و تذکرہ سے متعلق شبلی کے بعض مسامحات کی نشاندہی کی تھی۔ اس سلسلہ کا ایک مضمون "شعر العجم اور خیام" بھی تھا۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں فروری ۲۴ء کے "معارف" میں اسی عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا۔ اور معترضین کی ایک ایک نکتہ چینی کا مدلل جواب دیا۔ اسی مضمون کے آخر میں انہوں نے برہم ہو کر یہ بھی لکھ دیا کہ "شعر العجم" واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کا افسانہ ہے" سید صاحب کا یہ مضمون اہل علم کے حلقہ میں بہت پسند کیا گیا۔ پھر اسی موضوع پر دسمبر ۱۹۳۰ء میں اورینٹل کانفرنس پٹنہ میں ایک مقالہ لکھ کر پیش کیا۔ جس کو ارباب نظر نے پہلے مقالہ سے بھی زیادہ پسند کیا۔ ان ہی مذکورۃ الصدر دونوں مقالوں نے بڑھ کر مستقل تصنیف کی شکل اختیار کرلی۔

"خیام" کے دیباچہ میں سید صاحب اس کی تصنیف کی دو وجہیں بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

> "ایک تو یہ کہ اس کے بعض واقعات، تصانیف اور سنین کے متعلق مجھے کچھ کہنا تھا۔ اور اپنی فکر و کاوش اور جد و جہد کے نتیجے ارباب نظر کے سامنے پیش کرنے تھے۔ اور دوسری یہ کہ اب تک لوگوں نے اس کو صرف اس کی رباعیوں کے ذریعہ سمجھا تھا۔ جن کی تعیین سراسر مشکوک ہے۔ اور میں نے اس کو خاص فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ روشناس کیا ہے جن میں وہ بالکل ایک نیا شخص معلوم ہوتا ہے،

---

[1] رشید احمد صدیقی: ہم نفساں رفتہ ص ۲۶ (معارف پریس اعظم گڑھ)

اس لئے کتاب کے آخر میں اس کی فلسفیانہ تصانیف کا حصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ تاکہ ہر شخص اس کو اس آئینہ میں دیکھکر پہچان سکے،،[1]

کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے سوانح خیام کے مآخذ و مصادر پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔ پھر اس کی مشہور داستان معاصرت پر تنقید ہے۔ اس کے بعد خیام کے فضل و کمال کی تفصیل ہے۔ پھر اس کی تصنیفات کی فہرست اور ان پر تبصرہ ہے۔ پھر اس کے عربی و فارسی کے متعدد رسالے ہیں[2]۔ اور آخر میں رباعیات خیام ہیں جن کی تصحیح کتب خانہ الاصلاح دیسنہ (پٹنہ) کے ایک مستند قلمی نسخہ کی مدد سے کی گئی ہے۔ یہ مخطوطہ مشہور کاتب سلطان علی (المتوفی ۹۱۹ھ) نے اپنی وفات سے آٹھ برس قبل ۹۱۱ھ میں لکھا ہے۔ رباعیات خیام کے جتنے بھی نسخے یورپ اور ایشیار کے کتب خانوں میں موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ مستند اور مکمل یہی نسخہ ہے۔ جس کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس میں کوئی بھی رباعی الحاقی نہیں ہے۔[3]

خیام جیسے نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیاش اور بدمست رند لاابالی کی شکل میں پیش کیا تھا۔ جو ہمیشہ شاہد و شراب میں غرق رہتا اور جس کا مقصدِ حیات صرف رندی اور عیش پرستی تھی۔ پیش نظر کتاب میں سید صاحب نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ خیام کی اصل تصویر اس سے قطعی مختلف ہے وہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم فلسفی، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور دوسرے علوم عقلیہ کی مہارت میں مفقود النظیر تھا۔ اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا۔

مگر جیسا کہ شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے کہ اہل یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے، اس لئے رباعیات کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی وہ ہم مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی۔ چنانچہ اسی کو اصل سمجھ کر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام اور بدمست شرابی ہم معنی بن گئے،،[4]

---

[1] سید سلیمان ندوی: خیام دیباچہ ص ۱۱ (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۵۲ء)۔ [2] عبد الشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۱۹ (ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ)۔

[3] ابو علی: "خیام، سید صاحب کا عظیم کارنامہ" (مضمون) رسالہ فاران کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۴۰۔

[4] شاہ معین الدین: "سید صاحب کی دینی و علمی خدمات" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۰۰۔

حالانکہ بڑے بڑے مسلّم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں۔ ابوسعید ابوالخیر۔ اور مولانا روم جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب کی رنگینیاں اور شاہد کی رعنائیاں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ خواجہ حافظ کا تو پورا کلام رندی و سرمستی سے چور ہے۔ دراصل یہ مشرقی شاعری کے مزاج و روایت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل اور ہجر و وصال سب فارسی شاعری کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ ان کے سہارے کے بغیر شاعری کے میدان میں ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا۔ اور نہ ان سے صرفِ نظر کر کے کلام میں حسن و دلکشی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم و فلسفی اور صوفی صافی شعراء بھی ان استعارات و کنایات کے استعمال پر مجبور رہتے۔ غالب نے تو اس حقیقت کو بہت ہی عمدہ پیرائے میں واشگاف کر دیا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جب فارسی شاعری کے اس طرۂ امتیاز کو سامنے رکھا جائے تو شاہد و شراب کے استعارات و کنایات کو عیاشانہ اور فاسقانہ رنگ میں مطالعہ کرنا کسی طرح درست نہیں، اس کے علاوہ خیام بہت سی رباعیاں اخلاقی بھی ہیں۔ ان کو کیوں نظرانداز کیا جائے خاص طور سے جب یہ بات تاریخی حیثیت سے مسلّم ہے کہ وہ ایک بڑا عالم، حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا۔

علامہ شبلی نعمانی پہلے اردو مصنف ہیں جنہوں نے شعرالعجم میں خیام پر تفصیل سے لکھا اور ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جو اس کے بارے میں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اس کے فضل و کمال کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "خیام کو آج زمانہ شاعر کی حیثیت سے جانتا ہے، لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر اور فن ادب و تاریخ میں امام فن تھا۔ جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکماء میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے "امام خراسان و علامۃ الزمان"[1]

---

[1] شبلی نعمانی: شعرالعجم (طبع چہارم) ص ۲۰۳ (معارف پریس اعظم گڈھ)۔

ان کے بعد سیّد سلیمان ندوی دوسرے مصنّف ہیں جنہوں نے فارسی کے اس مایۂ افتخار شاعر، حکیم اور فلسفی کے متعلق بہت شرح و بسط اور تحقیق و تنقید کے ساتھ لکھا۔ اس تصنیف کا ابتدائی سبب تو جیسا کہ مذکور ہوا شبلی کے معترضین کو جواب دینا تھا۔ لیکن جب سید صاحب کا اشہب قلم رواں ہوا تو پھر اس موضوع کے تمام پہلوؤں اور علمی گوشوں کو منور کر دیا۔ خیام کی شاعرانہ شخصیت حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاوداں ہو گئی ہے۔ وہ اب صرف فارسی زبان ہی کا شاعر نہیں رہا ہے۔ بلکہ دنیا کے ممتاز شعراء میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس لئے اس کی شخصیت اور شاعری کو صحیح تناظر میں پیش کرنا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ اور سید صاحب نے اس تقاضے کو بوجہ احسن پورا کیا ہے ان کی یہ تصنیف علمی اور ادبی دونوں حیثیت سے ایک لافانی کارنامہ ہے۔

سید صاحب کی اس تصنیف کا نمایاں ترین وصف اس کا تحقیقی پایہ ہے۔ اس میں ہر بیان کا ماخذ، ہر قول کی سند اور ہر دعوے کی دلیل مہیا کی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالشکور نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

> "یہ کتاب مؤلف نے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد لکھی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کئی سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے،،[1]

اس کا سب سے دلچسپ اور مفید حصہ وہ ہے جس میں فاضل مؤلف نے رباعی کی ابتدا کو تاریخی روشنی میں پیش کیا ہے۔ اور اس کی عہد بعہد ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اپریل ۲۳ء کے رسالہ معارف میں سید صاحب نے پہلی بار رباعی کے آغاز اور اس کی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ اسی کو مزید اضافہ اور مناسب ترمیم کے ساتھ "خیام" میں شامل کر لیا۔

بعض دیگر ممتاز شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کے کلام کے ساتھ بھی دوسرے شعراء کا کلام خلط ملط ہو گیا ہے۔ سیّد صاحب رباعیات خیام میں تخلیط کے سات اسباب بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۱۹۔

"ایک ممکن صورت تخلیط کی یہ ہے کہ بعض تند نوشوں نے حافظ کی شراب کو دو آتشہ بنانے کے لئے دیوان حافظ میں حافظ کی غزلوں کے پہلو بہ پہلو خیام کی رباعیاں بھی لکھیں۔ بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس دو آتشہ کی کشید کی کشش شہنشاہ اکبر کے دل میں بھی پیدا ہوئی اس سے بعضوں نے دھوکہ کھا کر خیام کی رباعیوں کو حافظ کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ حافظ کا رباعی گوئی میں کوئی درجہ نہیں"[1]

اس لئے سید صاحب نے رباعیات خیام کے مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی اصل رباعیات کی تعیین کی پوری کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ رقمطراز ہیں:-

"خیام کی رباعیوں کی تعیین کا مسئلہ نہایت اہم ہے اس کے حل کی اصلی صورت یہ ہے کہ خیام سے قریب تر عہد کا کوئی نسخہ بہم پہونچے مگر افسوس ہے کہ اب تک نویں صدی ہجری سے پہلے کا کوئی نسخہ بہم نہیں پہونچا ہے۔ اس لئے مختلف ارباب تحقیق نے اس کمی کو دور کرنے کی اب تک حسب ذیل صورتیں اختیار کی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں مجھے کچھ نہ کچھ ترمیم و اضافہ پیش کرنا ہے۔"[2]

اس کے بعد سید صاحب نے خیام کی اصل رباعیوں کی تعیین کے لئے مدلل طور پر پانچ طریقے پیش کئے ہیں۔ جن کی روشنی میں دستیاب سرمایۂ رباعیات میں خیام کے "خالص مال" کو متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔[3]

ایک دوسری جگہ سید صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ عمر خیام کی شراب دراصل دنیاوی شراب نہ تھی، بلکہ بادۂ حقیقت تھی۔ ذیل کے اقتباس میں حسن انشار کی چاندنی بھی قابلِ توجہ ہے:-

"اس کی رباعیوں کی صحت کا اگر تعیین بھی کر لیا جائے تو بھی یہ عامیانہ خیال درست نہیں کہ اس کی ہر رباعی میں شراب سے

---

[1] [2] [3] سید سلیمان ندوی، خیام ص ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۳ - ۲۹۲ -

"وہی تلخوش" مراد ہے جو صوفیوں کے محاورے میں "امام الخبائث" ہے۔ اس لئے اس کی ہر رباعی کو جس میں بادہ وجام وساقی کا ذکر ہے، تنہا شراب خانہ خمار نہیں کہہ سکتے۔

خیام کے میکدہ سخن میں شراب کی جتنی بوتلیں ہیں، صاحب ذوق کی نظر اندازہ کرتی ہے کہ وہ یکساں نوعیت کی نہیں ہیں "۔[1]

خیام نے تحصیل علم اور حصول کمال کے بعد درس و تدریس کے بجائے تحریر و تصنیف کا مشغلہ پسند کیا اور اس میں اپنی تمام علمی صلاحیتوں کو صرف کر دیا۔ سید صاحب اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس کا دماغ زیادہ تر ریاضیات کے لئے موزوں تھا۔ اور ریاضیات میں بھی مساحت، جبر و مقابلہ، اور اقلیدس کی طرف اس کا میلان تھا۔ چنانچہ اس نے ان میں سے ہر بحث پر ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں اس فن کے مشکلات کو حل کیا اور مسائل کی نئی نئی صورتیں نکالیں۔ اور ان کو ثابت کیا ہے۔

اس کی کتاب جبر و مقابلہ میری تحقیق میں اس کی ابتدائی تصنیفات میں ہے...... اس کے دیباچہ میں زمانہ کی ناقدردانی اور کس مپرسی کی شکایت کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ نجوم وطب کے علاوہ کسی عقلی علم و فن کی قدر اس زمانہ میں نہیں "۔[2]

سید صاحب کی یہ تصنیف "خیام" بنیادی طور پر تحقیقی ہے۔ لیکن اس کا موضوع چونکہ شعر و ادب سے بھی متعلق ہے اس لئے اس میں تحقیق و تنقید کا بڑا حسین سنگم ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں سید صاحب کے بلند پایہ تنقیدی شعور کی جلوہ فرمائی اس جگہ خاص طور پر نظر آتی ہے جہاں انہوں نے خیام کی بادہ پرستی اور میخوارگی کی حقیقت واضح کی اور خمریہ رباعیوں کی

---

[1] سید سلیمان ندوی: خیام ص ۲۳۶ ۔

[2] سید سلیمان ندوی: خیام ص ۹۶ - ۹۵ -

تشریح کی ہے انہوں نے خیام کے میکدۂ سخن کی شراب کی بوتلوں کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے۔ شراب شرابِ[۱] عاریت ، شرابِ[۲] اخلاص ، بادۂ[۳] حقیقت۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی مدلل و مبرہن توضیح کی ہے۔ سیّد صاحبؒ خیام کے پیالہ میں "بادۂ حقیقت" کی مثال میں حسب ذیل رباعی

قرآن کہ مہین کلام خوانند او را ——— گہ گاہ نہ بر دوام خوانند او را
درخط پیالہ آیتے ہست مقیم ——— کاندر ہمہ جا مدام خوانند او را

نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :—

> "اس رباعی کی بنیاد کو "مدام" کے ایہام لفظی پر قائم ہے۔ جس کے معنی ہمیشہ کے بھی ہیں اور شراب کے بھی ہیں۔ اسی طرح "خوانند" کے معنی پڑھنے کے بھی ہیں، اور نام لینے کے بھی ہیں، پیالہ میں شراب کے پیمانے کے لئے خط یعنی نشانات بنے رہتے تھے۔ تا کہ ہر خط سے شراب کی مقدار کا اندازہ ہو سکے اور پینے والا اندازہ سمجھ کر پیئے۔ اب اس مطلب میں کہ قرآن جس کو لوگ کلام پاک کہتے ہیں، لوگ اس کو کبھی کبھی پڑھتے ہیں ہمیشہ نہیں۔ لیکن شراب کے پیالے میں جو خط ہے اس میں ایک آیت ہے جس کو لوگ "مدام" پڑھتے ہیں یا اس کو مدام (شراب) کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی ندرت نہیں اور نہ یہ ضلع جگت حکیم خیام کے کام کی چیز ہے۔ اس رباعی کا مطلب اس سے بالکل الگ بہت بلند ہے۔ شراب اگر شراب معرفت ہے تو پیالہ عارف کا دل ہے۔ کہتا یہ ہے کہ قرآن ایسا کلام الٰہی ہے جس کو لوگ کم پڑھتے ہیں۔ مگر عارف کے سینہ میں جو صحیفۂ دل ہے جس میں آیت الٰہی ہمیشہ کے لئے مقیم ہے۔ اس کو ہر جگہ آسانی کے ساتھ ہر شخص پڑھ سکتا ہے "[1]

---

[1] سیّد سلیمان ندوی : خیام ص ۳۴۶ ،

اسی طرح "خیام" حسن ادب و انشاء کی چاندنی سے بھی معمور ہے، پروفیسر عبدالشکور اس کتاب کے ادبی و تنقیدی پائے کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"اس کی عبارت بہت سنجیدہ و دلکش ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ طرز انشاء ہے جو نقاد کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہوتا ہے ...... یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں ایک بڑا یادگار اضافہ ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اتنی بلند تنقیدی کتابیں اردو تنقید کے گذشتہ دور میں بہت کم ہیں،،[1]

حسن تحریر کے چند ادب پارے ملاحظہ فرمائیں۔ سید صاحب خمریہ شاعری کی حقیقت نمایاں کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"چونکہ آب و ہوا اور ساری فضا میں شراب کا نشہ بھرا ہوا تھا اس لئے زاہد و عابد اور عالم و فاضل سے لیکر رند و آزاد تک اگر شراب پیتا نہ تھا تو شراب بولتا ضرور تھا۔ اور گل و بلبل کی طرح شراب و جام بھی تشبیہات و استعارات کا ضروری جزو بن گئے تھے۔ اسلامی شاعری کی ترکیب میں شراب کی آمیزش اس طرح ہوئی کہ بنی امیہ کے دربار میں بعض عرب عیسائی شعراء داخل تھے۔ یہ شراب پیتے بھی تھے۔ اور شراب کے مضامین بھی نظم کرتے تھے۔ بنو عباس کا دور آیا تو یہ رنگ اور تیز ہو گیا۔ فارسی شاعری اس نشہ سے چور ہے۔ کبھی وہ شراب معرفت تھی کبھی مئے محبت تھی اور آج بادۂ وطن ہے،،[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"خیام کے پیالہ میں ایک تیسری شراب بھی نظر آتی ہے جس کا

---

[1] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۲۰، [2] سید سلیمان ندوی: خیام ص ۴۳۵۔

> نام "بادۂ حقیقت" ہے وہ شراب کو غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت، روح حق، جذبۂ روحانی اور معرفت قلب کے معنوں میں استعمال کرتا ہے، وہ لوگ جو خیام کی شراب کو بھی دنیا کی مکدر شراب سمجھتے ہیں وہ ذرا اس مئے صافی پر نظر ڈالیں کہ کیا یہ شراب ظاہری طور سے پی جا سکتی ہے، اس کا مجاز خود اس کی حقیقت کا پردہ کھول رہا ہے،،[۱]

سید سلیمان ندوی کی اس گرانقدر تصنیف کی اہمیت وعظمت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ اس کو منصۂ شہود پر آئے ہوئے تقریبًا نصف صدی گذر گئی ہے اس دوران تحقیق وتنقید کا کارواں بہت آگے بڑھ چکا ہے، غور وفکر کے سانچے بدل چکے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ "خیام" اپنے موضوع پر آج بھی حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

> "عمر خیام" پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا،،[۲]

---

[۱] سید سلیمان ندوی: خیام ص ۳۴۵۔

[۲] اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۷۸ (شیخ اشرف لاہور)۔

حیاتِ شبلی

اردو میں سوانحمریاں تو کثرت سے لکھی گئی ہیں، لیکن جہاں تک ادبی سوانحمریوں کا تعلق ہے، ان کی تعداد بس گنی چنی ہے، حقیقت یہ ہے کہ صرف حالی کی حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، اور حیاتِ سعدی، افتخار عالم کی حیات النذیر اور سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی کے "پنج گنج" ہی سے ادبی سوانحمری کا فن سربلند اور باوقار ہے۔

حیاتِ سعدی کی ضخامت تقریباً ڈھائی سو صفحے ہے، اس میں شیخ سعدی کے حالات کا ایک مختصر تذکرہ اور کلام پر جامع تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے لکھنے کا مقصد دلوں میں سعدی کی عظمت پیدا کرنا ہے، اردو ادب میں یہ پہلی باقاعدہ سوانحمری ہے، جو مشرقی تذکرہ نویسی سے ہٹ کر جدید سائنٹفک بنیادوں پر لکھی گئی ہے[1]۔ یادگارِ غالب حالی کی سوانح نگاری کی دوسری اہم کڑی ہے۔ جو چھوٹی تقطیع کے چار سو صفحے کے حجم پر مشتمل ہے اس میں حالی نے اپنے فن اور اسلوب کا پورا کمال دکھایا ہے۔ مرزا کی زندگی کا اتنا جیتا جاگتا مرقع نیز ان کی تصنیفات نثر اور فارسی و اردو کلام پر اتنا جچا تلا تبصرہ اس سے پہلے معدوم تھا۔ بلاشبہہ غالب شناسی اور غالب فہمی کو عام کرنے میں اس کتاب نے بنیادی رول ادا کیا ہے۔ حیات جاوید کی ضخامت ساڑھے آٹھ سو صفحے سے زاید ہے یہ اردو ادب میں حالی کی سوانح نگاری کا سب سے بڑا اور یادگار کارنامہ ہے۔ اس میں سرسید کی شخصیت، ان کے علمی، ادبی، صحافتی اور پبلک کارناموں پر مبسوط روشنی ڈالی گئی ہے حالی کی یہ گرانقدر ادبی سوانحمری بے حد مقبول ہوئی اور ستارۂ نور بن کر اس فن پر دوسرے لکھنے والوں کے لئے مثال اور نمونے کا کام دینے لگی۔

حیات النذیر مصنفہ افتخار عالم مارہروی کی ضخامت ساڑھے چھ سو صفحات سے

---

[1] عبدالقیوم: تنقیدی نقوش ص ١٢ (مشتاق بک ڈپو کراچی ۶۳ء)۔

زائد ہے۔ یہ "شیر بیشۂ ادب" ڈپٹی نذیر احمد کی لائف ہے۔ گو ان کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ گیر تھی، لیکن اصلی حیثیت ایک مصنّف اور ادیب ہی کی تھی۔ اس لئے حیات النذیر ادبی سوانح عمریوں کی صف میں شامل ہونے کی حیات جاوید سے زیادہ حقدار ہے۔

حاؔلی نے حیات سعدی لکھ کر بعد والوں کے لئے جو نئی راہ کھولی تھی۔ سیّد صاحب نے حیات شبلی لکھ کر اس کو درجہ کمال اور بام عروج پر پہونچا دیا۔ ادبیات اردو میں شبلی کی عظیم شخصیت، بلندیٔ مرتبت، جامعیت اور ہمہ گیری کے ایک ایک نقش کو حسن انشاء کے سانچے میں ڈھال کر اجاگر کرنے کا حق سیّد سلیمان ندوی جیسا متنوع الکمالات شاگرد رشید ہی ادا کر سکتا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے "حیات شبلی" کے نقائص میں سخت نکتہ چینی کرنے کے باوصف اسے "ہماری زبان کی سب سے مفصّل اور وقیع سوانح عمری" قرار دیا ہے۔ بلکہ کسی اہل علم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "سیّد سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حاؔلی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا"[1] شبلؔی اس زمانے کے مصنفین کے ابوالآباء ہیں، اس لئے ان کی سوانح عمری کو دوسروں کے لئے مشعل راہ ہونا ہی چاہیئے تھا۔

(۲)

علامہ شبلی کی زندگی میں مختلف لوگوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ افتخار عالم مارہروی خاص طور پر اس کے بہت خواہشمند تھے انھوں نے سید صاحب کے واسطے سے سفارش کرائی کہ شبلی انھیں ان کے سوانح لکھنے کی اجازت دے دیں۔ مولانا شبلؔی نے اس کے جواب میں سید صاحب کو فروری سنہ ۱۴ء کے خط میں لکھا:۔

> "افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے۔ کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا"[2]

یہ واقعہ ہے کہ شبلؔی کی سوانح عمری لکھنے کا سب سے زیادہ حق سید سلیمان ندوی ہی کو

---

[1] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ ص ۷، (الواعظ صفدر پریس لکھنؤ)۔

[2] شبلی نعمانی: مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۰۷۔

تھا۔ ان کی زندگی کے آٹھ سال (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک) خلوت و جلوت میں شبلیؔ کے ساتھ گزرے انھوں نے ان کو ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ پھر شبلیؔ کی زندگی کے یہ آٹھ سال ان کی ۵۷ سالہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ سیّد صاحب کے پیش نظر رہی۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے اس کام کو واقعی اس وقت انجام دیا، جب دنیا کے اور کاموں سے ان کو بڑی حد تک فرصت مل گئی تھی۔ چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری اہم تصنیف ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۴۳ء اور دوسری بار ۱۹۷۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی۔ اس کی ضخامت ۸۴۶ صفحے ہے، اسی کتاب پر سیّد صاحب کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔

شبلیؔ کے سوانح لکھنے کے لئے سیّد صاحب نے متعدد ذرائع سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی اور خاندانی حالات ان کے اعزہ و احباب اور شاگردوں سے دریافت کئے۔ تعلیمی حالات خود شبلیؔ سے وقتاً فوقتاً سنتے رہے۔ قیام علی گڑھ کے حالات کا بڑا حصّہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے پرانے اوراق سے بہم پہونچایا۔ اور ان کی پوری علمی زندگی کا خاکہ ان کے مکتوبات کے مرقع میں بآسانی مل گیا۔ حیاتِ شبلی کی تالیف اور واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی دونوں جلدیں بے حد کارآمد ثابت ہوئیں۔ اسی باعث سید صاحب نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "حیاتِ شبلی درحقیقت مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ہے"[1]۔ مکاتیب کے علاوہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور میر ولایت حسین سے بھی بہت سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی۔ انھیں تمام ذرائع سے کام لے کر سیّد صاحب نے مولانا شبلی کی ضخیم سوانح عمری مرتب کی۔

سیّد صاحب "حیاتِ شبلی" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

> "خاکسار کو یہ دعوےٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصولوں پر پوری منطبق ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہوا اس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے۔ مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے بہت کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے

---

[1] سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی، پیش لفظ ص ۸ (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۴۳ء)۔

> شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے۔ اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر ہی ان کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے۔"[1]

اس کے بعد "حیات شبلی" کے متوقع منتقدین اور ان کی ہونے والی تنقیدوں کو اپنی دوررس اور پیش بیں نگاہوں میں رکھ کر رقمطراز ہیں:۔

> "نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں، اس لئے کوئی سوانح نگار اس نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہیں۔ کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بدگمانیوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں، اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیات فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں۔
>
> بہرحال شبلی، شبلی تھے۔ جنید و شبلی نہ تھے۔"[2]

میرے خیال میں سید صاحب کی اس وضاحت اور عذرخواہی کے بعد اس طوفان مخالفت اور تنقید برائے تنقید کی کوئی بنیاد نہیں تھی جس سے حیات شبلی کو دوچار ہونا پڑا، اس کتاب کا مطالعہ مذکورہ بیان کی روشنی ہی میں کرنا چاہیئے۔

حیات شبلی کی ابتداء ترتیب مواد اور معاونین کے ذکر سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ اور پھر طویل مقدمہ ہے۔ دیباچہ میں شبلی کی زندگی پر جامع تبصرہ ہے۔ اور مقدمہ میں دیار پورب اور لکھنؤ کے بعض علماء اور اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کے علمی، ثقافتی اور تاریخی حالات ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ مولانا شبلی کی ولادت، حسب نسب،

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، پیش لفظ ص ۹، ۸ (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ سنہ ۱۹۴۳ء)۔

تعلیم و تربیت اور ابتدائی مشاغل زندگی کا بیان ہے۔ پھر ۲۵ رسال کی عمر میں علی گڑھ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اور زندگی ۱۶ - ۱۶ سال کے دو ادوار پر منقسم ہو جاتی ہے، پہلا دور ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۸ء ہے۔ جو ایم۔ اے۔ او کالج کے علمی و تعلیمی کاموں اور قومی مشاغل اور تصنیفی مصروفیات روم و شام کا سفر، شمس العلماء کا خطاب، ندوہ میں شمولیت اور وظیفہ حیدرآباد وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دوسرا دور سرسید کی رحلت اور کالج سے قطع تعلق سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ اس دور میں درستی صحت، عقد ثانی، ملازمت حیدرآباد، شغل تصنیف، تحریک ندوۃ العلماء کی رہنمائی، حیدرآباد سے استعفیٰ، معتمدی دارالعلوم ندوہ اور اس کی ترقی کے لئے جدوجہد، حادثہ گزندپا، بمبئی کا قیام، ندوہ میں رفقائے کار سے اختلاف، علیحدگی، اسٹرائک، مطالبۂ اصلاح، تعلیمی و مذہبی اور قومی خدمات و مصروفیات، تالیف سیرت النبی، تاسیس دارالمصنفین اور وفات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں آل و اولاد اور اخلاق و کردار کا ذکر ہے۔

(۳)

سید صاحب نے ”حیات شبلی“ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ”نو سو صفحوں کی یہ کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی و ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔“[1] حیات شبلی کا مطالعہ کرنے کے بعد سید صاحب کے اس دعوے کی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا ہے دیباچہ میں مصنف نے شبلی کی ہمہ گیری اور جامعیت پر زور دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ وہ بیک وقت مورخ، متکلم، ادیب اور شاعر سب ہی کچھ تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم سے خواہ وہ قدیم ہو یا جدید، انھیں بہت دلچسپی تھی اور اسی باعث وہ تعلیمی اسکیموں کے بنانے، درسی نصاب کی اصلاح، عربی و فارسی کی اہمیت اور انگریزی کی ضرورت مسلمانوں کو بتانے میں انہوں نے اپنی تصانیف اور مضامین سے بہت کام لیا۔ اسی طرح اپنی تقریروں سے انھوں نے بیدار کیا،

---

[1] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی۔ ص ۸۔

اور یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے اس عہد کی سیاسی، قومی، علمی اور ادبی تاریخ بہت مبسوط و مفصل بیان کی ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو لامحالہ حیات شبلی کو اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ قرار دینا پڑے گا۔

دیباچہ کے بعد تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ ہے۔ چونکہ صاحب سوانح دیار پورب سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے سید صاحب نے اس خطّۂ ارض کے علماء و فضلاً کی مفید و دلچسپ داستان بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ تحریر کی ہے، اس کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی اس دیار میں علوم و فنون کے ارتقاء پر کام کرنے والے کا اوّلین و مستند ماخذ حیات شبلی کا یہی فاضلانہ مقدمہ ہے۔ اس میں سید صاحب نے ان مدارس اسلامیہ اور ثقافتی مراکز کا ذکر کیا ہے، جن کے دم سے علم کی شمع ان علاقوں میں روشن تھی، اسی سلسلہ میں مصنّف نے سیکڑوں کتابوں، رسالوں، کتب خانوں اور علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ حیات شبلی کے اس مقدمہ کی افادیت میں کوئی کلام نہیں لیکن بعض نقّاد اس کی طوالت کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اس پر تنقید کرتے ہیں۔ چنانچہ آل احمد سرور رقمطراز ہیں :۔

> "یہ بحث علیحدہ کتاب میں ہوتی یا مختصر طور پر آتی تو زیادہ بہتر تھا۔ حیات شبلی میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔"[1]

اسی طرح ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں :۔

> "سیّد سلیمان صاحب نے بہت سا قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے اور بزرگوں اور خانوادوں کی ایک طویل تاریخ سمو دی ہے مگر حیات شبلی کی یہی خوبی اس کا نقص بن گئی ہے۔ سوانح نگاری ایسی تمہیدوں کی متحمل نہیں ہو سکتی جو اس کے ہیرو کی شخصیت سے براہ راست متعلق نہ ہوں ان طولانی تمہیدوں کی جگہ ایک دوسری کتاب میں تھی، حیات شبلی میں نہیں۔"[2]

---

[1] آل احمد سرور: تنقیدی اشارے ص ۱۹۶ (چوتھا اڈیشن سنہ ۱۹۶۴ء)۔

[2] ڈاکٹر عبدالقیوم: تنقیدی نقوش ص ۳۳ (انٹرنیشنل پریس کراچی سنہ ۶۳ء)۔

مذکورہ بالا رایوں سے اس لئے کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ حیات شبلی کے اس مبسوط مقدمہ کی وجہ سے اس کتاب میں جو وزن اور وقار پیدا ہوا وہ اردو کی کسی اور سوانح عمری میں نہیں پایا جاتا۔ اس مقدمہ سے خطہ پورب کی جو روشن تصویر سامنے آتی ہے، اور معلومات کا جو چشمہ شیریں ابلتا ہے وہ اس کی طوالت کا احساس ہی نہیں ہونے دیتا۔

سیّد صاحب نے علامہ شبلی کو "عہد جدید کا معلّم اول" قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی اس لئے وہ قدیم و جدید کے سنگم تھے۔ جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے، اور اس لئے ان کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علمائے دین کے کارناموں سے نسبتہً مختلف ہیں۔ وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم و آرا اور خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہتے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانے کے اقتضاءات اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے، اور یہ سب گوناگوں رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں[1]۔" اپنے اس دعوے کو سیّد صاحب نے بہت شرح و بسط کے ساتھ تقریباً چالیس صفحات میں ثابت و نمایاں کیا ہے۔

لیکن پروفیسر آل احمد سرور کی رائے ہے کہ:۔

> "(شبلی) بقول مہدی تاریخ کے معلم اوّل تھے۔ انھوں نے اردو میں تاریخ کو واقعہ نگاری سے نکال کر اسے علوم کی سرحد میں داخل کیا اور فلسفہ و تاریخ کا امتزاج کیا۔ لیکن سیّد سلیمان ندوی نے انھیں عہد جدید کا معلم اول غلط لکھا ہے۔ یہ لقب سرسیّد ہی کو زیب دیتا ہے۔"[2]

جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ "حیات شبلی" پر اس قسم کی

---

[1] سیّد سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۹، ۱۰۔

[2] آل احمد سرور: تنقیدی اشارے ص ۱۹۴۔

تنقیدوں کا باعث صرف سوانح نگار کے جذبات واحساسات کی گہرائی اور اس کے پس منظر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ سیّد صاحب نے شبلی کو "عہد جدید کا معلم اوّل" قرار دیتے ہوئے اس کو جس مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے اس پر تجزیاتی تنقید کرنےکی ضرورت ہے۔ ورنہ "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" کے مصداق ہر شخص اپنی انفرادی رائے رکھنے میں مختار ہے۔

سیّد صاحب نے علامہ شبلی کے مختلف میدانوں میں اوّلیات شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مستشرقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا، وہ مولانا شبلی تھے۔ انھوں نے فارسی شاعری میں نئی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جارہا ہے اس کا سارا مواد "الفاروق" سے ماخوذ ہے۔ ہندوستان میں اتحاد کے وہ داعی اوّل تھے۔ سیاسی مسائل سے حضرات علماء کو جو دلچسپی ہے، وہ شبلی کی پکار کا نتیجہ ہے۔ اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومت کے سامنے پیش کرکے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہونچایا۔[1] تحقیق کی کسوٹی پر آنے کے بعد سیّد صاحب کی اس اوّلیات شماری میں توازن واعتدال کا فقدان ملتا ہے۔ اسلام کی نصرت وحمایت اور مخالفین کے حملوں کا دفاع کرنے میں سرسیّد، مولوی چراغ علی اور مولانا کرامت علی جونپوری کو فراموش کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر سرسیّد کی "الخطبات الاحمدیہ" تو اس موضوع پر بے نظیر اور منفرد کتاب ہے، اس لئے مستشرقین سے مقابلہ کرنا شبلی کے اوّلیات میں محسوب نہیں ہو سکتا۔ لیکن راقم سطور کا خیال ہے کہ شبلی کے اولیات کا اظہار اور ان کی فہرست شماری سے سیّد صاحب کا مقصود صرف یہ تھا کہ اس سے صاحب سوانح کی عظمت اور جلالت مرتبت کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ سوانح نگاری کے بارے میں خود شبلی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیئے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے"۔[2] حیات شبلی کے ساڑھے آٹھ سو صفحے ختم کرنے کے بعد ہر قاری کی نظر میں علامہ شبلی کی جینیس شخصیت، اس کی عظمت، علوئے شان اور کارہائے نمایاں کا ایک ایک نقش ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

"حیات شبلی" کی حسن ترتیب، مصنّف کا عالمانہ اسلوب بیان، حوالوں کی کثرت،

---

[1]، [2] سیّد سلیمان ندوی: "حیات شبلی"، ص ۱-۷، ۷۰۱۔

معلومات کی فراوانی اور شبلی کی جامع و ہمہ جہت شخصیت پر سیر حاصل تبصرہ سید صاحب کو اُردو سوانح نگاروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی حیات شبلی کو اس کے سخت سے سخت ناقد نے بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار جنھوں نے حیات شبلی پر کافی شدید نقد و جرح کی ہے، رقمطراز ہیں:۔

> "اس ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے اس کتاب کی کامیابی کا ایک سبب مصنّف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جا بجا ملتا ہے۔ "حیات شبلی" کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔"[1]

سیّد صاحب نے حیات شبلی میں اپنے محسن و مربّی اور مشفق استاذ کو پیکر حسن و جمال ثابت کرنے کے ساتھ اس کے بعض بشری نقائص کے داغ بھی دکھائے ہیں۔ جن میں "روحانیت اور تقدّس کی کمی" کو انھوں نے "سیرت شبلی" کی سب سے بڑی خامی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقیا اور مذہبی تورع اور تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا۔"[2]

اور روحانیت کی یہ کمی ان کو علّامہ شبلی کی بعض تصانیف میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ شبلی کے شاہکار "الفاروق" کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروقؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے۔"[3]

اس سلسلہ میں ہم پروفیسر ڈار کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہیں کہ سیّد صاحب کی اپنے استاذ کے بارے میں مذکورہ بالا رائے دراصل تھانہ بھون کا فیض ہے[4] جب

---

[1] محمد ابراہیم ڈار: مضامین ڈار ص ۲۴۲ (قادری پریس بمبئی)۔

[2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۶۲۸۔

[3] " " " (دیباچہ) ص ۳۲۔

[4] محمد ابراہیم ڈار: مضامین ڈار ص ۲۶۶۔

وہ آستانۂ اشرفی پر اپنی جبین انقیاد و اطاعت جھکا چکے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے شبلی میں روحانیت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے بڑے مبالغہ بلکہ اغراق سے کام لیا ہے۔ علامہ شبلی کے انتقال پر سید صاحب نے رسالہ "معارف" اگست سنہ ۱۹۱۶ء میں جو مضمون لکھا تھا اس میں اپنے استاذ کو عبدالحق دہلوی، شاہ ولی اللہ، ملّا محمود جون پوری، ملّا محب اللہ، آزاد بلگرامی اور شیخ علی متقی سے بھی برتر و بہتر قرار دیا ہے۔[1] جس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ اگر اس سے صرف شبلی کی جامعیت کا اظہار مقصود ہو تو بھی اس کے لئے یہ انداز بیان مناسب نہیں۔ شبلی کی روحانیت اور تقدس کے بارے میں سیّد صاحب کے بیانات میں تناقض و تضاد ملتا ہے۔ ان عناصر کی کمی کے بارے میں سید صاحب کی رائے اوپر مذکور ہوئی۔ لیکن اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> "خود فرائض و سنن کے سخت پابند تھے۔ اور دوسروں سے نہایت
> سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے ..... دوسرے فرائض کا بھی
> نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے۔"[2]

(۴)

مولانا حالی کی شہرۂ آفاق ادبی سوانح عمری "حیات جاوید" جب منصۂ ظہور پر آئی تو علامہ شبلی نے اس کو "کتاب المناقب" اور "مدلل مداحی" قرار دیا۔ چنانچہ وہ حبیب الرحمان شیروانی کے نام، راگست سنہ ۱۹۰۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "حیات جاوید" کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں
> اور وہ بھی غیر مکمل، خیر، وللناس فیما یعشقون مذاہب۔"[3]

اسیطرح ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کے ایک مکتوب میں ان ہی کو لکھتے ہیں:۔

> "حیات جاوید میں مولانا حالی نے سیّد صاحب کی یک رخی تصویر

---

[1] سیّد سلیمان ندوی: حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی (مضمون) رسالہ معارف اگست سنہ ۱۹۱۶ء ص ۱۳۔

[2] " " حیات شبلی ص ۸۳۷۔

[3] مکاتیب شبلی حصہ اوّل (طبع دوم) ص ۱۲۵۔

دکھائی ہے .... بہر حال میں حیات جاوید کو "مدلّل مداحی" سمجھتا ہوں"۔[1]

جب حیات شبلی شائع ہوئی تو بعض نقادوں نے خصوصاً سرسید اور مولانا حالی کے عقیدتمندوں نے اس کو بھی شبلی کے مذکورہ بالا تبصرہ کی روشنی میں مطالعہ کیا چنانچہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے حیات شبلی پر جو مبسوط تبصرہ لکھا ہے اس میں اسے بھی مدلل مداحی قرار دیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:-

> "حیات شبلی کے کتاب المناقب ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ آخر یہ کیا ضرور ہے کہ محاسن اور معائب کا توازن قائم رکھ کر ہیرو کی داستان کو "کتاب المحاسن و المساوی" بنا دیا جائے۔ حیات شبلی میں مدلّل مداحی سے کام لیا گیا ہے اور بہت سے اختلافی ونزاعی امور میں پوری قوت دلائل کے ساتھ شبلی کے طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن اس بحث میں سیّد صاحب کی حیثیت بعض اوقات محض ایک طرفدار کی سی رہ جاتی ہے اور وہ ایک کامیاب مناظر کی طرح مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہیں۔"[2]

حیات شبلی فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ گذشتہ ۳۵ سال کی مدت میں اس کو ملے جلے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر ایک طرف تحسین وآفریں کے پھول اس پر نچھاور کئے گئے ہیں تو دوسری طرف اس کو بعض نقادوں کے شدید ترین نقد وجرح کا نشانہ بھی بننا پڑا ہے۔ دراصل سیّد صاحب نے علامہ شبلی اور سرسیّد کے اختلافات کو اس رنگ میں پیش کیا ہے، جس سے علی گڑھ کے طبقہ کی ناگواری ایک فطری امر ہے۔ اور ہر قاری بادی النظر میں یہ کھٹک محسوس کرتا ہے کہ سیّد سلیمان ندوی نے سرسیّد کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ حقیقت اور انصاف کی بات یہ ہے کہ شبلی جس کارواں کے ایک رکن تھے اس کے میر کارواں سرسیّد ہی تھے

---

[1] مکاتیب شبلی حصہ اول (طبع دوم) ص ۱۳۴۔

[2] محمد ابراہیم ڈار: مضامین ڈار ص ۲۴۰۔

لیکن مصنفِ حیاتِ شبلی نے اپنے ممدوح کو سر سیّد کا مقابل ٹھہرا کر بہت سے صغریٰ وکبریٰ قائم کئے ہیں بلکہ بعض جگہ تو شبلی کو سر سیّد پر فوقیت بھی دے دی ہے۔

یہ بات تو تھی ہی۔ دوسری طرف سیّد صاحب شبلی کے بمبئی میں قیام کے دوران خاندان فیضی کی بعض خواتین سے مراسم اور ان سے خط وکتابت کی داستان سے بھی چشم پوشی کر گئے ہیں۔ ان ہی دونوں امور کو لے کر مخالفین نے "حیات شبلی" کے خلاف ایک پورا محاذ قائم کر لیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے عطیہ کے نام شبلی کے خطوط کی بنیاد پر "شبلی کی حیات معاشقہ" لکھ کر اپنے نزدیک ان کی "رنگین زندگی" کو نمایاں کیا۔ شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" اور "شبلی نامہ" میں سر سیّد کے ساتھ سیّد سلیمان ندوی کی زیادتی اور ناانصافی کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے اور منشی امین زبیری نے "ذکر شبلی" لکھ کر سیّد صاحب کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ رسالہ اردو کراچی کے تبصرہ نگار نے "ذکر شبلی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

> "مولانا سلیمان صاحب نے آندھی بوئی تھی، یہ بگولہ اس کا پھل ہے۔"

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے تبصرہ نگار رقمطراز ہے :-

> "ڈاکٹر سیّد سلیمان ندوی نے اپنے ممدوح مرحوم استاذ کی ستائش میں جہاں خوش اعتقادی سے کام لیا ہے۔ وہاں ان مرحوم کو علی گڑھ تحریک کا سخت مخالف اور سر سیّد کا حریف بھی بنانا چاہا ہے، اور اس سلسلہ میں سر سیّد کی تعریض مناقب شبلی کی تضمین ہو گئی ہے۔"[1]

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) بھی شبلی اور حیات شبلی سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اسی لئے انھوں نے خطوط شبلی بنام عطیہ حاصل کر کے ان کو منشی امین زبیری سے مرتب کرایا۔ اور مزید برآں خود اس پر ایک طویل مقدمہ لکھا جس کی ہر سطر سے شبلی کی مخالفت تراوش کرتی ہے۔ مثلاً اس کا یہ مشہور جملہ کہ "شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع

---

[1] تبصرہ ذکر شبلی : رسالہ اردو کراچی، جولائی ۱۹۴۹ء ص ۱۵۸۔

ہو گئی ہے"[1] حقیقت سے کتنا بعید ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے "حیات شبلی" کی مذکورہ بالا خامیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر یہ لکھا تھا کہ "یہ سرکاری سوانح عمری ہے"۔[2]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ شبلی نے "حیات جاوید" پر جو تنقید کی تھی وہ "حیات شبلی" پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں مصنفین نے بیش از بیش اپنے ممدوحین کی سیرت کے روشن پہلو اجاگر کئے ہیں۔ اور ان کی کمزوریوں کا برائے نام ہی ذکر کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حالی ہوں یا سید سلیمان ندوی دونوں ہی مشرقی تہذیب کے پروردہ بلکہ اس کے ان علم برداروں میں ہیں جن کے یہاں :۔

ع خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

کو زندگی کا زریں اصول قرار دیا جاتا ہے۔

آل احمد سرور نے حیات شبلی پر شیخ اکرام کی تنقید کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "اکرام نے موج کوثر میں شبلی کو سر سید کا مد مقابل ٹھہرایا ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ شبلی کی تحریک کا مقصد سر سید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اگر حیات شبلی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی"۔[3]

اپنے اسی مضمون میں سرور صاحب شبلی کی جامعیت پر نہایت جامع تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "شبلی کا اثر حالی کی طرح صرف ادب پر نہیں پڑا۔ اپنے دور میں وہ سب سے رنگین، جاذب نظر اور جامع شخصیت رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ ایک لحاظ سے سر سید سے قدیم ہیں، لیکن آخری دور کے سر سید کے مقابلہ میں زیادہ حریت پسند ہیں۔ انھوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم میں ادب کی تازگی اور شگفتگی پیدا کی۔ انھوں نے علماء کی ایک نسل کو اپنے ماضی کا تجزیہ کرنے اور حال سے فیض اٹھانے کے لئے تیار کیا۔ وہ حالی اور سر سید جیسے سادہ مزاج نہیں تھے۔ ان کی ایک عالم کی شان تھی۔ وہ دوسروں کی تعریف بھی کم کرتے تھے، مگر وہ بڑے ستھرے اور دلکش مذاق کے مالک تھے، وہ

---

[1] عبدالحق : مقدمہ خطوط شبلی مرتبہ امین زبیری ص ۲۶ (شمسی پریس آگرہ)۔

[2] [3] آل احمد سرور : تنقیدی اشارے ص ۱۵۳۔

مولویوں کی اصلاح نہ کر سکے۔ مگر نئی نسل کے مذاق پر گہرا اثر چھوڑ گئے۔ شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے"۔ [1]

رہا یہ سوال کہ حیات شبلی میں سیّد صاحب نے شبلی کی سیرت کے صرف روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ معائب و نقائص کی پردہ پوشی کی ہے۔ اور ان کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی ہے۔ کسی حد تک صحیح ہے۔ مثال کے طور پر بمبئی کے خاندان فیضی کی ممتاز خاتون عطیہ بیگم سے مولانا شبلی کے تعلقات کے ذکر کو سید صاحب نے یکسر قلم انداز کر دیا ہے، اور شبلی کی جمال پسندی، رنگین مزاجی، حسن پرستی اور جذباتیت کے مظاہر اور بمبئی کی رنگیلی صحبتوں کا بیان پسند نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ علامہ شبلی کے فضائل و کمالات اور جامعیت پر اس سے کوئی حرف نہیں آسکتا ہے۔ اگر سید صاحب حیات شبلی میں ان تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پیش کر دیتے تو شبلی کے منتقدین کے لئے رائی کا پربت بنانے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ اسی طرح سیّد صاحب کا شبلی کے اس شعر ؎

آں شد اے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

کو نقل کر کے یہ لکھنا کہ "وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس دشمن ایماں کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا۔ یعنی وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے"[2] بعید از عقل و قیاس ہے۔ مولانا حالی کا یہ خیال درست ہے کہ "دستۂ گل" کی غزلوں میں "چشم ساقی" کی مستی آمیز ہے"[3] اور "دشمن ایماں" سے شاعر کی مراد یہی ہے، نہ کہ علی گڑھ تحریک۔

بہرحال راقم سطور کا خیال ہے کہ ہمیں اس معاملہ میں سید صاحب کو معذور سمجھنا چاہیئے۔ یہ بات نہیں کہ وہ فن سوانح نگاری سے واقف نہیں تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

---

[1] آل احمد سرور: تنقیدی اشارے۔ ص ۲۰۱۔
[2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۵۲۔
[3] نامۂ حالی بنام شبلی بحوالہ حیات شبلی ص ۴۵۱۔

حیات شبلی میں وہ محض ایک سوانح نگار ہی نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ وہ ایک شفیق استاذ، اور محسن و مربّی کے محبوب و عزیز شاگرد بھی تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:۔

> "سیّد صاحب کو اپنے استاذ علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ سیرت شبلی لکھ کر سیّد صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے۔ وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب سے اتنی نہیں ہے، جتنی اس شغف کی بنا پر ہے جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق و محترم استاذ سے ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مصنّف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ بات ٹھیک ہو یا نہ ہو سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔" [1]

بایں ہمہ غائرانہ مطالعہ کرنے سے حیات شبلی میں جابجا شبلی کی بعض کمزوریوں اور نقائص کی طرف اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ان خامیوں کا تعلق شبلی کی سیرت سے بھی ہے مثلاً روحانیت اور تقدس کی کمی۔ اور شبلی کی تصانیف سے بھی ہے۔ لیکن یہ سید صاحب کے قلم کا آرٹ ہے کہ انھوں نے ان کمزوریوں کی طرف متوجہ ضرور کر دیا، مگر قاری کے ذہن کو ان سے متاثر نہیں ہونے دیا اور پھر شبلی کی شخصیت کے روشن پہلوؤں اور ان کے گوناگوں کمالات و کارناموں کو اس طرح اجاگر کیا کہ لوگوں کے ذہنوں پر شبلی کی شخصیت کا گہرا نقش قائم ہو گیا اور محاسن کے سمندر میں چند کمزوریاں خس و خاشاک کی طرح تیرنے لگیں۔ اسی باعث حیات شبلی کے معترضین بھی اپنی تمام تنقیدی جراحتوں کے باوجود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ "حیات شبلی" کی اشاعت نے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔"[2] شیخ اکرام نے بھی جن کا شمار حیات شبلی کے سخت نکتہ چینوں میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ:۔

"اگر آپ اسے کامل سوانح عمری نہ بھی سمجھیں، تب بھی حیات شبلی

---

[1] رشید احمد صدیقی: ہم نفسان رفتہ ص ۲۰۷۔ [2] عبدالقیوم: تنقیدی نقوش ص ۲۳۔

میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی
اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور دیار پورب کی کوئی
سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے اس کے احسان سے کسطرح
انکار ہو سکتا ہے۔"[1]

(۵)

حیات شبلی ایک ایسے شخص کی سوانح عمری ہے جو سب کچھ ہونے کے ساتھ بنیادی طور پر اردو کا ایک عظیم ادیب اور نقاد تھا۔ اس نے اردو زبان کو جو رفعت وعظمت، دلکشی ورعنائی اور وقار ومتانت عطا کی ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سیّد صاحب نے حیات شبلی لکھتے وقت ایک لمحہ کے لئے بھی صاحب سوانح کی اس بنیادی حیثیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور کتاب کے ہر ہر صفحہ کو ادب وانشا کی چاندنی سے معمور کر دیا ہے۔

ارباب نظر واقف ہیں کہ سیّد صاحب اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ اسلوب تحریر کے لئے ممتاز ہیں۔ ان کی تصنیفات میں عموماً ایک عالم اور محقق کا انداز بیان ملتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ادبی گلکاری اور شگفتگی بیان کے نمونے بھی قدم قدم پر جلوہ افروز ہوتے ہیں، حیات شبلی اس حیثیت سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ سید صاحب کے اسلوب نگارش کے محاسن وخصوصیات پر ایک علیحدہ باب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف حیات شبلی کے ادبی پایے کا تعین کرنا ہے۔ تاکہ ادبی سوانح عمریوں میں اس کی انفرادیت نمایاں ہو سکے۔ سید صاحب کی معلومات کی وسعت، دلائل کی منطقی ترتیب، قدرت بیان اور سنجیدگی ومتانت نے حیات شبلی کو باغ وبہار کی طرح شگفتہ وشاداب بنا دیا ہے۔ آغاز کتاب کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیں :۔

"پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے

---

[1] شیخ اکرام: شبلی نامہ ص ۱۱۔

۳۲؍ برس (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے
باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں
سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا ۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ را خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ است[1]

حیات شبلی میں سید صاحب کے بعض چھوٹے چھوٹے جملے دل آویزی اور تاثیر کے اعتبار سے بلاغت کے بڑے اچھے نمونے ہیں۔ مثلاً مفتی عنایت احمد کے بارے میں جنھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کے بعد بغاوت کے الزام میں انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔ **سید صاحب** لکھتے ہیں :۔

> " مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں
> اسی طرح ابلتا رہا"۔[2]

بمبئی اور "دستۂ گل" کے پس منظر کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

> " میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا۔
> دستۂ گل کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا۔ دستۂ گل
> کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں۔ ؎
>
> نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را
>
> مولانا کو ۱۹؍ برس بعد غزل کا کوچہ یاد آیا"۔[3]

شبلی کی طرح سید صاحب کے یہاں بھی طنز و تعریض موجود ہے اور بعض مواقع پر ان کا قلم تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ حیات شبلی میں بھی اس کی بعض بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً مولانا اسلم جیراجپوری کی کتاب تاریخ الامت کو ایک عربی کتاب کا ترجمہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> " آخر اس (جرجی زیدان) کے بجائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے
> جن کے تاریخی لیکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامت

---

[1] [2] [3] سید سلیمان ندوی : حیات شبلی ص ۱، ۳۰۰، ۱۵۸۔

کے نام سے روشناس ہیں۔"[1]

"حیات شبلی" میں سید صاحب کے اسلوب نگارش سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عربی الفاظ، عربی قواعد کی پابندی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ یہ روش اب متروک ہو چکی ہے اور عربی الفاظ اب اردو قواعد کے مطابق استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ سید صاحب کے یہاں فرق باطلہ، سنت سنیہ، حیات مبارکہ، باقیات صالحات، خاتمۂ دوراں جدۂ ماجدہ، احقاق حق اور ازہاق باطل وغیرہ قسم کی بوجھل تراکیب کثرت سے ملتی ہیں۔

---

[1] ایضاً۔

یادِ رفتگاں

سنہ ۱۹۱۴ء کے اواخر میں علامہ شبلی نعمانی کے سانحۂ ارتحال پر سید سلیمان ندوی نے اپنے واردات رنج و الم کو جہاں شعری جامہ پہنا کر بڑا دلدوز "نوحۂ استاذ" لکھا وہیں نثر میں بھی اس سوز و گداز سے بھرے ہوئے دل نے عقیدت کے آنسو پیش کئے۔ یہ مضمون اسی زمانہ میں پہلے اخبار "زمیندار" لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔ اور پھر رسالہ "معارف" کے اجراء کے بعد اس میں دوبارہ شائع ہوا۔ اس وقت سید صاحب کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہا ہوگا کہ استاذ کی وفات پر لکھا گیا یہ منثور مرثیہ ایک مستقل سلسلۂ وفیات کا نقطۂ آغاز اور پیش نظر کتاب کا سنگ بنیاد ثابت ہوگا۔ مگر پھر معارف کے شذرات ہر اہم شخصیت پر آنسو بہانے کے لئے وقف ہوگئے اور بالآخر اس نے وفیات کا ایک مستقل عنوان اختیار کر لیا۔ سنہ ۱۴ء سے لے کر اپنی وفات سنہ ۵۳ء سے کچھ پہلے تک سید صاحب کی درد بھری داستان غم سنانے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پیش نظر کتاب "یادِ رفتگاں" ان ہی نثری مرثیوں یا ماتمی مضامین کا مجموعہ ہے، جسے سید صاحب نے کراچی کے زمانہ قیام میں اپنی حیات ہی میں مرتب کر لیا تھا، مگر ان کی وفات کے چند سال بعد سنہ ۵۵ء میں ان کے خویش سید ابو عاصم ایڈوکیٹ نے مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع کیا۔ یہ کتاب ۵۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سنین کی ترتیب سے ۱۳۵ شخصیتوں کی وفات پر نقوش غم اور قلبی تاثرات صفحۂ قرطاس پر مرتسم کئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مضامین میں سید صاحب نے اپنے قلب و جگر کے ٹکڑے بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ ان کے چہل سالہ آنسو ہیں جو قطرہ قطرہ گر کر سمندر کی شکل میں جمع ہو کر عبرت کا ایک مرقع بن گئے ہیں۔

"یادِ رفتگاں" میں جن شخصیتوں کی وفات پر مجلس ماتم برپا کی گئی ہے ان کا دائرہ اعزہ و احباب، علماء و فضلا، ادباء و شعراء، ارباب سیاست اور اصحاب کمال سب کو محیط ہے

اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، عیسائی بھی ہیں یہودی بھی، ہندوستانی بھی ہیں انگریز بھی۔ مصری بھی ہیں اور ترکی بھی۔ اسی طرح اس میں جج بھی ہیں اور بیرسٹر بھی، ملّا بھی ہیں اور مسٹر بھی۔ پیر بھی ہیں اور فقیر بھی۔ شاعر بھی ہیں اور خطیب بھی۔ گوشہ نشین و گمنام بھی ہیں اور نامور مشاہیر بھی۔ غرض یہ کتاب رنگا رنگ پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہے۔

بلاشبہ ان مضامین سے علم، ادب اور تاریخ میں ایک خاص باب کا اضافہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو ادب میں معاصر شخصیتوں سے متعلق نقوش و تاثرات اور واردات و تجربات کے اظہار نے اب ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جسے خاکہ نگاری کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی "ہم عصر"، "چراغ حسن" حسرت کی "مردم دیدہ"، رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" رئیس احمد جعفری کی "دید و شنید"، اشرف صبوحی کی "دلّی کی عجیب ہستیاں"، ضیاءالدین برنی کی "عظمت رفتہ"، شاہد احمد دہلوی کی "گنجینۂ گوہر"، مالک رام کی "وہ صورتیں الٰہی"، مولانا ابوالحسن علی کی "پرانے چراغ"، عنوان چشتی کی "عکس و شخص" اور شمیم احمد کی "چند تصویر بتاں" وغیرہ نے اس فن میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں نہ صرف اردو ادب وانشا بلکہ عالمی لٹریچر کے بہترین نمونوں میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

پیش نظر کتاب "یادِ رفتگاں" بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ بلکہ بعض حیثیتوں سے ان تمام پر فائق و ممتاز ہے۔ اس میں خود مصنف کی شخصیت کے بنیادی امتیازات ہر صفحہ پر قوس و قزح کی طرح بہار دکھاتے ہیں۔ راقم سطور کے نزدیک ان وفیاتی مضامین کی سب سے زیادہ نمایاں حیثیت تاریخی اور ادبی ہے۔ ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ لکھنے والوں کو اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ تحریک خلافت، ترک موالات، کانگریس اور مسلم لیگ کی سرگرمیوں کی تفصیل اس کتاب میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اور وہ بھی شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ وچشیدہ۔ اس لئے اس کا پایۂ استناد ہر شک وشبہ سے بالا ہے۔ مزید برآں اس عہد کی نامور شخصیتوں کے حقیقی خط وخال اس آئینہ میں صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ خود سید صاحب کے نزدیک بھی ان اوراق کی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں

> بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے۔ تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔" [1]

مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی سید صاحب کی ان ماتمی تحریروں کی اثر آفرینی، ادبیت اور اہمیت کا بڑا احساس تھا۔ اپنے ایک مضمون میں وہ رقمطراز ہیں:۔

> "سیّد صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پائے اور ان کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصّے میں آئے۔" [2]

اس کتاب کو سید سلیمان ندوی کی ارضی زندگی کا نچوڑ بھی کہہ سکتے ہیں، ان نقوشِ غم کی تہ میں مصنّف کے رقیق قلب، شرافت طبع، محبوب دل اور مفکر دماغ کی آہٹیں صاف سنی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اوراق ادب وانشا کے انمول جواہر پارے اور سید صاحب کی سحر آفریں انشا اور کمال تحریر کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ خاص طور پر اس مجموعہ میں شامل مضامین "محمد علی"، "اقبال" اور "حکیم اجمل خاں" کا مرتبہ اردو ادب میں بہت بلند ہے۔

"یادِ رفتگاں" کی روشنی میں سید صاحب کے طرزِ تحریر کے ارتقائی منازل بآسانی متعین کئے جا سکتے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات قائم کرنے میں بھی سید صاحب نے جدت آفرینی اور ندرت طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اکثر اس عنوان ہی سے زیر تحریر شخصیت کے امتیازی وصف کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کی چند مثالوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

حاتم یوپی کی وفات	(نواب مزمل اللہ خاں)
ایک مجاہد کا ماتم	(مولانا عرفان خاں سکریٹری مجلس خلافت)
بہادر مسلمان کی وفات	(نواب بہادر یار جنگ)
فراق مجذوب	(خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب)

---

[1] سیّد سلیمان ندوی: بحوالہ مقدمہ یادِ رفتگاں ص ۵۔

[2] عبدالماجد دریابادی: نقوش سلیمانی (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۳۹۔

درویش شاعر	(استاذ جلیل مانکپوری)
ماتم گسار برامکہ کا ماتم	(عبدالرزاق کانپوری)
واحسرتا!	(حسرت موہانی)
فقیہ الامت	(مفتی کفایت اللہ دہلوی)
الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن	(مولانا حمید الدین فراہی)
خادمۂ ملت و مخدومۂ امت کا ماتم	(والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم)
غم اکبر!	(اکبر الہ آبادی)
ہماری جماعت کا لعل شب چراغ گم ہوگیا	(عبدالرحمان نگرامی)

"یادِ رفتگاں" میں سید صاحب نے جن احباب اور اکابر عصر کی یاد میں آنسو بہائے ہیں ان میں حسب ذیل نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔ علامہ شبلی، رفیقۂ حیات، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مہدی افادی، عبدالحلیم شرر، شاد عظیم آبادی، وحید الدین سلیم، سرآتوش مکرجی، پروفیسر آرنلڈ، شیخ عبدالعزیز شاویش (مصری) جالب دہلوی، مولانا حمید الدین فراہی، میر ناصر علی، صلاح الدین خدا بخش، رشید رضا مصری، مارما ڈیوک پکتھال، پریم چند، مصطفےٰ کمال اتاترک، پروفیسر مارگولیتھ، مہاراجہ سر کشن پرشاد، دیا نرائن نگم، سجاد حیدر یلدرم، محفوظ علی بدایونی، مولوی عنایت اللہ، نواب بہادر یار جنگ، محمد علی جناح، شیخ عبدالقادر، شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، نور الحسن نیّر، پروفیسر باور، مفتی انوار الحق، خواجہ عبدالرؤف عشرت، مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار لاہور)

بعض اصحاب کمال کے حالات قلمبند کرنے میں سید صاحب پر بڑی سوگواری، رقت اور غمناکی کی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ان کے خامۂ عنبریں سے ادب و انشا کے گوہر آبدار وجود میں آگئے ہیں۔ ہر سطر بلکہ ہر جملہ میں اثر آفرینی کی پسی ہوئی بجلیاں پنہاں ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کی موت پر نہایت سوگوار لب و لہجہ میں رقمطراز ہیں:۔

"وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا،

> آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے دھن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پرپرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہیگا امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرش الٰہی کے سائے میں ہوگا۔ اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے ...... مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیام لایا تھا۔ وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار اور تجدید کا طلب گار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا۔ اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں"۔ [1]

مولانا محمد علی کا اندوہ گیں ماتم آج بھی پڑھنے والے پر رقت طاری کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب خود رو رہے ہیں اور دوسروں کو رلا رہے ہیں، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "تو ملت کا عزادار تھا، حق یہ ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا۔ فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا۔ سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم کناں، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں،

---

[1] سید سلیمان ندوی: یادرفتگاں ص ۲۰۹۔

> انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اوّلین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔" [۱]

اپنے مرشد مولانا اشرف علی کے سانحۂ ارتحال پر ان الفاظ میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:۔

> "جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں۔ جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق، مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا۔ جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی۔ جس کے قلم نے فقہ و تصوّف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکومت ربّانی کو برملا فاش کیا تھا۔ اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا۔" [۲]

ان ماتمی مضامین کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ سید صاحب عام روش کے مطابق اختتام پر محض دعائیہ کلمات پر اپنے تاثرات کو ختم نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں جن سے حزن و یاس کا ایک گہرا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اکبر الہ آبادی کا ماتم ان فقروں پر ختم ہوتا ہے:۔

> "بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوئی اور تجھے مسرّت جاوید نصیب ہوئی۔" [۳]

---

[۱] [۲] [۳] سید سلیمان ندوی: یادرفتگاں ص ۱۵۵، ۲۸۴، ۴۲۔

علامہ اقبال کا ماتم ان الفاظ پر ختم کیا ہے:۔

> "اقبال، ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروانِ ملت کا رہنما اقبال!! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک ورحمته إلى يوم التلاق" [۱]

حسرت موہانی کے غم فرقت کے افسانے پر ان الفاظ میں مہر تمت لگاتے ہیں:۔

> "حسرت! رخصت، تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا۔ البتہ تیری نیکی، شرافت، تیرا اخلاص اور تیرے حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں۔ اور وہی تیرے رفیق آخرت بھی۔ بارِ الٰہا! اس کی حق گوئی کی بے کسی کی شرم رکھ لیجئے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیئے۔ وانت الرفيق الأعلى" [۲]

مؤثر اختتامیہ کی طرح سید صاحب ان مضامین کا آغاز بھی ایسے انداز و الفاظ میں کرتے ہیں کہ پورا ماحول سوگوار اور ماتمی ہو جاتا ہے۔ مثلاً "فرنگی محل کی آخری شمع بجھ گئی" کے عنوان سے مولانا عبدالباری کے وفیات کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

> "دریغا کہ آج قلم کو اس مجسمہ علم و اخلاص کا ماتم کرنا ہے جس کے وصف و مدح کا فرض اس کو بارہا ادا کرنا پڑا ہے۔ دار العلم والعمل فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل و کمال، ایمان و معرفت اور زہد و ورع کی جو آخری شمع جل رہی تھی وہ ۱۹-۲۰ کی درمیانی شب میں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔" [۳]

مولانا تھانوی کے ماتم کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> "محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر، جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر ۸۲ سال تین

---

[۱] [۲] [۳] سید سلیمان ندوی: یادِ رفتگاں ص ۲۱۱، ۴۹۶، ۵۷۔

ماہ دس روز جل کر ۱۵ر رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا ؎

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"[1]

سید سلیمان ندوی نے "یادِ رفتگاں" میں زیرِ تحریر شخصیت کے فنی پہلوؤں، اور علمی کمالات یا دوسرے کارناموں سے زیادہ محاسن شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ مصنّف خود شرافت و مروّت کا پیکر اور حسن خلق و پاک طینتی کا مجسّمہ تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے ممدوحین کے عیبوں کی جستجو نہیں کی یا بہت کم کی ہے۔ انھوں نے بعض مضامین میں ایسی فنکارانہ چابکدستی سے کردار نگاری کی ہے کہ شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت کے خط و خال اور کردار کے محاسن کو اس جامعیت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں:۔

> " ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ کے مشاغل تھے۔ ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین و ملّت کی راہ میں ان کا جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہمرنگ شہداء تھا۔ ذاتی اخلاق، جود و سخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی ان کے اوصاف گرانمایہ تھے۔ وہ بےکسوں کے ملجا، مسافروں کے ماوئی اور تنگدستوں کے دستگیر تھے۔ عبادت گذار، شب زندہ دار اور حق کے طلبگار تھے۔"[2]

نواب بہادر یار جنگ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ملاحظہ ہوں:۔

> " ارادے کے پکے، بات کے دھنی، مخلص، وفادار، خدا ترس، عاشقِ رسول، مجاہدِ اسلام، بہادر مسلمان، سپاہی اور ہر معنی

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: یاد رفتگاں ص ۲۸۳، ۵۸۔

میں سپاہی، بہادر، پٹھان اور بہادر مسلمان"۔ [1]

حسرت موہانی کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو۔ سیاسیات اور قید و بند کے خارزار کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہو سکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں"۔ [2]

پیش نظر تاثراتی تحریروں میں سید صاحب کی تنقیدی بصیرت اور سخن سنجی کے جلوے بھی جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ مثلاً اکبر الہ آبادی کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> "اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکہ لگاتا ہو۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا۔ سرسیّد کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ہندوستان تمدّن جدید کے حسن منظر پر والہ و شیدا تھا۔ لیکن صرف ایک اکبر کی زبان تھی جو برملا اس کے عیوب و نقائص واشگاف کرتی رہی"۔ [3]

منشی پریم چند کے متعلق لکھتے ہیں:۔

> "ان کے قلم نے کم از کم ۵۲ ؍ برس تک اپنے دیہاتی بھائیوں کی کہانی اپنے شہری بھائیوں کو سنائی۔ وہ زبان کے پرجوش، فصیح و بلیغ نہ تھے۔ ان کی عبارت تکلف و بناوٹ سے پاک اور حد درجہ

---

[1] سید سلیمان ندوی: یادِ رفتگاں ص ۳۳۴،

[2] " " : " " ۴۹۵۔

[3] " " : " " ۴۲۔

> سادہ تھی۔ ان کی کہانیوں کا اثر ان کی زبان میں نہ تھا بلکہ ان کے بیان میں تھا۔ انھوں نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع و آداب اور ہندی اخلاق آن بان کی جو تصویریں کھینچی ہیں وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔"[1]

استاذ جلیل مانکپوری کے رنگ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "شاعری کے جو اوصاف اور خصوصیات امیرؔ میں تھے وہی جلیلؔ میں تھے۔ مرآۃ الغیب کا پرانا رنگ اور صنم خانہ عشق کا نیا رنگ جلیلؔ کے قدیم و جدید کلام میں نمایاں ہے۔ استاذ کا اتنا صحیح تتبع امیرؔ کے تلامذہ میں کم کسی کو نصیب ہوا۔ جلیلؔ کی شاعری کے خاص خصوصیات کلام کی فصاحت، زبان کی صحت، محاورات کی پیروی، بندش کی چستی، فن کے اصول و فروع کی پوری پابندی اور جملہ کلام کا حشو و زوائد سے یکسر پاک ہونا ہے۔"[2]

المختصر "یادِ رفتگاں" کے مضامین میں سید صاحب کی نثر نگاری اپنے عروج کمال پر نظر آتی ہے۔ یہ نثر پارے دراصل شعر منثور کہلانے کے مستحق ہیں۔ جا بجا نگینے کی طرح جڑے ہوئے اردو، فارسی، اور عربی کے برمحل اشعار نے اسلوب میں تاثیر و زندگی کی روح پھونک دی ہے ان مضامین سے اکابر رجال عصر کے سنین ولادت و وفات اور تاریخ ہند کے بہت سے اہم حوادث و وقائع کی تاریخوں کی تعین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اردو ادب کے عہد بعہد تغیر پذیر میلانات سمت اور رفتار، علمی اکتسابات اور سماجی و تہذیبی قدروں کے عروج و زوال پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ "یادِ رفتگاں" اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک

---

[1] سید سلیمان ندوی: یادِ رفتگاں ص ۱۰۲۔

[2] " " " : " " ۳۷۹۔

گرانقدر اضافہ ہے۔ اور صرف یہ کتاب ہی سید صاحب کو اردو کے بہترین انشا پردازوں کی صف پیشیں میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

بابِ چہارم

مکاتیب

خط اپنی بنیادی غرض و غایت کے اعتبار سے ایک کاروباری چیز ہے۔ مگر ذہن انسانی نے اس کو تہذیب و تکمیل کے اس درجہ پر پہونچا دیا ہے کہ یہ ادب کی بارگاہ میں بار پاکر بذات خود ایک مستقل فن اور صنف ادب کا درجہ اختیار کرگیا ہے۔ بلکہ اپنے خاص احاطہ سے بلند تر اور وسیع تر ہو کر اس کے بہترین حصّوں نے ادب عالیہ کا مقام بھی حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ ادب کی تاریخ میں اعلیٰ خط بھی ادبی شاہکاروں کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں[1]۔ یہ حقیقت ہے کہ تحریر و نگارش کے تمام ذخیروں میں صرف خطوط نگاری ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں تکلف و تصنع کے اختلاط و آمیزش کی کم سے کم گنجائش ہوتی ہے" خطوط و مکاتیب کا سرمایہ ہر زبان کے ادبیات میں بڑا ہی گرانقدر اور بیش قیمت سمجھا جاتا ہے اور" اس بر عظیم کی گوہر باریوں نے خود ہماری زبان کے دامن میں بھی متاع شہوار فراہم کردی ہے"[2]۔ ڈاکٹر شجاعت علی خطوط کی گوناگوں اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

> " فنکار کی شخصیت جس طرح اس کے خطوط میں بے نقاب ہو جاتی ہے کسی اور صنف ادب میں ممکن نہیں۔ خطوط اس کی شخصیت کا آئینہ بھی ہوتے ہیں اور اکسرے بھی۔ بلکہ آئینہ اور اکسرے بھی جن باتوں کو پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں خطوط ان کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ آئینہ زیادہ سے زیادہ ظاہری شکل و صورت کا عکس پیش کر دیتا ہے' اور اکسرے اندرونی ساخت کا۔ لیکن جذبات و احساسات، شمائل و خصائل اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات

---

[1] سید عبداللہ : اردو خطا نگاری، نقوش مکاتیب نمبر جلد اوّل ص ۲۴۔

[2] غلام رسول مہر: علم و ادب میں خطوط کا درجہ، نقوش مکاتیب نمبر جلد اوّل ص ۱۲۔

> کی عکاسی ان کے بس کی نہیں۔ خطوط میں فنکار کی ظاہری و باطنی تمام باتوں کا عکس آجاتا ہے۔ اسی لیے خطوط کو ادب العالیہ میں سب سے بہتر تسلیم کیا جاتا ہے۔"[1]

خطوط میں مکتوب نگار کے باطنی اور اندرونی جذبات کے نقش و نگار ابھرتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر صاحب تحریر کا مذاق، مزاج اور رجحان معلوم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ خط لکھنے والے کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ اس کی یہ تحریر کبھی معرض تشہیر میں آجائیگی خطوط کی جان بے ساختگی اور برجستگی ہوتی ہے، جن میں یہ خصوصیات نہ ہوں وہ یقیناً غور وخوض اور فکر و تامل سے لکھے جاتے ہیں۔ اردو کے اچھے انشاپرداز مہدی افادی نے مکاتیب کی ادبی اہمیت پر نہایت جامع روشنی ڈالی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:-

> "نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا۔ یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لٹریچر کا ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والوں کے مرتبہ انشاپردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔"[2]

بعض اوقات مکتوب الیہ ایسے افراد ہوتے ہیں جو مکتوب نگار کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہیں اور جن پر مکمل اعتماد ہوتا ہے کہ معاملہ ان ہی تک محدود رہے گا اور راز فاش نہ ہو سکے گا۔ اس لئے مکتوب نگار کبھی کبھی نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ وہ باتیں بھی لکھ دیتا ہے، جنھیں نہ تو وہ کبھی زبان پر لاتا اور نہ سپرد قلم کرتا۔ اسی لیے کسی نے خطوط کو سوانح نگاری کی جان قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ان کے ذریعہ مکتوب نگار کی زندگی، ماحول اور اس کی انشاپردازی اور اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نیز اس کے ذہنی ارتقاء کی پوری کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق "خطوط سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ

---

[1] شجاعت علی: تعارف جگر کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام (نظامی پریس لکھنؤ سنہ ۶۵ء)۔

[2] مہدی افادی: بحوالہ اردو خطوط ص ۹۔ نیا دور غالب نمبر فروری سنہ ۶۹ء ص ۱۴۸۔

ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔[1] مزید برآں خطوط اپنے عہد کے تاریخی معلومات اور نتائج کے لئے بھی ایک مستند ذخیرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ احسن مارہروی "انشائے داغ" پر مقدمہ سپرد قلم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> "اگر ہم کسی نامور کی ذاتی شوخی، سنجیدگی، متانت، ظرافت، ثقاہت، خوش مزاجی، شگفتہ طبعی، برہمی، عجز و انکسار، غضبنا کی، خشونت و یبوست اور دوسری حسیّات کی صحیح جانچ پڑتال کرنی چاہیں..... تو اس کے لئے خطوط کے علاوہ کوئی تصنیف و تالیف کام نہیں آسکتی۔"[2]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مکتوب نگاری ایک بہت ہی نازک فن ہے، اسے کاریگری بھی کہا گیا ہے اور آئینہ سازی بھی۔ خطوط کی دنیا مختصر و محدود ہونے کے باوصف آفاقیت اور اجتماعیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں دانش و بینش دونوں کا سامان موجود ہے، یہ کاتب کے لئے تو محض ایک عرض سخن ہے مگر قاری کے لئے بسا اوقات گنجینۂ فن ثابت ہوتا ہے۔ غرض خط ایک جہان راز ہے، جس کے راز اگر سربستہ رہیں تو سینوں کو گہرہائے معنی کے دفینے بنا دیں اور آشکار ہو جائیں تو جذبہ کی ساری دنیا مشک زار ہو جائے۔[3]

(۲)

اردو میں مراسلہ نگاری کی روایت فارسی سے آئی۔ وہی آداب و القاب، وہی سرنامے، وہی افتتاحیے اور وہی "محمد شاہی طرز" کا رنگ انشا جو کثرت الفاظ، توالی مترادفات مقفی عبارات اور صنائع و بدائع سے گرانبار ہوتا تھا۔ فارسی میں ابوالفضل، اورنگ زیب عالمگیر، برہمن، اور پھر عہد آخر میں صہبائی، مومنؔ اور غالبؔ کے خطوط و رقعات اپنے منفرد

---

[1] عبدالحق: مکتوبات حالی اوّل ص ۱۵ (حالی پریس پانی پت ۱۹۲۵ء)

[2] سید عبداللہ: اردو خط نگاری، نقوش مکاتیب نمبر جلد اوّل ص ۲۴۔

[3] 〃 : 〃 〃 〃 〃 -

رنگ و آہنگ کے لئے مشہور رہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری غالبؔ سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن غالبؔ نے یہ نغمہ اس لے میں چھیڑا کہ اس کے سامنے تمام آوازیں دب کر رہ گئیں، شروع میں انھوں نے بھی اردو میں نامہ نگاری کو ننگ و عار سمجھا، لیکن پھر جب "پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت" ان میں نہ رہی تو مجبوراً ۱۸۴۸ء کے قریب اسی "بے رنگ" زبان میں خط نگاری شروع کی۔ جن اردو خطوط کو مرزا اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے، وہی اب ان کے ایوان شہرت کے مضبوط ترین ستون اور ان کے تاج مقبولیت کے آبدار ہیں۔ [1]

دراصل غالبؔ کے خطوط کی اہمیت و عظمت کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے، بہت سے محاسن نے مل کر ان کے خطوط کے مرتبہ کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اردو خطوط نگاری کی دنیا میں غالبؔ جیسا بلند و بالا شخص کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ان کے خطوط بے پناہ خلوص کے مظہر، تکلّف سے برتر، تصنع سے بے نیاز اور مبالغہ سے پاک ہیں۔ انھوں نے زندگی کے صد رنگ جلوؤں کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اپنی اعلیٰ فنکاری سے ہو بہو ان کی تصویر کھینچ دی ہے، غالبؔ کے خطوط میں اسلوب کا تیکھا پن، جدت و ندرت، شوخی تحریر، خوش طبعی، سنجیدگی، گہرائی و گیرائی سب کچھ ہے۔ بلا شبہہ انھوں نے اردو نثر کو ایک پائندہ اور بدیع طرز نگارش سے آشنا کیا۔ انھوں نے مراسلہ میں مکالمہ کا لطف و بے تکلفی پیدا کر دی۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو غالبؔ کے خطوط میں نصف ملاقات سے آگے بڑھ کر پوری ملاقات کا لطف پیدا کر دیتی ہے اور انھیں کاروباری بننے سے بچا کر ادب کی قلمرو میں داخل کر لیتی ہے۔ [2]

غالبؔ کے خطوط کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خطوط کے مجموعوں کا تانتا بندھ گیا، اور خطوط نویسی اردو ادب کا ایک مستقل فن بن گئی۔ بہت سے مشاہیر ادب نے ادب کی

---

[1] رئیس مینائی: غالب خطوط کے آئینہ میں (مضمون) مشمولہ نیا دور غالب نمبر ص ۱۴۸۔

[2] عبدالقوی دسنوی: مطالعہ خطوط غالب ص ۱۷۔

[3] عبدالقوی دسنوی: "مولانا ابوالکلام کی خط نگاری" سات تحریریں ص ۱۰ (۱۹۷۶ء)۔

اس صنف کو فروغ دیا اور اسے نئے تقاضوں اور نئے ادبی شعور سے ہم آہنگ کیا، ان میں سرسید، حالی، محسن الملک، شبلی، امیر مینائی، داغ، ریاض، اکبر، مہدی، اقبال، شاد عافی، محمد علی جوہر، پریم چند، عبدالحق، ابوالکلام اور سید سلیمان ندوی کے خطوط ذوق شناسان اُدب کی ضیافت طبع کے لئے طبع ہو کر منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ سرسید نے اردو خطوط نگاری میں مدعا نگاری، مقصدیت، مضمون کی قطعیت، زبان کی سادگی اور تخاطب کا خلوص پیدا کیا۔ یہی تمام خصوصیات ان کے عہد کے تمام ذخیرۂ مکاتیب میں پائی جاتی ہیں۔

شبلی اور حالی کے خطوط اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ خاص طور پر شبلی کے مکاتیب اپنی تازگی، طرفگی، ندرت، ایجاز اور اپنے سخن گسترانہ انداز کے باعث مستقل قدر و قیمت کے مالک ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:۔

> "شبلی کا ہر خط ایک زعفران کا پھول ہے، جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہے...... ایجاز یوں بھی شبلی کی تحریر کا خاصہ ہے، مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے، اسے جان اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔"[1]

شبلی کے خط کا شاید ایک لفظ بھی بیکار اور بے ضرورت نہیں، جچا تلا، ضروری ضروری۔ مگر اس میں عجب طرح کی تاثیر ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی چبھتے ہوئے فقرے سے، ایک ہی مصرعے سے، ایک ہی استعارے یا ترکیب سے، ایک ہی طنزیہ چھیڑ سے، اپنے خط کو لذتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔ حالی کے خطوط بھی ان کی سادہ و متوازن شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ خوش مذاقی اور مدعا نگاری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط دلچسپ بھی ہیں اور مختصر بھی، مگر ان میں وہ شگفتگی مفقود ہے، جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

پہلی عالمی جنگ (سنہ ۱۹۱۴ء) کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء تک متنوع انقلابات و تغیرات نے دنیائے ادب پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ چنانچہ اس عہد کے اکابر خطوط نگاروں میں مہدی،

---

[1] سید عبداللہ: اردو خطوط، نقوش مکاتیب نمبر جلد اول ص ۲۹۔

ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی اور رشید احمد صدیقی کے نام مختلف حیثیتوں سے اہم ہیں۔ مہدی افادی ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص قسم کا البیلا پن تھا۔ مہدی کے حسن انشا کی چاندنی ان کے مضامین کی طرح خطوط میں بھی بکھری نظر آتی ہے۔ بقول عبدالماجد دریابادی "ارباب ذوق کے لئے ان کے مضامین سے بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط ہوتے تھے۔ ایک ایک سطر ادب و انشا کی جان ہوتی تھی"[۱]۔ ابوالکلام آزاد کے منفرد اسلوب نے اردو مکتوب نگاری کو خصوصیت کے ساتھ بہت متاثر کیا ہے۔ الہلال کی نثر کے انداز ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہیں۔ وہی جوش و قوت، کہیں سادگی کہیں اغلاق، اختراع و ایجاد، عربیت، فاضلانہ طرز تخاطب، عربی اشعار کی کثرت، جذباتی خطیبانہ انداز، ہیجانی طرز بیان، نثر کی شعریت، خیال کی رنگینی، غرض رنگِ ابوالکلام کی ساری سحر طرازیاں ان کے مکاتیب میں موجود ہیں، مولوی عبدالحق زود نگار، مدعا نویس اور بلیغ خط نگار کی حیثیت سے ایک منفرد شخص ہیں۔ سادگی و بلاغت اور بے تکلفی کے لحاظ سے ان کا ہر خط ایک ادب پارہ ہے۔ اقبال کے خطوط علمی اور سیاسی افکار کے مخزن ہیں۔ نیاز فتح پوری نے غالب اور ابوالکلام کے رنگ میں خطوط لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ادبی مسلک کے اعتبار سے رنگین نگار ہیں۔ وہ خطوط میں صاف گوئی کے معتقد ہیں۔

سید سلیمان ندوی کے خطوط اپنی نکتہ آفرینی کے لئے اور عبدالماجد دریابادی کے خط اپنی ادیبانہ شان کے لئے خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ سید صاحب کے خطوط عبدالماجد صاحب کے مقابلہ میں زیادہ فرحت افزا ہیں۔ ان کی توجہ اپنے مکتوب الیہ پر مرکوز رہتی ہے اس کے برخلاف ماجد صاحب خود پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کے ہاں کبھی کبھی تلخی و جھنجھلاہٹ بھی آجاتی ہے۔

سنہ ۳۶ء کے بعد ملک میں حقیقت نگاری اور نفسیات کے مطالعہ کے ذوق کی وجہ سے خطوط میں واقعیت کا لحاظ رکھا جانے لگا۔ اس دوران خطوط کے بعض اچھے مجموعے

---

[۱] عبدالماجد دریابادی: ہمدم نومبر سنہ ۲۱ء بحوالہ نقوش سلیمانی ص ۲۸۳۔

شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً روح مکاتیب (ساغر نظامی) اور ہم عصر شعراء کے خطوط (ضیاء الاسلام) ان دونوں مجموعوں میں جوشؔ، فراقؔ، جگرؔ، سیمابؔ، حفیظؔ، آزاد انصاری، تاجورؔ نجیب آبادی اور دل شاہجہاں پوری کے اس عہد کی ممتاز علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں رسالہ نقوش (لاہور) نے بھی اپنے روایتی انداز کے مکاتیب نمبر (۲ جلد) اور خطوط نمبر کے نام سے تین ضخیم مجلدات شائع کیے جن میں سیکڑوں مشاہیر اہل علم و ادب کے ہزاروں نادر و نایاب خطوط کا خزانہ محفوظ ہے۔

دورِ جدید میں نقوشِ زنداں (سید سجاد ظہیر) "حرف آشنا" اور "زیرِ لب" (صفیہ اختر) عزیزم کے نام، گویا دبستان کھل گیا (چودھری محمد علی) "پردیسی کے خطوط" (مجنوں گورکھپوری) مکاتیب جگر اور سید سلیمان ندوی کے متعدد مجموعہ مکاتیب شائع ہوئے۔ یہ خطوط اپنے کاتبوں کی شخصیت کے آئینہ دار اور مختلف سوانحی، سماجی، علمی اور تاریخی حیثیت سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی روشنی میں معاصر عہد کے تاریخی، سماجی اور ادبی حالات مدوّن کیے جا سکتے ہیں۔

(۳)

سید سلیمان ندوی کے خطوط کے اب تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں:-

برید فرنگ، مکاتیب سلیمان، مکتوباتِ سلیمانی

ذیل میں ہر ایک کا تفصیلی تعارف اور جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

سیّد صاحب نے کراچی کے زمانہ قیام میں مکتبۃ الشرق کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا تھا اور اس سے انھوں نے اپنی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا "برید فرنگ" اسی سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ خطوط سنہ ۵۲ء میں مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی سے شائع ہوا۔ یہ ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو سید سلیمان ندوی نے سنہ ۱۹۲۰ء کے وفد خلافت کے سفر میں یورپ سے اپنے احباب کو ہندوستان میں لکھے تھے، ان خطوط

میں اس وفد کی کارگزاریوں اور سید صاحب کی سیاسی، علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی پوری روداد درج ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کا اشہب قلم نہ صرف مذہبی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر جولانی دکھاتا تھا بلکہ سیاست کی پُرخار وادی میں بھی وہ دلنشیں پیرایے اور باوقار انداز میں سبک خرام ہوتا تھا۔ "برید فرنگ" کے خطوط نجی طور پر لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ان کا انداز بیان بہت بے تکلفانہ ہے۔

"برید فرنگ" کے خطوط سے نہ صرف لندن میں وفد خلافت کی سیاسی سرگرمیوں پر بہت شرح و بسط کے ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ یہ بہت سی قیمتی علمی معلومات کا بھی خزینہ ہیں۔ لندن میں سید صاحب نے اپنے مذاق کی اصل چیز انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں کی بھی سیر کی تھی۔ چنانچہ متعدد مکاتیب میں اس کا ذکر ہے۔ ایک خط میں انڈیا آفس لائبریری میں قلمی کتابوں کے انچارج پروفیسر بلوم ہارٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> " (انھیں) دیکھ کر تعجب ہوا۔ بہت بڈھے آدمی ہیں۔ ۸۰ سے کم عمر نہ ہوگی، بالکل سن سپید اور خمیدہ پشت ہیں ۱۸۶۰ء میں ہندوستان گئے تھے۔ اردو عمدہ، فصیح اور مخارج سے بولتے ہیں۔ برٹش میوزیم میں بھی اردو کا صیغہ ان ہی سے متعلق ہے۔ بہر حال انھوں نے انڈیا آفس کی اردو کی قلمی کتابوں کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسوّدہ مجھے دیا۔ یہ فہرست بھی بے ترتیب ہے۔ کوئی خاص ترتیب پیش نظر نہیں رکھی گئی ہے۔ اس سے کسی چیز کا نکالنا بہت مشکل نظر آیا۔ بہر حال اتنا معلوم ہوا کہ اردو کی کل تین سو قلمی کتابیں یہاں ہیں، یہ زیادہ تر دلّی سے ہاتھ آئی ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین کی دس بارہ تصنیفات ہیں۔ ہندی کی قلمی کتابیں کل سو ہیں......
> پروفیسر موصوف اردو کے بہت مداح ہیں۔ اردو کو ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے مؤید ہیں۔ ہندی کے مقابلہ میں اردو کو ہندوستان میں زیادہ پھیلنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں۔ ملکی

حقوق کے بھی حامی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں نوجوان اسٹوری سچے
اینگلوانڈین ہیں"۔ [1]

ہندوستان سے روانگی کے بعد وفد خلافت نے پہلا قدم سرزمین مصوع پر رکھا جو اریٹریا کی بندرگاہ ہے۔ اس کی آبادی خالص عرب ہے۔ ارکان وفد نے اس علاقہ کی سیر کی سیّد صاحب نے وہاں کے باشندوں کے جوش ایمانی، اور جذبۂ اخلاص و مودت کا ذکر بڑے انشاپردازانہ انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> " راہ میں ایک مسجد نظر آئی، نماز مغرب کے لئے وہاں گئے۔ نماز کے بعد لوگوں نے اجنبی سمجھ کر ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ السلام علیکم کے بعد ہمارے مقاصد سفر سے جب وہ مطلع ہوتے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چہروں سے کیسے شگفتگی کے آثار نمایاں تھے۔ فوراً سب نے ہماری کامیابی کے لئے دست دعا دراز کئے۔ بدحال حبشی عرب تھے، سیہ فام تھے، ژولیدہ مو تھے، لیکن ذوق چشیدہ ایمان تھے۔ ہماری آنکھیں قیامت تک ان کے چہروں کی شگفتگی ان کی دست بوسی اور بغل گیری کے جلوؤں کو نہیں بھلا سکتی"۔ [2]

اس وفد میں سید صاحب کا کام مطالبات کی مذہبی حیثیت کو بتانا، تاریخی اور مذہبی حیثیت سے انگریزی اخبارات میں وفد کے مطالبات کے متعلق جو مضامین نکلیں ان کا جواب دینا، اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو تحریک سے آگاہ کرنا تھا۔ چنانچہ مارننگ پوسٹ میں ایک اطالوی پروفیسر مشرقیات کا ایک مضمون "سلطان بحیثیت خلیفہ" شائع ہوا۔ سیّد صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ "برید فرنگ" کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

> " دیکھئے کون اخبار چھاپے۔ کم بخت کہتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے خلافت دنیائے اسلام میں نہیں رہی "فیوچر آف خلافت" ان کا ایک رسالہ ہے۔ جو اطالیں وزارت خارجہ کی طرف سے

---

[1] [2] برید فرنگ۔ ص ۷، ۷، ۶۔

شائع ہوتا ہے۔"[1]

ایک خط میں انگلینڈ، فرانس اور دوسرے بلادِ یورپ میں جمہوریت کی حقیقت کی اس طرح پردہ دری کرتے ہیں:۔

> "ہندوستان میں بیٹھ کر یورپ کی جمہوریت اور آزادی وحریت کے بڑے قصے سنتے تھے۔ یہاں واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی عملاً اربابِ حکومت اس درجہ مستبد ہیں جس درجہ مشرق میں۔ عوام کو صرف یہ اختیار ہے کہ ممبر منتخب کریں۔ اس کے بعد نہ عملاً عوام کو ممبروں پر اور نہ ممبروں کو وزرا پر اختیار ہے۔ فرانس جو ری پبلک کہلاتا ہے۔ وہاں کی حالت انگلینڈ سے بھی بدتر ہے۔ عوام کو حکومت کی پالیسی میں ذرّہ برابر دخل نہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہاں سوشلزم کے برگ وبار پیدا کرنے کے کیا اسباب ہیں۔ یہاں امیر و غریب طبقوں میں معاشرۃً اس درجہ بُعد ہے جس قدر خدا اور بندے میں۔"[2]

اسی خط میں آگے چل کر یہ ادیبانہ جملہ ان کے قلم سے تراوش کر گیا ہے:۔

> "بربنائے معلومات میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انگریزوں میں نیشنل اسپرٹ اس قدر ہے کہ انٹرنیشنل احساس ان میں مشکل سے پیدا ہو سکتا ہے۔"[3]

آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم و تربیت کے بارے میں اپنے گہرے مشاہدہ کی بنیاد پر رقمطراز ہیں:۔

> "آکسفورڈ اور کیمبرج دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ مشرقی اور مغربی طرز تعلیم میں کیا فرق ہے۔ مشرقی طالب علم کا مدعا یہ ہے کہ یا یوں کہیے کہ مشرقی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم زیر درس علوم

---

[1] [2] [3] بریدِ فرنگ۔ ص ۲۳، ۷۶، ۷۶۔

> میں ماہر ہو جائیں۔ لیکن مغربی طرز تعلیم کا منشا یہ ہے کہ طالب علم کے تمام قویٰ جسمانی و دماغی و اخلاقی میں بالیدگی ہو۔ علاوہ تعلیم کے لہو و لعب، ورزش جسمانی اور کشتی رانی کی خاص مشق کرائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں انجمنیں اور مجلسیں ہیں جن میں پالٹیکس پر آزادانہ بحثیں ہوتی ہیں۔" [1]

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان اور ہندوستانی ہونا، ہندوستان سے باہر کس ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے۔ اس ذلت آمیز تخیل کے ساتھ بڑے سے بڑا دعویٰ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس کے منہ پر کہاں تک کھلتا ہے۔ لوگ ہم سے کہتے ہیں اور ہم شرمندگی سے اس کا جواب نہیں دے سکتے کہ تم جو اس زور و قوت کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو آزاد کرانا چاہتے ہو، پہلے تم خود تو آزاد بن لو۔ کیوں کہ تم جن لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہو، ان کی گرفتاری کے حقیقی سبب تو تم ہی ہو جو خود تمہاری تلواروں کا مقتول ہو۔ اس کے سرہانے اب ماتم کیوں کرتے ہو۔" [2]

برید فرنگ کے خاتمہ پر ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "سفر یورپ کے خاتمہ پر اپنا سیاسی ایمان و عقیدہ اب آپکے سامنے اور آپ کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں ..... اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیئے۔ اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف بنیادی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے۔ اب علمائے کرام کو نہ صرف درس و افتا کی خدمت انجام

---

[1] [2] برید فرنگ۔ ص ۱۰۷، ۱۷۷۔

> دینا چاہیئے بلکہ ان کو صحیح راستے سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیئے جس سے وہ اپنے ملک کے آپ مالک ہوں۔ اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلاء، اور پیشہ ور اہل سیاست کی جولانگاہ نہ ہوگی بلکہ تمام مسلمان اپنے مذہبی جوش اور دینی غیرت وحمیت کے ساتھ اس مقدس کام کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ اور اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک وہ خود اپنے ملک میں آزاد نہ ہوں گے۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباس نہایت قدر وقیمت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف سید صاحب کی آزادی وطن کے لئے سوز آرزو اور تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے سیاسی مسلک و قوم پروری اور وطن پرستی کے گہرے جذبات وخیالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ برجستگی، بے تکلفی، جرأت، حق گوئی اور خطیبانہ انداز نے اس خط کو ادب پارہ بنا دیا ہے۔ غرض "برید فرنگ" کے خطوط سے جہاں یورپ کے بارے میں بڑی قیمتی تاریخی، سماجی اور سیاسی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ وہیں سید صاحب کے قلم برداشتہ رنگ انشا پر بھی روشنی پڑتی ہے، ان خطوط میں موضوع کے تسلسل کا یہ عالم ہے کہ اگر القاب وآداب اور خطوط کے لوازم کو حذف کردیا جائے تو "سفرنامہ یورپ" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

(۴)

"مکاتیب سلیمان" سید صاحب کے ان ۱۴۵ خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو مولانا مسعود عالم ندوی کے نام وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ دو سو چالیس صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ مکاتیب سنہ ۱۹۵۴ء میں مکتبہ چراغ راہ کراچی سے شائع ہوا۔ مسعود عالم ندوی ندوۃ العلماء کے ہونہار وباکمال فرزندوں میں تھے۔ انھیں سید صاحب سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا، اور وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ پیش نظر مجموعہ میں پہلا خط ۲۸ر فروری سنہ ۲۸ء کا ہے اور آخری

---

[1] برید فرنگ۔ ص ۱۷۹۔

۸؍ اگست ؁۵۳ء کا۔ اس ۲۵-۲۶ سال کے عرصہ میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ زمانہ کے حوادث نے مکتوب نگار و مکتوب الیہ کے افکار و خیالات کی دنیا میں بھی دور رس تبدیلیاں پیدا کیں۔ مگر پیش نظر خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود عالم نے اپنے استاذ و مربی کے ساتھ نیازمندی اور وفاشعاری کے آداب میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

ربع صدی پر محیط اس مدت مراسلت میں مکتوب الیہ کے مشغلہ اور ذوق کی مناسبت سے موضوع بھی برابر بدلتے رہے۔ چنانچہ پیش نظر کتاب کے پہلے پانچ خط عربی زبان میں ہیں۔ اس وقت مکتوب الیہ کو عربی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ پھر ندوہ میں داخلہ سے تکمیل تعلیم تک سیّد صاحب کے متعدد خطوط انھیں موصول ہوئے۔ مئی ؁۳۱ء میں ندوہ سے مکتوب نگار کی نگرانی اور مکتوب الیہ کی ادارت میں ”الضیاء“ کے نام سے ایک عربی رسالہ کا اجراء ہوا، جو تقریباً چار سال جاری رہا۔ اس مدّت میں ۳۲ خط (ع۱۱ ـ ع۴۲) سید صاحب نے مسعود عالم صاحب کو لکھے۔ ظاہر ہے کہ ان خطوط میں ”الضیاء“ کے سلسلہ میں استفسارات اور ہدایات درج ہیں۔ ایک آدھ خط ندوہ کی داخلی سیاست سے بھی متعلق ہے۔ جولائی ؁۳۷ء میں مسعود عالم، سیّد صاحب کی اجازت و مشورہ کے بغیر اخبار مدینہ بجنور کے اڈیٹوریل بورڈ سے منسلک ہوگئے تھے۔ چنانچہ چار خط (ع۴۳ ـ ع۴۶) اس زمانے کے ہیں۔ اس کے بعد ع۴۷ تا ع۹۸ وہ خطوط ہیں جو مکتوب الیہ کو خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ملازمت کے سلسلہ میں یا ملازمت کے دوران (ستمبر ؁۳۷ء تا ستمبر ؁۴۴ء) موصول ہوئے۔ ان خطوط کے موضوعات بہت متنوع ہیں۔ خالص علمی مضامین سے لے کر ندوہ کی داخلی سیاست، پٹنہ کے جھگڑے اور نجی امور بھی ہیں۔ انجمن طلبہ قدیم، انجمن معین الندوہ، سیرت محمد بن عبدالوہاب، مولانا عبیداللہ سندھی، اشتراکیت اور اسلام وغیرہ اسی طرح کے مختلف اجتماعی اور علمی کاموں کا ذکر بار بار آتا ہے۔

مسعود عالم ندوی فکری طور پر جماعت اسلامی اور مسلک کے اعتبار سے سلفیت سے وابستہ تھے۔ اس لئے مکتوب ع۹۰ تا ع۱۴۱ میں جماعت اسلامی اور تصوف کا ذکر خاص طور پر آتا ہے۔ اس زمانے کے بعض مکاتیب میں تصوّف و تزکیہ کے متعلق نہایت قیمتی

فرمودات درج ہیں۔ بقول مرتبؒ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مکاتیب بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہیں"۔ آخر کے چند مکتوبات مکتوب الیہ کی گرفتاری[1] کے زمانے میں دریافت حال کے لئے تحریر کئے گئے ہیں۔ خط ۱۴۵ مکتوب الیہ کو رہائی کے بعد دار العروبہ[2] راولپنڈی کے پتہ پر ملا، جس پر ۸؍ اگست ۵۳ء کی تاریخ درج ہے۔ اس کے صرف تین ماہ بعد مکتوب نگار اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

ستمبر ۳۵ء میں ندوہ میں طلبہ اور ارباب حل و عقد کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اس طوفان کی لپیٹ میں مسعود عالم صاحب بھی آ گئے۔ سید صاحب کو اس ہنگامہ ان کی شرکت سے بے حد ملال ہوا۔ چنانچہ اپنے ایک طویل خط ۳۹ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> "میرا ایک مشہور فقرہ ہے۔ شاید آپ سے بھی کہا ہو کہ محمود بننا مشکل نہیں ایاز بننا مشکل ہے۔ اپنی طبیعت کے خلاف اور نفس پر جبر کر کے کسی ایک کے تابع ہو کر چلنا کتنا مشکل کام ہے، مگر سلامتی سے منزل مقصود تک پہونچنے کا راستہ یہی ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔"[3]

سید صاحب دنیائے صحافت کے تجربات اور اس کے مالہٗ و ما علیہ سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مکتوب الیہ کو رسالہ "الضیاء" کی ادارت کے زمانے میں لکھے۔ کہیں وہ اشتہار و ریویو کے لئے اردو کے مختلف رسالوں اور اخبارات سے رابطہ پیدا کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ کہیں عربی رسائل سے تبادلہ کرنے کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت کرتے ہیں[4]۔ کہیں تصحیح و کتابت کی غلطیوں کے تدارک اور مشکل الفاظ پر اعراب لگوانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ کہیں سیاست کو رسالہ چلانے کے لئے شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔[5] ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدؒ صاحب مضمون نگاروں کے نام کے ساتھ آداب و القاب

---

[1] ۵۳ء میں جب پاکستان میں قادیانیت مخالف ایجی ٹیشن کا ہنگامہ برپا ہوا تو جماعت اسلامی کے تمام اکابر قائدین گرفتار کر لئے گئے تھے، ان ہی میں مسعود عالم صاحب بھی شامل تھے۔

[2] مرکز جماعت اسلامی راولپنڈی۔ [3] [4] [5] مکاتیب سلیمان۔ ص ۶۵، ۴۷، ۳۶۔

اور تعظیمی الفاظ کو پسند نہیں کرتے تھے[1]۔ ایک خط میں اڈیٹر الضیا کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

> " سن لیجئے کہ میں نے سالہا سال تک الندوہ کو اس طرح چلایا کہ چپراسی کے کام سے لے کر اڈیٹری تک کا کام تنہا انجام دیا ہے "۔[2]

بعض خطوط میں علمی استفسارات کے نہایت محققانہ جواب بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً :۔

> " لقد تأملتُ الطرق الکلامیۃ الخ یہ عبارت ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں کئی جگہ نقل کی ہے ۔ مثلاً کتاب العقل والنقل لابن تیمیۃ ..... یہ امام رازی کا قول ہے اور ان کی کتاب اقسام اللذات سے مقتبس ہے ۔ علامہ موصوف نے رازی کی اس عبارت کو اپنے رسائل اور کتاب الرد علی المنطقیین میں بھی نقل کیا ہے "۔[3]

ان خطوط سے سید صاحب کے اخلاق و سیرت کے بعض روشن پہلو نظر کے سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً حسن نیت ، اخلاص ، عفو و درگذر ، غلو و تعصب سے اجتناب ، جاہ و عزت کے فریب سے نفور وغیرہ ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> " محبت ، اعتماد اور مسامحت ہمارا دستور العمل ہے ..... وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہیئے ۔ تصلب اور تعصب حکم دین میں ہونا چاہئے نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت ' بل ملۃ ابراھیم حنیفا و ما کان من المشرکین "۔[4]

ایک دوسرے خط میں رقمطراز ہیں :۔

> " میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق زیادہ پسند کرتا ہوں "۔[5]

علمی مسائل اور نکتہ آفرینیوں پر مشتمل خطوط میں سے چند کی مثالیں ملاحظہ ہوں ، ادب برائے

---

[1] [2] [3] [4] [5] مکاتیب سلیمان ۔ ص ۳۴ ، ۴۷ ، ۵۳ ، ۱۱۴ ، ۱۱۵ ۔

ادب کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> " علم کو صرف علم کی خاطر چاہنا قلبی جہل ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس حقیقت کو پالیا۔ حضرت امام مالک کا ایک قول ہے جس کو علامہ ابن عبدالبر نے جامع میں نقل کیا ہے اس موقع پر پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ فرمایا "نحن لا نشتغل فیما لیس تحتہ عمل" گویا آج کل کے محاورہ میں ادب برائے ادب کا تصور ذہنی عیاشی ہے۔ ادب برائے زندگی ہی حق ہے"۔ [1]

سید صاحب کے نزدیک مدارس اسلامیہ کا سیاسیات سے آلودہ ہونا پسندیدہ نہ تھا، رقمطراز ہیں :-

> " ابھی دیوبند گیا تھا، ایک دن رہا۔ مدرسہ کانگریس کا قلعہ بن رہا ہے۔ حسن نیت اور اخلاص پر اعتماد ہے، مگر مدارس کا اس کشاکش میں پھنسنا کسی طرح علم اور دین کے لئے پسندیدہ نہیں، ایک طرف سے علی گڑھ کے طلبہ لیگ کا علم لے کر اور بالمقابل دیوبند کے طلبہ کانگریس کا جھنڈا لے کر صوبہ بھر میں پھیلے ہیں"۔ [2]

سید صاحب کو اپنے لئے ایک لٹریری اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ اس کے بارے میں رقمطراز ہیں :-

> " ایک ایسے ندوی کا نام بتاؤ جس کی درسی وادبی قابلیت قابل اطمینان ہو اور اخلاقی تربیت درست ہو۔ مزاج میں عُجب اور ناشنوائی نہ ہو۔ انگریزی بقدر معقول جانتا ہو۔ علم کا شائق اور صلاحیت و استعداد رکھتا ہو"۔ [3]

رسالہ الفرقان لکھنؤ کے شاہ ولی اللہ نمبر میں مکتوب الیہ کا مضمون دیکھ کر لکھتے ہیں :-

> " آپ کا مضمون دیکھا۔ دین کی حمیت کی شان دیکھ کر خوشی

---

[1] [2] [3] مکاتیب سلیمان ص ۱۷۰، ۱۹۵، ۸۶۔

ہوئی۔ میری امیدوں کا مرجع اب آپ ہی جیسے چند عزیز ہیں وفقہم اللہ، ایک بات کہنا ہے۔ تحریر میں دل کے اجزاء بھی کچھ شامل کیجئے۔"[1]

(۵)

"مکتوبات سلیمانی" علامہ سید سلیمان ندوی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے "رفیق قدیم" اور "صدیق حمیم" مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، یہ مکتوبات ۲۲+۱۸/۸ سائز کی دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی جلد کی ضخامت ۲۹۸ صفحات اور دوسری جلد کی ۲۴۰ صفحات ہے۔ دونوں جلدیں شاہی پریس لکھنؤ سے علی الترتیب ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔ ان میں مجموعی طور پر چار سو خطوط تاریخ وار مرتب کئے گئے ہیں جو چالیس سال کی طویل مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے جب سید صاحب رسالہ الندوہ کے سب اڈیٹر تھے اور اپنے استاذ علامہ شبلی کے ساتھ بمبئی کے پالن جی ہوٹل میں مقیم تھے۔ آخری خط وفات سے چند ہفتہ قبل نومبر ۱۹۵۳ء میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ یہ خطوط دو بے تکلف، مزاج شناس اور مذاق آگاہ احباب کے درمیان لکھے گئے ہیں اس لئے جگہ جگہ اشارات وکنایات اور رمز وابہام ملتے ہیں۔ ایسے تمام مقامات پر مرتب نے نہایت دلنشیں پیرایے میں توضیحی حواشی لکھے ہیں جن کی مجموعی تعداد تقریباً بارہ سو ہے۔ بقول عروج قادری: "ماجد صاحب کے یہ حاشیے قلّ ودلّ کی بہترین مثال ہیں"۔[2]

مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کا باہمی تعلق عنفوان شباب ہی سے شروع ہوا، جب ۱۹۰۹ء میں عبدالماجد دریابادی کیننگ کالج لکھنؤ میں طالب علم تھے۔ اور سید صاحب ندوۃ العلماء سے قریبی زمانہ ہی میں فارغ ہوئے تھے۔ مولانا شبلی سے استفادہ کی ہم نشینی نے دونوں کو خواجہ تاشی کے رشتہ میں منسلک کر دیا تھا۔ مختلف حیثیت سے دونوں میں بڑی قربت

---

[1] مکاتیب سلیمان ص ۱۱۰۔

[2] سید احمد عروج قادری: تبصرہ مکتوبات سلیمانی حصہ اول، رسالہ زندگی رام پور، اپریل ۱۹۶۴ء ص ۵۹۔

ویگانگت تھی۔ پیش نظر خطوط سے ان کے گہرے باہمی رابطۂ اخلاص اور مودت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت دو عظیم و شریف دوستوں کی چہل سالہ روداد رفاقت ہے، ادبی تاریخ میں باہمی مراسلت کا اتنا طویل عرصہ دو بڑے فاضلوں کو شاذ ہی نصیب ہوا ہوگا، عبدالماجد صاحب نے ان مکتوبات کی حفاظت، پھر ترتیب و اشاعت کا اہتمام اور قیمتی حواشی سے مزین کرکے حق مودت و دوستی ادا کر دیا ہے۔ جنس وفا کی نایابی کے دور میں وفا شعاری کی ایسی مثالیں فی زمانہ خال خال ہی مل سکتی ہیں۔

یہ خطوط نہ صرف سید صاحب کی سیرت و شخصیت کی گوناگوں تجلیات کا مرقع ہیں بلکہ اس عہد کے برصغیر کی علمی و ادبی (بلکہ سیاسی بھی) تاریخ کی ایک مستند و دلچسپ دستاویز ہیں۔ ان مکتوبات کے آئینہ میں جہاں سید صاحب کی شخصیت پوری طرح نکھر کر سامنے آتی ہے۔ وہیں ان کے ذریعہ گذشتہ چالیس سال کی علمی تاریخ کی کئی مکتوم و فراموش شدہ کڑیاں بھی محفوظ ہو گئی ہیں۔ عبدالماجد صاحب نے جلد اول کے آغاز میں جو حقیقت پسندآ مقدمہ لکھا ہے وہ اس کتاب کی جان ہے۔ اس کے مطالعہ سے پیش نظر خطوط کی اہمیت و وقعت شرح و بسط کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ موصوف ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

> "نشیب و فراز، پیچ و خم، جس طرح کہ بشری زندگی کا جزو ہوتے ہیں، ان کی پوری عکاسی ان خطوط میں موجود ہے۔ ۲۷ سال کی بھرپور جوانی سے لے کر ۷۶ سال کی پختہ عمر تک جتنی منزلیں طے ہونے کی تھیں سب ہی کے نقشے ان صفحات میں آتے گئے ہیں۔ غم و غصہ، صدمات خانگی، شوخی و ظرافت، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ، دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت، ناگواری و طنز، سیاسی چاشنی سب کی جھلکیاں اپنی جگہ ان اوراق میں محفوظ ملیں گی۔"[1]

سعید احمد اکبرآبادی مکتوبات سلیمانی پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کاتب

---

[1] عبدالماجد دریابادی: مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل، دیباچہ ص ۸۔

ومکتوب الیہ دونوں دنیائے علم و ادب کی نامور شخصیتیں ہیں۔ خطوط کا زمانہ چالیس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانوں کی بڑی بڑی علمی و تعلیمی اور مذہبی و سیاسی تحریکیں پیدا ہوئیں، عظیم الشان ادارے قائم ہوئے اور ہر میدان میں بلند پایہ شخصیتوں کا ظہور ہوا، اس بنا پر عہد جدید اور مسلمانان ہند کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں یہ خطوط اور ان کے ساتھ یہ حواشی تاریخی اور ادبی اعتبار سے بڑے اہم ہیں۔ تاریخی اس لئے کہ پرائیوٹ خطوط ایک طرف تو خود اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں، جس میں چہرے کے اچھے برے خد و خال جن سے شخصیت کی ترکیب و تعمیر ہوتی ہے۔ وہ سب نظر آجاتے ہیں اور دوسری جانب بہت سے واقعات کا جو صحیح علم خطوط کے ذریعہ ہوتا ہے۔ عام روایتی، کاغذی یا اخباری بیانات سے نہیں ہو سکتا۔ اور ادبی اس لئے کہ ایک بڑا ادیب اور مصنّف پرائیوٹ خطوط میں جو زبان استعمال کرتا ہے۔ وہی دراصل اس کے ادبی شعور اور ادبی مزاج و طبیعت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں آورد کے بجائے آمد اور تکلف و اہتمام کے بجائے بیساختگی و برجستگی پائی جاتی ہے۔"[1]

زیر تبصرہ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی جتنے بڑے محقق اور مصنف تھے اسی درجہ کے سرپرست و نگراں بھی تھے۔ معارف کے معیار کو بلند کرنے، رفقائے دارالمصنفین کی تربیت کرنے اور دارالمصنفین کو ایک بلند پایہ ادارہ بنانے کے لئے انہوں نے کیا کیا اسکیمیں بنائیں اور ان کو عمل میں لانے کے لئے کیسی کیسی جد وجہد کی۔ علماء و فضلاء اور امراء و رؤساء ان دونوں کا تعاون کس طرح حاصل کیا؟ علوم جدیدہ کی ان کی نظر میں کتنی اہمیت تھی؟ اور کس طرح ان پر ہر وقت کام کی دُھن سوار رہتی تھی؟ ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر ان کی نظر کتنی گہری تھی؟

مزید برآں ان مکتوبات کے ورق ورق سے سید صاحب کی شخصیت اور کمالات کے حسب ذیل جلوے نظر افروز ہوتے ہیں۔ علمی رفعت، دینی حمیت، اصلاحی حکمت، کتاب و سنّت اور کلامی امور میں دقّت نظر، علمی اختلاف میں قوت اظہار کے باوجود جھنجھلاہٹ اور

---

[1] سعید احمد اکبر آبادی: تقریظ و انتقاد مکتوبات سلیمانی۔ رسالہ برہان دہلی مارچ سنہ ۶۴ء ص ۱۸۴۔

تبذل سے گریز، عالی ظرفی، حلم و متانت، بے نفسی و ایثار، عصبیت و تحزب سے گریز، علماء کی شیرازہ بندی کی کوشش، مخالفین اسلام کے دفاع میں مسلسل جہاد، علمی نکات، تحقیقی نوادر، فراست و دوربینی، شرافت و مروّت، تواضع و انکسار، علوئے ہمتی، ایثار و قربانی، صبر و رضا، وضعداری، باہمی رکھ رکھاؤ اور محبت و سبھاؤ۔

ان خطوط میں بعض فقرے ایسے ملتے ہیں جو اس کا ثبوت ہیں کہ سید صاحب دل کے صاف تھے۔ ان کی دوستی اور دشمنی منافقت کے عیب سے پاک تھی۔ اس کے علاوہ یہ خطوط سید صاحب کے سیاسی نظریات، عصری تاریخی واقعات، معارف و دارالمصنفین کی سرگزشت، تحریکِ خلافت میں شرکت، سفر یورپ، مستشرقین سے کامیاب معرکے، سفر حجاز، مولانا محمد علی سے اتحاد و اختلاف اور اس کی بنا، گندی سیاست سے بیزاری، ردّ بدعات، فقہی مسائل میں میانہ روی وغیرہ وغیرہ مفید معلومات کا کشکول ہیں۔

ان مکاتیب سے پہلی بار بعض ایسے سربستہ اسرار و حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جو عرصہ سے قیاس آرائیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ مثلاً الہلال سے علیحدگی کے اسباب، دارالمصنفین سے ترک تعلق، ہجرت پاکستان وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں "میرا سفر پاکستان" کے عنوان سے سید صاحب کی ایک ناتمام تحریر شامل ہے۔ جو قیام پاکستان کے اسباب کی مستند ترین دستاویز ہے اور اس کے بعد سید صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بارے میں تمام نزاعی بحثوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مکتوبات سلیمانی کا یہ ذخیرہ عبرت و موعظت کا بھی ایک موثر مرقع ہے۔ اپنوں کی سرد مہری، علمائے عصر کا تحزب، علمی تحقیقات کو اپنے گروہ میں منحصر رکھنے کی بے جا کوششیں اور اس معاملہ میں علمی سطح کو چھوڑ کر جنگ و جدال کی پست سطح پر اتر آنے کے واقعات اور مکتوب نگار کے ایثار نفس کی ناقدری کی بڑی حسرت خیز داستانیں اس میں سمٹ کر آگئی ہیں، اس میں سیّد صاحب کے روحانی انقلاب کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس مجموعۂ مکاتیب کے مطالعہ سے فلسفۂ مغرب کی برتری کا بھرم بھی کھل جاتا ہے۔ مثلاً:-

"مل کی منطق پڑھی، حیرت ہوئی کہ اسی کا اتنا شور ہے۔ ہمارے

> متاخرین کی منطق کے یہ پامال مباحث ہیں۔ اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے درحقیقت منطق کو انتہائی حد تک ترقی دی ہے۔"[1]

اسی طرح :-

> "برکلے کی تھیوری حرف بحرف مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں موجود ہے۔ صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔"[2]

شاردا ایکٹ جس کے ذریعہ کم سنی کی شادی کو قانوناً ممنوع اور قابل سزا قرار دیا گیا تھا، اس کے خلاف مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ مولانا محمد علی اور مفتی کفایت اللہ وغیرہ سب نے اس ایکٹ کو مداخلت فی الدین قرار دیا، لیکن سید صاحب ان حضرات سے کلی طور پر متفق نہ تھے۔ چنانچہ ایک خط میں رقمطراز ہیں :-

> "نصوص شرعی کے اشارات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نکاح بحالت بلوغ مستحسن ہے۔ اگر مسلمانوں کی حالت کا اقتضا ہو کہ عدم بلوغ کے غیر مستحسن نکاح سے لوگوں کو روکا جائے تو مسلمانوں کا امام ایسا کر سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم حکومت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ مسلمان قضاۃ کا تقرر ہو اور وہ اسلامی مصالح کی بنا پر کوئی حکم دیں اور اس پر کوئی تعزیر جاری کریں مگر نکاح اور اس کے لوازم ناجائز نہیں ہو سکتے۔"[3]

سیّد صاحب کی تفسیری غلطیوں کا فتنہ اہل دیوبند اور اہل قرآن کے باہمی اتحاد سے نہایت زور و شور کے ساتھ اٹھا تھا۔ یہاں تک کہ ایک خالص علمی اختلاف کا فیصلہ انگریزی عدالت تک پہونچا دیا گیا تھا۔ پیش نظر مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب اس سارے محاذ کے مقابلہ میں تن تنہا پوری قوت و اعتماد کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس سلسلہ میں ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :-

> "تعجب ہے کہ اس قسم کی باتیں اگر اکابر دیوبند نے لکھیں تو عین ایمان،

---

[1] [2] [3] مکتوب سلیمانی۔ ج ۱، ص ۳۳، ۹۹، ۲۵۲۔

> میں نے لکھیں تو مسامحات، خاتم النبیین کی تفسیر جو مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی اور سراجاً منیراً کی تفسیر جو مولانا اشرف علی نے فرمائی وہ عین محبت نبوی کا تقاضا۔ مگر میں نے شاھداً و مبشراً ونذیراً کی تفسیر کی تو غلط یا للعجب۔ وہ تخلف وعید کو ممکن کہیں تو ایمان، اور اسی بات کو یوں کہہ دیا کہ کفار ممکن ہے، دوزخ سے نکل جائیں تو الحاد ہو جائے .... مجھے تو شک ہے کہ ان صاحبوں کے دلوں سے عصبیت دیوبندی وندوی نہیں گئی۔
> استغفر اللہ، استغفر اللہ۔" [1]

گاندھی جی کے دردناک حادثہ قتل کا سید صاحب کو دلی صدمہ ہوا۔ ۸؍ فروری ۴۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "گاندھی جی کی موت سے دل بے حد متاثر ہوا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کا محبوب خود ایک ہندوستانی کے ہاتھ سے اور ہندوؤں کا مہاتما خود ایک ہندو کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ معصوموں کا خون رائیگاں نہ جائے گا۔ خدا کرے ہندوستان کو امن وامان نصیب ہو۔" [2]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

> "گاندھی جی کا وہی مرتبہ ہے جو بابا نانک اور کبیر داس کا ہے یا راجہ رام موہن رائے کا۔" [3]

اگست ۴۵ء میں عبدالماجد دریابادی نے بعض وجوہ سے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت سے استعفا دے دیا تھا۔ سید صاحب نے اس پر نہایت دل گیر ہوکر جو تفصیلی خط موصوف کو لکھا ہے۔ اس کا لفظ لفظ ان کی شرافت و مروت اور پاک طینتی

---

[1] [2] [3] مکتوبات سلیمانی ج ۲۔ ص ۴۴، ۲۰۴، ۲۰۵۔

کا آئینہ دار ہے، اس طویل خط کا صرف ایک اہم اقتباس پیش خدمت ہے :۔

> " آپ کا استعفا منظور کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں، بلکہ صلاحیت بھی نہیں۔ بلکہ اس صحیفہ کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا جس میں ھذا فراق بینی وبینك کی آیت ہے۔ اس لئے واپس ہے۔ خدارا مجھے اس عالم ضعف میں، اس عالم تنہائی میں نہ چھوڑیں جب دستگیری کا عین وقت ہے ؎
>
> دوست آں دانم کہ گیرد دست دوست
> در پریشاں حالی و درماندگی
>
> اس لئے ازراہ عنایت اس استعفا کو واپس لے لیں۔ "[1]

مکتوبات سلیمانی کی دونوں جلدوں میں بکثرت علماء و فضلاء، مشائخ و اتقیاء، زعمائے ملت، ارباب دول اور اراکین سلطنت کا تذکرہ یا ان پر اجمالی تبصرہ ملتا ہے۔ ذیل میں چند اسماء بقید صفحہ نمبر درج کئے جاتے ہیں :۔

ڈاکٹر ذاکر حسین (ص ۲۰، ۲۲، ۱۹۲) نادر شاہ افغانی کی شہادت (ص ۳۸) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (ص ۵۹) عنایت اللہ مشرقی (ص ۶۲) نظام دکن (ص ۳، ۲۷) ابوالکلام آزاد (ص ۱۹۳) پنڈت جواہر لعل نہرو (ص ۶۱) مفتی کفایت اللہ (ص ۶۴) سر اکبر حیدری (ص ۳۷) مناظر احسن گیلانی (ص ۴۷) آزاد سبحانی (ص ۹۷) نیاز فتح پوری (ص ۹۸) سر عبدالقادر (ص ۱۱۵) مولانا عبید اللہ سندھی (ص ۱۲۹) رشید احمد صدیقی (ص ۲۲۵) ملا رموزی (ص ۱۹۱) رفیع احمد قدوائی (ص ۱۹۹) مولانا حفظ الرحمٰن (ص ۱۹۳) مولانا احمد سعید (ص ۹۹) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ص ۲۵) مولا حمید الدین فراہی (ص ۵۴) مولانا اشرف علی تھانوی (ص ۳۹) ڈاکٹر اقبال (ص ۳۸)۔

سید سلیمان ندوی نے اپنی شہرت و مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر بلند ہونے کے بعد جن علمی و ادبی مجالس اور کانفرنسوں میں شرکت کے لئے سفر کئے۔

---

[1] مکتوبات سلیمانی ج ۲۔ ص ۱۶۸۔

مکتوباتِ سلیمانی میں جابجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ بعض اہم اسفار کی فہرست بقید صفحہ حسب ذیل ہے:۔

ہندوستانی اکیڈمی ایگزیکٹیو میں شرکت (ص ۲۳) سفر افغانستان (ص ۲۸) سفر حیدر آباد (ص ۳۷) فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کے لئے سفر (ص ۶۲) جونپور تعلیمی کانفرنس (ص ۶۷) اردو کانفرنس پٹنہ کا سفر (ص ۷۱) سرکاری تعلیمی کانفرنس، فیض آباد کے لئے سفر (ص ۷۶) دائرۃ المعارف حیدر آباد کے لئے سفر (ص ۸۰) ادارہ مشرقیہ لاہور کے لئے سفر (ص ۸۹) سفر بھوپال برائے اصلاح نصاب (ص ۱۰۳) آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے لئے سفر (ص ۱۵۳) راندیر و سورت کا علمی سفر (ص ۱۵۷)۔

مکتوبات سلیمانی کے مطالعہ سے سیّد صاحب کے وسیع و عمیق مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن کے مطالعہ کا ذوق تو دور کی بات ہے۔ اس عہد کے اکثر علماء ان کے نام سے بھی شاید ہی واقف ہوں مثلاً قدامہ بن جعفر کی جواہر الالفاظ (ص ۱۳) شفاء العلیل (ص ۳۷) آثار المدینہ (ص ۴۸) سہیلی کی اعلام فی الاعلام (ص ۱۰۶) عکبری کی اعراب القرآن (ص ۱۴۶) بغدادی کی الفرق بین الفرق (ص ۱۵۵) جاحظ کی کتاب البیان والتبیین (ص ۱۵۹) اور کلیات ابوالبقاؔ (ص ۱۶۳) وغیرہ۔

مکتوبات سلیمانی کا سب سے اہم اور تاریخی حصہ وہ ہے جس میں سیّد صاحب کی الہلال سے علیحدگی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے دل برداشتگی کے اسباب پر وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔ سیّد صاحب مولانا آزاد کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ دونوں نے ایک ہی زمانہ میں مولانا شبلی سے تصنیفی تربیت حاصل کی تھی۔ پھر کچھ دنوں تک الہلال میں اور ایک عرصہ تک سیاسی میدان میں دونوں کا ساتھ رہا۔ سید صاحب نے ان کو لکھنؤ اور کلکتہ میں بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ چنانچہ انھیں اپنے علم و بصیرت کے مطابق مولانا آزاد میں بہت سی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں۔ پیش نظر مجموعۂ مکاتیب

کے ابتدائی چند خطوں میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً ۲۶؍ اکتوبر ۱۳ء (جب سید صاحب کو الہلال میں کام کرتے پانچ چھ ماہ ہو چکے تھے) کے خط میں لکھتے ہیں :۔

> "بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ سونگھنے کے نہیں، مولوی آزاد وہی پھول ہیں افسوس ہے کہ میں دور سے دیکھ کر اسے سونگھنے کے قابل سمجھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں علم، سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں۔ اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا.... میرا بال بال راز ہے اور افسوس ہے کہ اب زیادہ اپنے ضمیر کو مجروح نہیں کر سکتا۔ اور اس لئے پابہ رکاب ہوں اور اس ذخیرہ اسرار مخفی کو اس وقت تک کے لئے محفوظ رکھتا ہوں، جب تک اس کا وقت نہ آئے۔"[1]

پھر سید صاحب بوجہ اختلاف الہلال کے اوارتی اسٹاف سے علیحدہ ہو کر پونا چلے گئے اور وہاں سے ۳۱؍ جنوری ۱۴ء کو ایک خاصا طویل خط عبدالماجد دریابادی صاحب کو لکھا، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

> "سنا، آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا ہے کہ ۱۳۰ ہم دیتے ہیں اور دس ماہوار کی ترقی تا ۲۰۰۔ تمام اسٹاف آپ کی زیر نگرانی۔ نام آپ کا اڈیٹری میں ظاہر رہے گا۔ فوراً چلے آیئے۔"[2]

سطور بالا میں سید صاحب نے مولانا آزاد کے جس خط کا حوالہ دیا ہے، اسے عبدالماجد صاحب نے حاشیہ میں بجنسہ درج کر دیا ہے۔ اس کے کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں :۔

> "بہر حال میں آج اپنی شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں، لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو غیر از صبر چارہ نہیں۔ معلوم نہیں اس خط کا نتیجہ کیا نکلے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی

---

[1] مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۱۲، - [2] مکتوبات سلیمانی۔

بدگمانیوں کی نذر نہ ہو۔ تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجئے کہ سچائی اور صداقت، محبت و وداد اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز میرے دماغ میں نہیں.....'

'آپ آکر الہلال بالکل لے لیجئے۔ جس طرح جی چاہے اسے اڈٹ کیجئے۔ مجھے سوائے اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں۔ میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ صرف اپنے مضامین دیدیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہوگا.....'

'سردست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں۔ تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لئے ہیں۔ اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ پورے دوسو ہو جائیں۔''[1]

سید صاحب نے ۱۳ر جنوری والے اپنے مذکورۃ الصدر خط میں یہ شکایت بھی لکھی ہے کہ ''مولانا آزاد بار بار مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور رنجش کے موجبات پوچھتے ہیں۔ چنانچہ اس خط میں بھی باصرار پوچھا تھا، میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب بھیجا۔ لیکن اب تک آوازے بر نہ خاست''[2]۔ مولانا آزاد نے سید صاحب کی شکایتوں اور اعتراضوں کا تفصیل سے جواب دیا تھا، اس میں انھوں نے غایت شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے پبلک زندگی اور نجی زندگی کے متعلق بعض اعتراضات کو بے چون و چرا فرط ندامت و شرمساری کے ساتھ تسلیم کر لیا اور آیندہ مجتنب رہنے کا عہد و پیمان کیا۔ بعض کے لئے اعتراف کیا کہ

---

[1] مکتوبات سلیمانی۔ ص ۱۷ (حاشیہ)۔

[2] مکتوبات سلیمانی۔ ص ۱۷۔

کوشش اصلاح ہو رہی ہے، اور بعض کے لئے صاف تردید کر کے سید صاحب کو لکھا کہ اس بارے میں خود آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مولانا آزاد کا یہ طویل اور اہم مکتوب خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا عبدالماجد دریابادی کو دار المصنفین سے سید صاحب کے کاغذات میں مل گیا، اور انھوں نے اس کی نقل مکتوبات سلیمانی کے حاشیہ میں ضمیمہ کے طور پر درج کر دی ہے۔ اس خط کی سطر سطر بلکہ حرف حرف سے خلوص و صداقت کا چشمہ ابلتا محسوس ہوتا ہے[لہ] اس خط سے مولانا آزاد کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ کہ پبلک لائف میں ان کی خودداری کا رشتہ خودسری اور انانیت سے جا ملتا تھا۔ کسی کو نظر میں لاتے تھے، اور نہ کسی کو اپنے درجہ و مرتبہ کا سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دین کے معاملہ میں وہ نہایت منکسر المزاج اور متواضع تھے۔

اگرچہ اس خط سے بھی سیّد صاحب کی غلط فہمیاں دور نہ ہو سکی تھیں لیکن دار المصنفین کے قیام کے بعد دونوں کا دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا تھا۔ بلکہ بقول عبدالماجد صاحب "درمیان میں تو ایک دور خاص لطف و محبت کا آگیا تھا۔"[تہ] مولانا ابوالکلام نے سیّد صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں، وہ کتب خانہ دار المصنفین کے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں اور ان میں سے ۳۸ خطوط رسالہ معارف ۱۹۵۳ء میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل میں سید صاحب کی کتنی عزت و وقعت اور مودت و اخلاص تھا۔ اور وہ ادب و صحافت میں سیّد صاحب کی رفاقت اور معاونت کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

مکتوبات سلیمانی میں شامل سیّد صاحب اور مولانا آزاد کے مذکورۃ الصدر خطوط کے باعث جب عبدالماجد صاحب نے ان مکاتیب کی ترتیب و اشاعت کا اعلان شائع کیا

[لہ] سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ "جنھیں مولانا آزاد سے خدا واسطے کا بیر ہے وہ اس خط کو اپنی کام جوئی کے لئے استعمال کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک یہ خط مولانا کی عظمت میں اضافہ ہی کرتا ہے نہ کہ کوئی کمی۔ اور یوں بھی اس خط میں نئی بات ہے کون سی؟ وہی اعتراف و اقرار جو "تذکرہ" اور "غبار خاطر" میں تشبیہ و استعارہ کی زبان میں تھا۔ یہاں بلا ایہام و توریہ کر لیا ہے۔" (رسالہ برہان دہلی، مارچ ۶۶ء ص ۱۸۵)۔

[تہ] مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۹ (دیباچہ)۔

تو ایک اختلافی بحث اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارباب دارالمصنفین ان خطوط کی اشاعت کو مصلحت اور دوراندیشی کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسری طرف مولانا آزاد کے معتقدوں کو یہ خیال گزرا کہ مولانا عبدالماجد ان کو شائع کر کے مولانا آزاد کی بدنامی کا سامان مہیّا کر رہے ہیں۔ ایک تیسرے طبقہ کی رائے تھی کہ ان خطوط کو ضرور شائع ہونا چاہیئے، خواہ ان میں کچھ بھی درج ہو۔ خود مولانا دریابادی بھی ان خطوط کی اشاعت و عدم اشاعت کے بارے میں مذبذب رہے، لیکن بالآخر جب مکتوبات سلیمانی منصّۂ شہود پر آئی تو پورے ملک میں ذوقِ شناسانِ ادب نے اس کی اشاعت کو علمی و ادبی سرمایہ میں ایک گرانقدر اضافہ قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط سے ابوالکلام اور سیّد صاحب کی عظمت کچھ بڑھتی ہی ہے کم نہیں ہوتی۔ سعید احمد اکبرآبادی نے بہت درست لکھا ہے کہ:-

> ”مکاتیب سلیمانی کے آئینہ میں سیّد صاحب اور مولانا آزاد کی شخصیتوں کے جو نقوش ابھرتے ہیں ان میں بڑی عظمت و بزرگی، بلندی کردار اور رفعت اخلاقی ہے۔ نہ کہ خدانخواستہ کوئی ایسی پستی جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے دامان فضائل پر بدنما داغ کہلا سکے۔“ [1]

روزنامہ ”نوائے وقت“ لاہور کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے:-

> ”مولانا آزاد کے اس جواب سے یہ بنیادی صداقت واضح ہوتی ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو۔ اہل دنیا اس کے کتنے ہی معتقد کیوں نہ ہوں۔ انسان بشری تقاضوں سے یکسر بے نیاز نہیں ہوسکتا، دور سے صرف خوبیاں متاثر کرتی ہیں، لیکن قربت کمزوریاں بھی بے نقاب کر دیتی ہے۔ لیکن چند کمزوریاں منظر عام پر آنے سے انسان کی حقیقی عظمت داغدار نہیں ہوتی۔“ [2]

---

[1] سعید احمد اکبرآبادی: تقریظ و انتقاد مکتوبات سلیمانی۔ رسالہ ”برہان“ دہلی مارچ ۶۴ء ص ۱۸۶۔

[2] بحوالہ ”مکتوبات سلیمانی اہل نظر کی نظر میں“۔ صدق جدید، ۸ مئی ۶۴ء ص ۷۔

مکتوبات سلیمانی سے سید صاحب کی سیرت کا ایک اور مخفی پہلو طشت از بام ہوتا ہے، اور وہ دار المصنفین سے (جس کو انھوں نے اپنے خون جگر کی آبیاری سے پروان چڑھایا تھا) با دل ناخواستہ علیحدگی کے اسباب ہیں۔ اس سلسلہ میں سیّد صاحب کو مولوی مسعود علی ندوی (ناظم انتظامی دار المصنفین) سے بعض قلبی اذیتیں پہونچی تھیں، جس کی تفصیلات پیش نظر مجموعہ مکاتیب کے آخری چند خطوط خصوصًا مکتوب ع ۳۹۷ میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے سید صاحب نے ماجد صاحب کو یہ خطوط بالکل نجی حیثیت سے لکھے ہیں۔ اس لئے ایک خط میں انھوں نے مکتوب الیہ کو صاف لفظوں میں لکھا ہے "مہربانی کرکے اس خط کو چاک کر دیجئے گا۔"[1] اس قسم کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب سلوک و طریقت اور ترک دنیا کی راہوں پر گامزن ہونے کے باوصف بشریت کے دواعی و تقاضوں اور فطری جذبات سے مبرّا نہ تھے۔ بہرحال اس امر خاص میں بھی سیّد صاحب کی یہ عالی ظرفی لائق تحسین ہے کہ انھیں دار المصنفین میں اپنے بعض احباب خاص سے جو روحانی و قلبی اذیت پہونچی اس کا اعلان و تشہیر کبھی مجمع عام میں نہیں کیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ مکتوبات سلیمانی تاریخ و ادبی اعتبار سے ایک خاصہ کی چیز اور حیات سلیمانی کا مستند ترین ماخذ ہے۔ عبد الماجد صاحب نے یہ خطوط شائع کرکے ایک عظیم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ بلا شبہ یہ گراں مایہ مجموعہ مکاتیب شبلی، مکاتیب مہدی، غبار خاطر، اور اقبال نامہ کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

(۶)

مکاتیب سیّد سلیمان ندوی کے مذکورۃ الصدر تین مستقل مجموعوں کے علاوہ مختلف رسالوں میں مطبوعہ متفرق خطوط کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) مکاتیب سید سلیمان ندوی بنام سید عبد الحکیم دسنوی
رسالہ معارف اعظم گڈھ اکتوبر، نومبر ۵۵ء۔ ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۶۰ء

---

[1] مکتوبات سلیمانی ج ۳، ص ۲۲۹۔

(۲) مکاتیب سید سلیمان ندوی بنام مولانا ظفر احمد عثمانی

رسالہ معارف، جون، جولائی ۶۰ء

(۳) مکاتیب سید سلیمان ندوی بنام شاہ معین الدین احمد ندوی

رسالہ معارف، فروری تا اگست ۵۷ء

(۴) سید سلیمان ندوی کے خطوط مختلف مشاہیر اہل علم و ادب کے نام

رسالہ نقوش لاہور۔ مکاتیب نمبر جلد اول

سیّد عبدالحکیم دسنوی رشتہ میں سید صاحب کے چچا ہوتے تھے، مگر دونوں میں حقیقی چچا بھتیجے جیسے تعلقات تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کو بہت مانتے تھے۔ سید عبدالحکیم کا سب سے بڑا کارنامہ دیسنہ کا اردو کتب خانہ ہے۔ جو اس لحاظ سے بے مثل ہے کہ اس میں اردو کی اکثر مطبوعہ کتابیں، بکثرت نادر مخطوطات اور پرانے اخبارات و رسائل کے مکمل فائل موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ تمام تر موصوف کی کوشش کا نتیجہ تھا، اور اسے انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اب یہ نادر و بیش قیمت کتب خانہ "دیسنہ کلکشن" کے نام سے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی زینت ہے۔ عبدالحکیم دسنوی سید صاحب کی ہر ترقی اور اعزاز پر بے انتہا مسرور ہوتے تھے، اسی طرح سیّد صاحب بھی اپنے تمام نجی حالات اور علمی و قومی مسائل کی اطلاع خطوط سے برابر ان کو دیتے رہتے تھے۔ اسی باعث سید صاحب کے مکاتیب کا سب سے بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ دونوں میں ۱۹۰۴ء سے لے کر سید صاحب کی وفات ۵۳ء یعنی تقریباً نصف صدی تک خط و کتابت رہی۔ یہ تمام خطوط عبدالحکیم صاحب نے محفوظ رکھے اور سید صاحب کی وفات کے بعد دارالمصنفین کے حوالے کر دیئے جو اس کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان میں سے ۲۹؍اہم مکاتیب علامہ سیّد صاحب کے آثار ادبیہ کے طور پر "معارف" کے مذکورہ بالا متعدد نمبروں میں شائع ہوئے۔ پہلا خط ۱۵؍اگست ۱۲ء کو پالن جی ہوٹل بمبئی سے لکھا گیا ہے۔ اس طویل مکتوب کی حیثیت ایک سفرنامہ کی ہے۔ رسالہ معارف کے دس صفحات کو محیط یہ خط بڑی قیمتی جغرافیائی و تاریخی معلومات کا خزینہ ہے۔ اواخر جولائی ۱۹۱۲ء میں مدراس محمڈن کانفرنس کا اجلاس بنگلور میں ہوا تھا۔ سید صاحب نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ یہ ان کا جنوبی ہند کا پہلا سفر تھا۔ اس سفر

میں وہ مدراس، بنگلور، سرنگا پٹم اور وانمباڑی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے بمبئی پہونچے تھے۔ پیش نظر مکتوب میں اسی سفر کی روداد انھوں نے سید عبدالحکیم صاحب کو لکھی ہے جو مختلف حیثیتوں سے دلچسپ اور پر از معلومات ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ سے سیّد صاحب کی نگاہ کتنی حقیقت نگر تھی۔ اس طویل خط کا ایک اہم اور انشا پردازانہ اقتباس پیش خدمت ہے۔ سیّد صاحب سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان کے مزار پر بھی حاضر ہوئے تھے۔ مقبرہ کے ظاہری نقش و نگار کی دلکش مرقع کشی کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:۔

> "سلطان ٹیپو کی قبر پر سرخ چادر چڑھی تھی۔ سرخ چادر اس خونی پیرہن کی طرف اشارہ ہے جو سلطان پہنے سو رہا ہے۔ او شیر میسور اٹھ! کہ اسلام اب تیری مدد کا محتاج ہے۔ ایک آواز تھی جو زبان سے بے اختیار نکلی اور جس کو صرف گوش دل نے سنا۔ مگر ہائے مہمان نواز عاشق اسلام سلطان کے لب گور نے کوئی جواب نہ دیا۔ فرط محبت سے جی چاہا گستاخانہ قبر سے لپٹ کر ایک چیخ ماروں۔ لیکن خدام ادب نے آواز دی۔ ادب! ادب! آخر ہاتھ اٹھا کے اور فاتحہ کے چند پھول چڑھا کر با چشم نم باہر نکل آیا۔"[1]

اس کے بعد سلطان ٹیپو کے نمک حرام وزیر میر صادق کی قبر کے پاس سے گذر ہوا تو:۔

> "میرے رفیق نے بیان کیا کہ اس کی قبر پر جوتوں کا ڈھیر ہے جس زائر کا وہاں سے گزر ہوتا ہے۔ اب تک جوتوں کی نذر اس کی قبر پر پیش کرتا ہے۔ دل نہ چاہا کہ دامن چشم اس مجرم اسلام کے دیدار سے آلودہ کروں۔"[2]

معارف میں عبدالحکیم دسنوی کے نام سید صاحب کے مطبوعہ خطوط سے جہاں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے باہم غیر معمولی قلبی تعلق اور مودت و اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں سید صاحب کی شخصیت و کردار کے متعدد روشن پہلو، دوسرے اکابر اہل علم کے بارے میں

---

[1] [2] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ۔ اکتوبر ۵۵ء ص ۳۰۸، ۳۰۹۔

ان کی مختصر مگر جامع رائیں اور مختلف امور میں ان کے مخصوص افکار و نظریات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک خط میں اپنی ماہانہ محدود آمدنی اور مصارف کی تفصیل درج کی ہے۔ ان مصارف میں سالانہ چندوں کی فہرست بھی شامل ہے جو سید صاحب دوران سال پابندی سے ادا کرتے تھے[1]۔ ایک مکتوب میں ترکی کی مشہور خاتون اہل علم خالدہ ادیب خانم کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

> " بہت سنجیدہ، فہیم، متین اور عفت مآب خاتون معلوم ہوتی ہیں، لباس بھی ساتر ہے "[2]

مہدی افادی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

> " ہاں مہدی حسن صاحب کے زور قلم کا کیا کہنا، بڑے رنگیلے ہیں "[3]

ایک خط میں اپنے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

> " میں پالٹیکس سے گھبراتا نہیں اور نہ سیاست کے خطرات سے خوف زدہ ہوں لیکن قوم مجھ سے دو میں سے ایک ہی کام لے سکتی ہے، یا علم کی خدمت یا سیاست، خدمت علم سکون اور اطمینان کی طالب ہے اور سیاست ہنگامہ آرائی اور شور و غل کی مقتضی۔ جب تک دار المصنفین اور تکمیل سیرت کی زنجیر اپنے پاؤں سے نہ کاٹوں اس دنگل میں کود نہیں سکتا کہ ایک وقت میں یہ دونوں کام نہیں ہو سکتے۔ بایں ہمہ آپ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنے اس گوشۂ عافیت سے نکل کر دنگل میں کود بھی جاتا ہوں "[4]

---

[1] [2] "معارف" ۔ ماہ نومبر ۵۵ء ص ۳۸۸، ۳۹۴ ۔

[3] ″ ″ ستمبر ۶۰ء ص ۲۲۳ ۔

[4] ″ ″ ″ ″ ص ۲۲۶ ۔

غرض پیش نظر خطوط میں خالص نجی نوعیت کے معاملات سے لے کر دارالمصنفین کے امور، علمی مصروفیات اور سیاسی مشاغل تک سب کا ذکر نہایت بے تکلفی، شگفتگی، اور برجستگی کے ساتھ ملتا ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے حقیقی بھانجے، اور ہم زلف تھے۔ بڑے صاحب فضل وکمال اہل علم تھے۔ سیّد صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ سیّد صاحب مولانا تھانوی کی نسبت سے ان کو اپنا مخدوم سمجھتے اور بہت احترام واکرام کرتے تھے، جس کا اندازہ ان تعظیمی القاب سے ہوتا ہے۔ جو سید صاحب اپنے خطوط میں ان کو لکھا کرتے تھے۔ مولانا عثمانی کے نام سیّد صاحب کے ۱۳ خط رسالہ معارف جون جولائی ۷۶ء میں شائع ہوئے ہیں، ان میں سے اکثر علمی نوادر ونکات اور تحقیق روایات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ۴؍ اگست ۴۴ء کا پورا خط مسئلہ اسم اعظم کی تحقیق سے متعلق ہے، جس کی ہر سطر تلاش وتحقیق اور جودت فکر ونظر کی آئینہ دار ہے۔ اس میں حافظ سیوطی کی درمنثور اور الدرالمنظم، شیخ عبدالحق دہلوی کی اشعۃ اللمعات، نظام الدین اولیاء کی فوائد الفواد، اور شیخ طاہر فتنی کی مجمع البحار کے حوالوں سے اس مسئلہ میں اپنی رائے کو مدلل ومبرہن کیا ہے[1]۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ”عنایت نامہ کا شکریہ! عتاب ہی سہی پھر بھی یہ خطاب میری سعادت مندی کا نشان تھا کہ آپ کے عربی منظومات میں میرے ذریعہ چند سطروں کا اضافہ ہو جاتا“[2]

سیّد سلیمان ندوی کے متفرق خطوط میں سب سے بڑا محفوظ ذخیرہ مولانا شاہ معین الدین ندوی کے نام ملتا ہے۔ شاہ صاحب کو سید صاحب سے تلمذ خاص اور پھر دارالمصنفین میں ان کی جانشینی کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے سید صاحب کے خصوصی دامان تربیت سے وابستہ رہ کر تصنیف وتالیف کی تربیت حاصل کی تھی۔ اور پھر تا دم واپسیں اسی آستانہ علم وتصنیف کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ سید صاحب تک دارالمصنفین

---

[1] [2] رسالہ معارف، جون ۷۶ء ص ۴۶۶، ۴۶۸۔

میں موجود ہے۔ اس وقت سفر کے علاوہ شاہ صاحب سے خط و کتابت کی نوبت نہ آتی تھی۔ مگر قیام بھوپال سے لے کر وفات تک شاہ صاحب سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے نام سید سلیمان ندوی کے ۴۴ خطوط کا پیش نظر ذخیرہ اسی زمانہ کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلا خط ۳ جون ؁۴۶ء اور آخری خط ۲۳ جون ؁۵۳ء کو لکھا گیا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ مختلف حیثیتوں سے بڑی اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔ اس میں خورد نوازی بھی ہے۔ تعلیم و تربیت کا دلنشیں انداز، اور اس کے زرّیں اصول بھی۔ عالی ظرفی اور حوصلہ افزائی کے جلوے بھی ہیں۔ اور اپنے خوابوں کی حسین تعبیر دار المصنفین کی ترقی اور کامیابی کے لئے دل کی دھڑکنیں اور نیک تمنائیں و خواہشات بھی۔ ایک خط میں سیرت النبی جلد ہفتم کی تکمیل کی فکر ظاہر کی ہے۔[1] ایک مکتوب میں دار المصنفین کے جدید نظام پر اپنی دلی مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھے آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی و طمانیت ہے جو کسی روحانی و جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کے دار المصنفین کا نقشہ دیکھ لیا۔"[2] پھر لکھتے ہیں "معارف میں آپ کے شذرات پڑھے۔ بحمد اللہ آپ نے شذرات کے معیار کو قائم رکھا۔ "س" اور "ش" میں شاید ہی کوئی فرق محسوس ہو، وللہ الحمد۔"[3] ایک خط میں دیسنہ سے آموں کے بارے میں کتنے لطیف و دلچسپ انداز میں رقمطراز ہیں:۔

> "آج کچھ دسہری، سپیدے اور لنگڑے ٹوٹنے کی امید ہے،
> ثمر بہشت کے دانے اچھے آئے ہیں مگر افسوس کہ پدر بزرگوار اوّل
> کی طرح مجھے اس "ثمر بہشت" سے محروم رہنا پڑے گا۔ یعنی اس سے
> پہلے بہشت زار دیسنہ سے نکلنا پڑے گا۔"[4]

سید صاحب کو اپنے لگائے ہوئے چمنستان علم دار المصنفین سے کتنا والہانہ تعلق تھا اس کا

---

[1] [2] [3] رسالہ معارف، فروری ؁۵۷ء ص ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴۔
[4] " " اپریل ؁۵۷ء ص ۳۰۹۔

اندازہ ایک خط کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ بھوپال سے لکھتے ہیں:۔

> ”یہاں سرکاری مہمان خانہ میں ہوں۔ بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آیند مستقبل ہے۔ مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے...... وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے ؎

حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر　　خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد　　می گفت گدا بودن کنعان خوشتر“[1]

ایک مکتوب میں شاہ صاحب کو لکھتے ہیں:۔

> ”بہتر ہے شذرات نہ بھیجیں۔ مقصود یہ ہے کہ لہجہ میں، خیالات میں، تعبیر میں، ہر چیز میں اعتدال ملحوظ رہے۔ سیاسیات کا میدان آج کل تنگ ہے۔ ملک کا نقشہ بدل گیا ہے۔ اس لئے آپ کا قلم محتاط رہے۔ تنقید میں اعتدال ہو، ابتذال نہ ہو“[2]

نومبر ۵۷ء میں رسالہ نقوش لاہور نے دو ضخیم جلدوں میں مکاتیب نمبر شائع کیا، جس میں مشاہیر اہل علم و ادب اور ارباب فضل و کمال کے ایسے نایاب و نادر خطوط تلاش کر کے یکجا کئے گئے ہیں جو اس سے قبل کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ہوتے، چنانچہ اس خصوصی نمبر کی پہلی جلد میں سید سلیمان ندوی کے بھی ۶۱ غیر مطبوعہ نایاب خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط حسب ذیل ارباب فضل و کمال کے نام لکھے گئے ہیں۔ ہمایوں مرزا، نواب سیّد علی حسن خاں، محمد عبد اللہ قریشی، عبد العزیز میمن، ڈاکٹر سید عبد اللہ، مولوی محمد عرفان، صغریٰ ہمایوں، امتیاز علی عرشی، اثر صہبائی، نصیر الدین ہاشمی، غلام رسول مہر، نواب شمس الحسن، سیّد الطاف علی بریلوی، محمد امین زبیری، مالک رام، عبد الرزاق کانپوری، تمکین کاظمی، عبد الباری علیگ۔ یہ تمام خطوط نہایت بیش قیمت علمی نکات، تحقیقی نوادر

---

[1] رسالہ معارف، اپریل ۵۷ء ص ۳۱۱۔
[2] ″ ″ اگست ۵۷ء ص ۷۰۔

اور ادبی جواہر سے مالا مال ہیں۔ اور ندوہ و دار المصنفین کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ذیل میں بعض تاریخی اہمیت کے حامل خطوط کے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کو ۸ر مارچ ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

> "میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں غایت بے تکلفی سے بعض ایسے واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی آغاز شباب کے لئے ہوتے ہیں۔ دور جوانی افتد چنانکہ تو دانی۔ مگر اب جب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے، گناہ کا ستر چاہیئے نہ کہ تشہیر۔ اس لئے از راہ عنایت بلکہ اس دوستی کے ناتے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالیے تاکہ ان کا نام نیک ضائع نہ ہو، اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں۔ آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدر دانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی بالکل غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے، اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے۔"[1]

مالک رام کو ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

> "خطوط شبلی معمولی خطوط ہیں، حسن و عشق کی داستان کا رنگ اس کو مولوی عبدالحق اور امین زبیری نے دیا ہے۔ نہ مجھے اس سے واقفیت ہے اور نہ وہ میرے علم میں ہے اس لئے میں لکھنے سے قاصر ہوں۔ جو صاحب اس سے واقف ہوں وہ لکھیں۔ چنانچہ امین زبیری نے ابھی تبصرہ بر حیات شبلی چھاپا ہے۔ اس میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو سر تا پا ظن فاسد ہے۔"[2]

---

[1] [2] رسالہ نقوش مکاتیب نمبر ج ۱، ص ۵۱۲، ۵۱۵۔

(۷)

سیّد سلیمان ندوی کے خطوط میں شگفتگی، دلکشی اور حسن انشا کے وہ نمونے صحرا میں نخلستان کی حیثیت رکھتے ہیں جو شبلی، مہدیؔ اور ابوالکلام کے مکاتیب کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بایں ہمہ سیّد صاحب کے اسلوب کے بنیادی عناصر اعتدال و توازن اور عالمانہ وقار سے ان کے تمام خطوط معمور ہیں۔ اہل نقد نے خط کی خوبی اس کی قطعیت، لطافت، ایجاز و جامعیت، تنوع، دلچسپی، ہم کلامی اور اس میں انس و موانست کی فضا کو قرار دیا ہے۔ سید صاحب کے خطوط ان تمام محاسن کے حامل ہیں۔ وہ اکثر چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملے لکھ کر کوزے میں دریا بند کر دیتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں تمکین کاظمی کو لکھتے ہیں:۔

> "نوازش نامہ ملا۔ ادبی خدمت کا یہ نیا جوش مبارک ہو۔ باقی
> میرا حال تو یہ ہے کہ ؎
> گئے وہ دن ٹکٹکی باندھنے کے   اب آنکھیں رہتی ہیں دو دوپہر بند
> معذرت خواہ ہوں۔ والسلام"[1]

مولانا مسعود عالم ندوی کو لکھتے ہیں:۔

> "آپ کا آنا مبارک مگر آج کل دن کو بہار لائٹ ریلوے سے سفر عذاب الیم ہے۔ جس سے ہر مومن کو پناہ مانگنی چاہیئے۔ کوئی چھینٹا پڑے تو قصد کیجیے۔"[2]

شاہ معین الدّین احمد ندوی کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۱؍ جون ۵۰ء میں رقمطراز ہیں:۔

> "سنا ہے کہ آپ کی طلبی مدرسہ عالیہ کلکتہ سے آئی تھی۔ کیا یہ سچ ہے، ابھی تو آغاز ہے ؏
> اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"[3]

---

[1] رسالہ نقوش مکاتیب نمبر ج ۱، ص ۵۱۵۔ [2] مکاتیب سلیمان نمبر ص ۱۲۵۔
[3] رسالہ معارف، فروری ۵۶ء ص ۱۴۶۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سید صاحب کے خطوط کا ایک امتیازی وصف "فرحت افزائی، اور نکتہ آفرینی" قرار دیا ہے۔[1] اس کے نمونے ان کے ذخیرہ مکتوب میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں۔ اثر صہبائی کے نام ۱۵ ستمبر ۳۳ء کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:-

> "صہبائی من شاد باد زندہ باد۔ کل آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ انسانوں کی کمی نہیں انسانیت کی کمی ہے آپ کے خط سے آپ کے بلند اخلاق، متواضع خو اور متین طبیعت کا اندازہ ہوا۔ آپ میرے الفاظ سے مایوس نہ ہوں۔ ترقی، اور کمال ایسے ہی لوگوں کی قسمت ہے۔ آپ کے مشیران نے آپ کو مشورہ دینے میں کمی کی ہے۔ آپ نے مشورہ لینے میں کمی نہیں کی ہے۔"[2]

سیّد صاحب القاب لکھنے میں بڑی نکتہ آفرینی کا ثبوت دیتے تھے، مثلاً نصیر الدّین ہاشمی نے اپنے نو تعمیر مکان کا نام "بیت الفضل" رکھا تھا۔ سید صاحب ان کے نام کے ایک خط میں "صاحب الفضل" کے لقب سے خطاب کرتے ہیں۔[3] عبدالماجد دریابادی جس زمانہ میں امن عالم کے داعی تھے۔ اس وقت سید صاحب انھیں اپنے خطوط میں "قاصد امن کو سلام" سے مخاطب کرتے ہوئے خط کا آغاز کرتے تھے۔ سیّد صاحب نے اپنے بکثرت خطوط میں سلام پہونچانے کا انداز بھی بڑا انوکھا و نرالا اور دلکش اختیار کیا ہے۔ مثلاً غریب الدیار کا سلام لیجئے،[4] السلام علی مبلغ السلام،[5] مہاجر وطن کا سلام لیجیے،[6] غریب الدیار کی طرف سے سلام نیاز قبول ہو،[7] محکوم قوم میں پیام امن کی تبلیغ کرنے والے کو سلام،[8] مشتاق دیدار کو سلام[9] کرم فرمائے من آداب عرض ہے۔[10] سلام نیاز و محبّت۔[11]

---

[1] [2] [3] رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر ج ۱، ص ۵۰۰، ۵۰۳۔

[4] [5] [6] [7] [8] [9] برید فرنگ، ص ۱۴۵، ۱۳۵، ۱۲۷، ۱۳۳، ۹۰، ۱۸۲۔

[10] رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر ج ۱، ص ۵۱۴۔

[11] برید فرنگ، ص ۵۸۔

اعلیٰ درجہ کی خطوط نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کے ذاتی احساسات و جذبات اس کے تار و پود میں یوں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ مکتوب نگار کی شخصیت کی تصویر ان کے بغیر مکمل نہیں کی جا سکتی۔ ان میں شخصی انشائیے کا رنگ آ جاتا ہے۔ سیّد سلیمان ندوی کے بہت سے خطوط میں، ان کے جذبات دروں، ان کی تمنائیں و حسرتیں، ان کا ذہنی کرب، ان کی پسند و ناپسند اور ان کا کیف و سرور پوری طرح نمایاں ہے۔ بلکہ اگر مکتوب نگاری کے لوازم مثلاً القاب و آداب کو حذف کر دیا جائے تو کسی نہایت اعلیٰ پایے کے انشائیے کا ایک حصہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ "برید فرنگ" میں عبدالماجد دریابادی اور مسعود علی ندوی کے نام سید صاحب کے بعض خطوط شخصی انشائیے کا اعلیٰ نمونہ ہیں[1]۔ بلکہ کچھ خطوط تو اس سے بھی آگے بڑھ کر خالص فن انشائیہ کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں، اسی طرح سید صاحب کے بعض مکتوبات نام کو تو خط ہیں۔ لیکن اگر ابتدائی تمہیدی سطور حذف کر دی جائیں تو درحقیقت وہ ایک علمی و تحقیقی مقالہ بن جائیں۔ اس کی ایک بہترین مثال مسعود عالم ندوی کے نام سید صاحب کا وہ طویل خط ہے جس سے تصوف کی حقیقت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی پڑتی ہے[2]۔ ذیل کے ایک خط میں بلاغت کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔ سید صاحب اپنے پاکستانی شاگرد مسعود عالم ندوی سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ازراہ مصلحت اندیشی کس بلیغ رمز و کنایہ میں استفسار کرتے ہیں:۔

> "معلوم نہیں آپ کے "ہمسایہ" کا کیا حال ہے۔ مجھے اس کا بڑا
> تعلق خاطر رہتا ہے۔ وللہ الامر من قبل ومن بعد"[3]

ذیل میں رعایت لفظی سے ادبی لطافت و حسن پیدا کرنے کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

> "سیرت رعد[4] کو دی کہ بجلی بن کر کام کریں مگر وہ پتھر ثابت
> ہوتے۔ عذرات غیر متناہیہ ہر مہینہ ایک متناہی الحد کارڈ پر

---

[1] برید فرنگ۔ ص ۱۳۴، ۱۴۵۔

[2] [3] مکاتیب سلیمان ص ۱۷۲ تا ۱۷۷، ۱۵۰۔

[4] یعنی منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس کانپور۔

> پہونچ جاتے ہیں، تنگ آگیا ہوں۔"[1]
>
> "ان کا (ظفر حسن خاں مصنف مآل و مشیت کا) ایک مضمون فن مطالعہ پر ہماری خوش طالعی سے آگیا ہے۔ زیر مطالعہ ہے"[2]
>
> "اثنائے نظر بندی میں مولانا ابوالکلام سے ملاقات باوجود اشتیاق نہ ہو سکی اس کا افسوس اور حسرت ہے۔ حسرت لندن جاتے ہیں۔"[3]

عبدالماجد دریابادی کی اہلیہ کو توام بچوں کی پہلی ولادت ہوئی جن میں ایک بچہ اسی وقت فوت ہو گیا۔ سید صاحب اپنے خط میں اس کا ذکر کس پیرائے میں کرتے ہیں:۔

> "مبارک! باپ بننا مبارک! آپ بڑی تیزی سے ایک کے بجائے دو خزانۂ غیب سے اٹھا کر چل دیئے۔ فرشتوں کو معلوم ہوا تو جرم غفلت سے بچنے کے لئے ایک واپس چھین لے گئے۔ عالم ملکوت کا ایک فلسفی پر مستثنیات کا تجربہ ایک بلیغ حملہ ہے۔"[4]

ماجد صاحب سے کتنے بلیغ انداز میں مضمون کا مطالبہ کرتے ہیں:۔

> "آپ گلہ کرتے ہیں کہ (معارف میں) مذہبی رنگ تیز ہے، لیکن میں نے آپ کو اور مولوی عبدالباری صاحب کو پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ اگر مشرقیات کا جلوہ اس میں زیادہ روشن ہے تو یہ عاشقان مغربیت کا قصور ہے۔ اب بھی رحم فرمائیے"[5] (یعنی معارف کے لئے مضمون بھیجئے)۔

انس و موانست کی فضا اور غالب کا مکالمہ والا انداز ملاحظہ کرنے کے لئے عبدالحکیم دسنوی کے نام ایک خط کا حسب ذیل اقتباس پیش خدمت ہے:۔

> "آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں، اور پھر اس "عیش" کے ساتھ خط

---

[1] [2] مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۵۴، ۶۰ - [3] رسالہ معارف، ستمبر سنہ ۶۰ء ص ۲۲۴ -

[4] [5] مکتوبات سلیمانی ج ۱، ص ۴۷، ۵۸ -

لکھنے بیٹھا ہوں کہ داہنے ہاتھ میں قلم اور بائیں میں "فتح پیچ" کی نَے ہے
عمدہ خوشبودار تمباکو بھرا ہوا ہے۔ اب میں باقاعدہ حقہ پی لیتا
ہوں۔ یاد رکھئے میرے سامان ضیافت میں یہ چیز بڑھانا پڑیگی۔
اب صرف پانیٔ مسلم کی ایک گلوری پان پر خاطر مدارات ختم
نہیں ہوگی۔ ہاں تو ایک فقرہ لکھتا ہوں اور پھر سوچ کر دوسرا
فقرہ لکھنے کی کوشش میں ایک کش کھینچ لیتا ہوں۔ لیجئے یہ فقرہ
اتنا لمبا ہو گیا کہ دھواں غائب ہو گیا۔ اب ذرہ ٹھہریئے، پھر
نَے میں دھواں بھر لوں تو آگے کوئی دھواں دھار مضمون لکھوں"۔[1]

خطوط سلیمانی میں ادبی حسن تلاش کرنے کے لئے چند اور نمونے بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:۔

" رمضان شریف تو یہاں بھی تشریف لائے تھے۔ کوئی دو گھنٹہ
ہوئے کہ رخصت ہوئے ہیں۔ کل عید ہے"۔[2]

" ہر کشتی کسی مرد یا صنف نازک کی انگلیوں سے حرکت کرتی
ہوئی کسی نہ کسی جھاڑی میں پہونچ کر گھنٹوں آرام کرتی ہے
..... اس ارضی جنّت میں آکر فرشتہ غیب کی جو پہلی آواز
آپ کے کانوں میں آئے گی، وہ اعلموا ما شئتم ہے"۔[3]

" باغ کے ایک طرف "لذت شب" سوداگروں کا بازار ہے
تماشا خود محو خرام ہے، اور تماشائی زر در جیب چکر کاٹ رہے
ہیں۔ ایک اور طرف رقص و سرود کا سامان ہے"۔[4]

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سیّد صاحب کی مکتوب نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے
رقمطراز ہیں:۔

" علامہ اقبالؔ مرحوم کے خطوط اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ

---

[1] رسالہ معارف، ستمبر ۴۰ء ص ۲۳۱۔
[2] [3] [4] برید فرنگ ص ۱۱۷، ۱۱۴، ۱۴۰۔

وہ ایک بڑے شاعر کے خطوط ہیں جو ان کے ذہن اور نظام فکر سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، لیکن ان میں انشا پردازی کا کمال نہیں ہے۔ ان کی عبارت کہیں انگریزی کے شکنجہ میں گرفتار ہے اور کہیں فارسی کے۔ ان کے مقابلہ میں علامہ سیّد سلیمان ندوی کے خطوط کہیں زیادہ دلچسپ ہیں، جن میں دوراندیشی اور انشاپردازی بھی ہے۔“ [1]

---

[1] خواجہ احمد فاروقی: ”اردو خطوط کے پچیس سال“ (مضمون) مشمولہ رسالہ ساقی جوبلی نمبر، ص ۱۲۴۔

باب پنجم

شاعری

علم و ادب کی تاریخ میں علامہ سید سلیمان ندوی ایک باکمال عالم و محقق اور مؤرخ و سیرت نگار کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے اور اس حیثیت سے ان کی شہرت و عظمت کے سامنے ان کی دوسری مثلاً ادبی، شعری اور تنقیدی حیثیتوں کا چراغ روشن نہ ہو سکا، اب رفتار زمانہ نے انھیں ایک ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے تو تسلیم کرا بھی لیا ہے، لیکن ان کے بلند شعری ذوق اور معیاری مذاق سخن گوئی کا علم اب بھی خال خال ہی لوگوں کو ہے۔ حالانکہ سید صاحب کے کلام میں ناسخ کی مہارت زبان، شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی، آتش کی مرصع سازی اور جوہر مردانگی، شاہ نصیر اور ذوق کی صنعت گری اور فنی کاوش، داغ کا منفرد لب و لہجہ، امیر مینائی کی شستگی اور بیان کی صفائی اور جلال کا سحر زبان غرض وہ سب کچھ ہے جن کا لکھنوی دبستان شاعری کے نمایاں اور اہم ممیزات میں شمار ہوتا ہے۔

اس کے گوناگوں وجوہ ہیں۔ دراصل سید صاحب ایک باکمال شاعر ہونے کے باوجود خود کبھی اس کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ اپنے اس ذوق کو ایک "جرم" اور "عیب" قرار دے کر "رمز" و اشارہ کے پردے میں چھپانے کی سعی کرتے رہے[1] لیکن ان کے ایک مسترشد غلام محمد نے "ارمغان سلیمان" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا۔ اس طرح یہ مہر بند خزانہ اب وقف عام ہو گیا ہے۔ اس سے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر سید صاحب نے شاعری کے کوچہ کو خیرباد کہہ دیا ہوتا تو اس میدان میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ مگر ان کے صحیفہ تحقیق و تصنیف نے صحیفہ شاعری کو منسوخ کر دیا اور علمی و تحقیقی

---

[1] سید سلیمان ندوی: "میں جن سے متاثر ہوا" (مضمون) معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۶۔

کارناموں کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ کر رہ گئی[1]

سید صاحب کے دفتر کمال کی اس حیثیت کی جانب ابھی تک کسی نے خاطر خواہ اعتنا نہیں کی ہے۔ غالباً سب سے پہلے ان کے خویش سید حسین نے معارف کے سلیمان نمبر میں "حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں سید صاحب کے صرف اس عہد کے کلام کا جلوہ دکھایا گیا ہے جب انھوں نے اپنی جبین نیاز آستانہ اشرفی پر جھکا دی تھی اور ان کے جذبات و واردات قلبی شعر کے قالب میں ڈھل رہے تھے۔ اس کے بعد غلام محمد نے اپنے مرتبہ ارمغان سلیمان کے مقدمہ میں سید صاحب کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا اور غالباً آخری مضمون شاہ معین الدین ندوی کا ہے جو رسالہ معارف جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں نسبتہً وضاحت کے ساتھ سید صاحب کے مرتبہ شاعری اور ان کے ذوق شعر و سخن کی تعیین و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲)

سید سلیمان ندوی کو صغر سنی میں بیت بازی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اسی بیت بازی سے پڑی[2] بقول مناظر احسن گیلانی آج سے ساٹھ ستر برس پہلے بہار میں یہ عام دستور تھا کہ کسی گاؤں میں جب دوسرے گاؤں سے بارات آتی تھی تو طرفین کے بچے عموماً شعر لڑایا کرتے تھے۔ اس علمی معرکہ کا نام اس زمانہ میں "بیتا بحث" تھا۔ برات آنے سے چند ماہ پیشتر مکتب خانے کے بچے اس بیتا بحث کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے۔ کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی اس سلسلہ میں مروج تھیں۔ جن سے اس معرکہ کو سر کرنے میں مدد ملتی تھی۔ ان ہی کتابوں کے اشعار لڑکے زبانی یاد کرتے تھے[3] سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے جن مکاتب میں

---

[1] شاہ معین الدین احمد: ارمغان سلیمان (مضمون) معارف جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۲۔
[2] سید ابوظفر: بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۴۸۔
[3] مناظر احسن: سید الملت کی مکتبی زندگی (مضمون) مشمولہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۲۲۔

حاصل کی ان میں بیت بازیوں کا بڑا زور تھا۔ وہ ان میں نہ صرف پوری تیاری اور ذوق و شوق سے شریک ہوتے بلکہ اپنے گروہ کے امام و سرخیل بنائے جاتے۔ ابوظفر ندوی لکھتے ہیں :

> "علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص حکیم نجم الہدیٰ ندوی تھے۔ اور دوسری کے مولوی محمد قاسم اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے خاص لگاؤ ہو گیا اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے" [۱] "

بیت بازی کے سلسلہ میں سید صاحب نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی۔ جس میں بلامبالغہ ہزاروں اشعار درج تھے۔ اس بیاض کے ایک جانب عربی اور دوسری جانب اردو اشعار تھے [۲]۔ چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے اس لئے سید صاحب کو تقطیع کی طرف بھی خاص توجہ کرنا پڑی اور اس کے باعث ان کو فن عروض پر اس قدر عبور حاصل ہو گیا تھا کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی [۳]

گاؤں کی مکتبی زندگی سے نکل کر وہ ۱۸۹۸ء میں مزید تحصیل علم کے لئے پھلواری شریف (پٹنہ) آئے۔ یہاں خانقاہ مجیبی میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ جس کے اثر سے پورے قصبہ میں شعر و سخن کا ذوق عام تھا [۴]۔ مزید برآں پھلواری میں سید صاحب کا قیام جس کمرے میں تھا اس کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبد اللہ رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی معشوق ایک پُرگو شاعر تھے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ سید صاحب بھی بہت دلچسپی اور شوق سے اس مجلس میں شریک رہتے۔ ان کو بیت بازیوں سے اس کا چسکہ تو پہلے ہی پڑ چکا تھا۔ اب یہاں کی قوالی کی محفلوں میں شرکت اور اس ماحول نے ان کے شعر و سخن کو اور جلا عطا کی۔ وہ خود اپنے ایک ریڈیائی مضمون میں رقم طراز ہیں :

---

[۱] سید ابوظفر : بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۴۹۔

[۲] ایضاً ص ۵۳۔

[۳] ایضاً ص ۴۹۔

[۴] شاہ معین الدین احمد : حیات سلیمان ص ، و سید نجم الہدیٰ : سید صاحب کی یادیں، معارف نومبر ۵۹ء

> ”یہاں (پھلواری شریف) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس لی۔ اور یہیں میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول ”منصور موہنا“ دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا[1]۔“

بہار کی مختلف درسگاہوں میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے کے بعد جب ۱۹۰۱ء میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لئے لکھنو پہونچے تو گویا شعر و سخن کے اصل گہوارہ میں آ گئے۔ خود ندوہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے جس میں رکن الدین داناؔ، تجمل حسین شاہ جہانپوری، مصطفیٰ خاں ملیح آبادی، عبدالغفور شررؔ، سید عثمان گیلانی، ظہور احمد وحشیؔ، اور مولانا عبدالسلام شمیم (صاحب شعرالہند) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا طرحی یا غیر طرحی کلام سناتے تھے[2] لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا میں ان کی شاعری کا نشہ دو آتشہ ہو گیا اور ان کا ذوق سخنوری نکھر کر درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقم طراز ہیں:

> ”جس زمانہ میں سید صاحب مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے لکھنؤ کی پوری فضا پر شاعری چھائی ہوئی تھی ..... اس فضا نے سید صاحب کی شاعری کا نشہ تیز کر دیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے[3]۔“

سید ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:

> ”...... اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض اور مضطر وغیرہ بقید حیات تھے۔ عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف

---

[1] سید سلیمان ندوی: ”میں جن سے متاثر ہوا“ (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۷۔

[2] نجم الہدیٰ: سید صاحب کی یاد میں (مضمون) معارف نومبر ۵۹ء ص ۳۴۲۔

[3] شاہ معین الدین: ارمغان سلیمان معارف جولائی ۷۱ء ص ۱۰۔

> تھا پیام یار نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا مرثیے کی محفل اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ علامہ موصوف ان میں شرکت کرتے کرتے خود بھی شعر کہنے لگے۔ اور بالآخر ایک باکمال شاعر بن گئے۔[1]،،

(۳)

سید صاحب کا عہد لکھنؤ میں شعر و سخن کی بہار کا زمانہ تھا۔ پوری فضا امیرؔ، داغؔ اور جلاؔل کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ سید صاحب امیرؔ مینائی سے بہت متائثر تھے۔ چنانچہ جب ندوہ میں طلبہ مشاعرہ کرتے تو جہاں بعض لڑکے اس میں داغؔ کی نقل کرتے سید صاحب امیرؔ مینائی کا روپ بھرتے۔ امیرؔ کا دیوان مرآۃ الغیب برابر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ وہ اپنے اشعار میں اسی رنگ تغزل کا چربہ اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ سید صاحب نے امیرؔ مینائیؔ سے اپنے تاثر کے آغاز کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے کہ" میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیرؔ و داغؔ کے معرکے تھے میرے ایک استاذ شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ جو جنرل عظیم الدین خاں کے زمانے میں رام پور میں رہے تھے اور وہاں منشی امیر احمد کی صحبت برسوں اٹھائی تھی وہ اکثر امیرؔ مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور ان کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیرؔ مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیلؔ مانکپوری کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق میرے ساتھ دار العلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعہ امیرؔ مرحوم کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیرؔ مینائی کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا[2]،،

سید صاحب کو امیرؔ مینائی کے سیکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی امیرؔ کے ماہر فن ہونے اور تحقیق لغت و زبان کے تو معترف تھے، لیکن ان کی غزل گوئی کے زیادہ قائل نہ تھے۔ لیکن سید صاحب کی زبان سے امیرؔ کے منتخب اشعار سنکر ان کو اپنی رائے

---

[1] ابوظفر: بچپن اور طالب علمی کے واقعات۔ معارف سلیمان نمبر ص ۵۳۔

[2] سید سلیمان ندوی: میں جن سے متاثر ہوا (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ؁۵۰ء ص ۱۱۔

میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنا اور سید صاحب کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے اس مکالمہ کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> "سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھا۔ ان کے علم و فضل کا سکہ کتنی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانیوالا کلامِ امیر کا حافظ نکلے گا۔ مرآۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانہ عشق کا پرستار یہ پہلی بار کھلا کہ حضرت بایں زہد و تقویٰ اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے[۱]"

اسی باعث سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام پر امیر مینائی کے رنگ سخن کے بہت نمایاں اور گہرے اثرات ملتے ہیں۔ وہی کلام کی ندرت، تازگی اور لطافت اور وہی حسنِ زبان، نزاکت اور لوچ جو امیر کے امتیازی خصائص شعری شمار ہوتے ہیں سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام میں درجہ کمال پر ملتا ہے۔

امیر مینائی کی پُرگوئی اور قادر الکلامی پر تو تمام نقاد متفق ہیں۔ لیکن ان کا رنگ سخن کافی متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کہنا زیادتی کی بات ہے کہ ناسخ اور داغ کے رنگ کی بے جا تقلید کے باعث امیر کی اپنی انفرادیت ابھر نہ سکی[۲] اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امیر کا پہلا دیوان "مرآۃ الغیب" خالص ناسخ و اسیر کے رنگ میں ہے[۳] بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر رنگ کے شعر موجود ہیں[۴] بحیثیت مجموعی امیر کی غزل گوئی پر لکھنو اسکول کی روایات کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں لکھنویت کے دائرہ میں رہ کر انھوں نے اپنے کلام میں ندرت، تازگی اور لطافت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی

---

[۱] عبدالماجد دریابادی: نقوش سلیمانی (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۰۔

[۲] احمر لاری: حسرت موہانی حیات اور کارنامے ص ۲۱۲ (ادبستان گورکھپور ۷۳ء)۔

[۳] احسن اللہ ثاقب: مکاتیب امیر مینائی، مقدمہ ص ۵۲ (نسیم بک ڈپو لکھنو ۶۴ء)۔

[۴] ممتاز علی آہ: امیر مینائی ص ۱۶۴ (ادبی پریس لکھنو ۴۱ء)۔

وہاں ان کے فن نے ارتقار کی منزلیں طے کر کے اپنی انفرادیت کا پرچم بھی لہرایا[۱] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرأۃ الغیب کے بارے میں، جس کے رنگ سے سید صاحب متاثر تھے، لکھتے ہیں:

> ”مرأۃ الغیب میں رعایت لفظی اور صنعت گری کے وہ نمونے موجود نہیں ہیں جو آتش اور ناسخ کے شاگردوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ بعض اشعار میں خارجی رنگ موجود ہے۔ لیکن بالعموم امیر نے جذبات نگاری کی طرف توجہ دی ہے[۲]،،

۱۹۱۲ء میں جب علامہ شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی تو سید صاحب نے اس میں بھی استاذ کی اتباع کا حق ادا کیا اور علامہ شبلی کی رحلت کے بعد متعدد نظمیں ہو بہو شبلوی رنگ میں لکھیں اور اہل فن سے استاذ کی ہم رنگی پر داد پائی چنانچہ ”نوحۂ استاذ،، کے بارے میں نواب عماد الملک نے انھیں لکھا تھا:

> ”آپ کی نظمیں علامہ شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں[۳]،،

(۴)

جس طرح سید صاحب کے علمی و تحقیقی فضل و کمال کے سامنے ان کی شاعرانہ حیثیت گم ہو کر رہ گئی اسی طرح ایک عرصۂ دراز تک ان کے شعری جواہر ریزے بھی پردۂ گمنامی میں رہے عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۵۵ء میں مجلہ معارف کے سلیمان نمبر میں سید صاحب کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ”سید صاحب کی شاعری پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے۔ پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لیکر ان کا سارا کلام یکجا تو کرے[۴]،،

---

[۱] ابو محمد سحر: مطالعہ امیر ص ۱۵۴ (نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۵ء)۔

[۲] ابواللیث صدیقی: لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۹۹۔ [۳] غلام محمد: ارمغان سلیمان ص ۲۳۲۔

[۴] غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۲۔

مقام مسرت ہے کہ اس تحریر کے ٹھیک دس سال کے بعد سید صاحب کے ایک مسترشد غلام محمد نے جولائی ۱۹۶۶ء میں کراچی سے ارمغان سلیمان کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ متوسط تقطیع کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ جس میں سید صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کو نمایاں و متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرتب کو اعتراف ہے کہ "یہ مجموعہ سید صاحب کے مشقِ سخن کا پورا سرمایہ نہیں بلکہ ان کی قلمی بیاض کی پوری پوری نقل ہے۔ اگر اضافہ ہے تو چند ایک قطعات یا ان نظموں کا جو کہیں اور چھپی ہوئی مل گئیں[1]" ارمغان سلیمان میں دور آخر (جو روحانی شاعری پر مشتمل ہے) کا کل خزانہ محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن دور اول کی قدیم ترین غزل اس مجموعہ میں ۱۹۰۴ء کی ملتی ہے۔ جبکہ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ سید صاحب نے پھلواری شریف کے زمانہ قیام (۱۸۹۹ء) ہی سے طرحی اور غیر طرحی مشق سخن شروع کر دی تھی۔ اس زمانہ کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ مولوی غلام محمد نے لکھا ہے:

> "دور اول کے ذخیرہ کے متعلق یقین نہیں آتا کہ شعر و سخن کی گرم بازاری اور سخن سنج جواں عمری کا حاصل صرف اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے خاصا حصہ محفوظ نہ رہ سکا ہو۔ اس گمان کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ اس مجموعہ میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کہیں تخلص بھی آیا ہو[2]"

ایسا قیاس ہوتا ہے کہ جس قلمی بیاض سے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی اور بیاض سید صاحب کے پاس رہی ہوگی جو مرور زمانہ سے معدوم ہو گئی۔ یا سید صاحب ہی نے بعد میں ایسے کلام کو جو خالص لکھنوی رنگ کا آئینہ دار تھا۔ ثقاہت و متانت کے منافی خیال کر کے تلف کر دیا ہو۔ بہر کیف سید صاحب کا جتنا کچھ بھی کلام ذوق شناسانِ ادب کے سامنے ہے وہ ان کے ذوقِ شعری اور مرتبہ سخنوری کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔

سید صاحب کے تخلص کا معاملہ بھی بڑا اہم ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے "رمزی"

---

[1] غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۱۔

[2] غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۱۔

تخلص لکھا ہے[1]۔ موصوف اپنے اس خیال میں بالکل منفرد ہیں۔ غالباً مولوی غلام محمد نے بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> "علامہ کے رفقاء کا کہنا ہے کہ وہ "رمزی" تخلص سے غزلیں کہا کرتے تھے[2]"

راقم سطور کے خیال میں علامہ سید سلیمان ندوی کا کوئی تخلص نہ تھا۔ عبدالماجد صاحب کا "رمزی" تخلص قرار دینا غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ سید صاحب اپنا بعض کلام معارف میں شائع کرتے تو اس کے نیچے واوین میں "رمزی" لکھا کرتے تھے مثلاً نظم "متاع حق گوئی کی بازار جہاں میں ارزانی" (معارف فروری ۱۸ء) اور "درس مساوات" (معارف اگست ۱۸ء) کے آخر میں بائیں جانب "رمزی" لکھا ملتا ہے۔ اسی طرح اکتوبر ۱۶ء کے معارف میں "رمزیات" کے عنوان سے کچھ اشعار درج ہیں۔ اور اس کے نیچے بھی "رمزی" تحریر ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا گیا کہ شاید سید صاحب کا تخلص یہی ہے۔ حالانکہ اس لفظ کو انھوں نے محض "سخن کا پردہ" بنایا تھا۔ جیسا کہ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں :

> "اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔ اگر چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا[3]"

شاہ معین الدین احمد ندوی رقم طراز ہیں :

> "وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے رہے اور اس کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی اس لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ اور جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں، وہ "رمزی" کے پردے میں ہیں[4]"

---

[1] عبدالماجد دریابادی : نقوش سلیمانی (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۱۔

[2] غلام محمد : ارمغان سلیمان مقدمہ، ص ۱۲۔

[3] سید سلیمان ندوی : میں جن سے متاثر ہوا۔ (مضمون) معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۶۔

[4] شاہ معین الدین احمد : ارمغان سلیمان (مضمون) معارف جولائی ۸۱ء۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ نواب صاحب (عمادالملک) کی تنبیہ سے پہلے سید صاحب اپنے اشعار میں تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اس کو ترک کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر پیشِ نظر مجموعہ میں ۱۵ء سے پہلے کی جو تین غزلیں شامل ہیں اس میں رمزی تخلص مذکور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نواب صاحب موصوف کی تنبیہ تو "نوحۂ استاذ" (۱۵ء) کی اشاعت پر عمل میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "رمزی"، محض ایک مفروضہ تخلص ہے جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک چلمن تھی جس کے پیچھے سید صاحب خود کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتے مگر اربابِ نظر کی نگاہوں سے مستور نہ ہو پاتے تھے۔

(۵)

سید صاحب کے پیش نظر مجموعۂ کلام میں قدیم ترین اشعار ۱۹۰۴ء کے ہیں اور مؤخر ترین اشعار ۱۹۴۹ء کے۔ اس طرح ان کی شاعری کی مدت تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان کی شاعری کا سوتا دوسرے ہم عصر باقاعدہ شعراء مثلاً حسرت موہانی، فانی، اصغر اور جگر کی طرح بلا انقطاع مدت مسلسل جاری نہیں رہا۔ بلکہ درمیان درمیان میں اس کی خشکی کے وقفے بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں شعر گوئی سے طبیعت بالکل ہٹ گئی تھی۔ صرف مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سے ان کی رحلت تک کے درمیانی سوا سالہ زمانہ میں سید صاحب کے جذبات اور واردات قلبی میں جو جوش اور اُبال پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں ایک وافر سرمایۂ شاعری وجود میں آگیا۔ جو باقی عہد کے ذخیرۂ سخن پر کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لئے ارمغان سلیمان کے مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور اول میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۵ء تک کا کلام شامل ہے۔ اور دور آخر کا کلام۔ اپریل ۴۲ء سے دسمبر ۴۹ء تک پر مشتمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے رنگ سخن اور ذوقِ شعری کے تدریجی ارتقاء کو پورے طور پر، سمجھنے کے لئے اس کو تین ادوار میں منقسم کرنا چاہیئے۔ [1]

---

[1] شاہ معین الدین احمد: "ارمغان سلیمان" (مضمون) معارف جولائی ۷۱ء۔

پہلا دور زمانہ طالب علمی کی شاعری اور مشق سخن پر مشتمل ہے۔ اس دور کو ان کا تربیتی دور کہا جا سکتا ہے۔ جب سید صاحب لکھنوی رنگ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مرآۃ الغیب کے پرستار تھے۔ اسی کی کامیاب نقالی اور اتباع و تقلید میں ساری طباعی صرف کرتے چنانچہ ان کے ابتدائی عہد کا کلام بھی اسی رنگ و آہنگ کا مکمل نمونہ ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و صفائی کے ساتھ اشعار میں نزاکت اور لوچ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی دبستانِ سخن کا طغرائے امتیاز یعنی خارجیت کا میلان اور رنگینی، شوخی اور رعنائی خیال کی خصوصیات اس پر مستزاد تھیں۔ اس عہد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری
بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
چین سے بیٹھنے دے گی نہیں ہم دونوں کو
تجھ کو یہ شوخی تیری، مجھ کو یہ وحشت میری
چاہے تم آج نہ ہو میری وفا کے قائل
پر تمہیں یاد آئے گی کبھی یہ الفت میری

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے
اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار
اب کیوں شب وصال وہ شرمائے جاتے ہیں

ادھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی
خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں
نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور قیام دار المصنفین (؁۱۴ء) کے بعد سے شروع ہوا اور مولانا اشرف علی تھانوی کی ارادت یعنی ؁۴۲ء تک قائم رہا۔ اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے، اب ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی۔ بلکہ ان کے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔

سید صاحب نے ؁۱۹۱۶ء میں ایک غزل اعظم گڈھ کے کسی مشاعرہ کے لئے کہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

عجب طرح کا ایک "پیچ" گفتگو میں ہے
وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

یہ غزل جب ڈاکٹر اقبالؔ کی نظر سے گذری تو انھوں نے سیدؔ صاحب کو اس کی داد دیتے ہوئے ایک خط میں لکھا :۔

"آپ کی غزل لاجواب ہے۔ بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے"[1]

اسی غزل کا درج ذیل شعر بیت الغزل کہلانے کا مستحق ہے ؎

دھن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی　　عجیب لذت پنہاں میرے لہو میں ہے

اس غزل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں　　پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے
خطاب غیر میں گو لاکھ احترام رہے　　مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ "تو" میں ہے
نگاہ لطف ادھر ہو کہ آچلا ہے کیف　　بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

جون ۱۹۱۶ء میں مولانا محمد علی جوہرؔ نے ایک غزل عبد الماجد دریابادی کو جیل سے لکھ کر بھیجی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا　　ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

اس غزل سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں مولانا دریابادی اور سید صاحب دونوں نے بڑی مرصع غزلیں کہہ ڈالیں۔ سیدؔ صاحب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تشہیر کا باعث نہ ہو دامان قبا دیکھ　　لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہدا، دیکھ
یہ عالم امکاں ہے تماشا گہ قدرت　　جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دست قضا دیکھ
تاثیر وفا دعوئے باطل ہے سراسر　　اب شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے جفا دیکھ
بیکار ہے دشواری منزل کی شکایت　　بے راہروئ خضر راہ نما دیکھ
انکار تھا تجھ کو میری تاثیر دعا سے　　اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ
نکلے گا وہ خورشید جمال آج ادھر سے　　اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
مقبول ہوا ہے یوسف زنداں مرا تحفہ　　لایا ہے جو پیغام ہر شہر سبا دیکھ

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ،، (ناشر شیخ محمد اشرف لاہور)۔

اگست ۲۷ء میں سید صاحب نے ایک نظم نما غزل "راز درون پردہ" کے عنوان سے کہی ہے۔ جو خیالات کی رفعت اور پاکیزگی سے بھری ہوئی ہے۔ اس زمانے میں جب وہ کہیں سفر پر جاتے اور ٹرین پر سوار ہوتے تو ان کے ذوق شعری کے دبے ہوئے جذبات ابھر آتے اور وہ اپنی بیاض نکال کر اس میں اشعار قلمبند کرتے جاتے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح دوران سفر میں وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ "راز درون پردہ" مظفر پور کے سفر کے دوران کہی گئی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں ؎

یہ کیسی بے کسی ضبط محبت کی الہٰی ہے
کہ اس کا نام بھی میری زباں تک آ نہیں سکتا
تمہیں کو کس طرح میری محبت کا یقیں آئے
قسم تک تو تمہارے نام کی میں کھا نہیں سکتا
نہ ہمدم کوئی ہو سکتا نہ مونس کوئی ممکن ہے
کہ لب تک ایک حرف اس داستاں کا آ نہیں سکتا
لب خاموش بھی بیگانہ ہے رازِ درونی سے
کوئی حرف اس تمنا کا لبوں تک آ نہیں سکتا
بہ شکل نافہ اس کو بند کر کے دل میں رہنا ہے
میں اس بوئے محبت کو کہیں پھیلا نہیں سکتا
نظر اپنی سر بزم اس کی جانب اٹھ نہیں سکتی
کہ اسرار دروں میں برملا بتلا نہیں سکتا
جو تنہائی بھی حاصل ہو تو لب کچھ کہہ نہیں سکتے
کہ صورت دل کی خلوت میں بھی میں دکھلا نہیں سکتا
اس اخفائے محبت میں جو لطف روح پرور ہے
کسی صورت سے وہ ضبط بیاں میں آ نہیں سکتا
یہ ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں سمجھتے ہیں
کہ جو راز دروں ہے کوئی اس کو پا نہیں سکتا

اس کے بعد ۱۹۳۹ء تک سید صاحب کی کل اٹھارہ غزلیں ملتی ہیں جو تقریباً سب کی سب سفر کے دوران کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو
عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو
سوزش عام ہو تب آگ سے اٹھتا ہے دھواں
عشق کامل کا جو دعویٰ ہے تو پھر آہ نہ ہو

حرف مطلب کہا نہیں جاتا
بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
نگہ لطف سے نہ دیکھ مجھے
یہ ستم بھی سہا نہیں جاتا
عشق کی تازگی ہے آنسو سے
بے سبب تو بہا نہیں جاتا

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ　　سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں　　اے خار دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

پھر چھیڑنے کو آئی ہے باد بہار آج　　مدت کے بعد لائی ہے پیغام یار آج
الٹا مجھی سے ترک ملاقات کا گلہ　　طرز ستم نئی ہے تغافل شعار آج

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے　　ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل میں لگتی ہے
نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانیکی ہمت ہے　　سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

یہ دل وہ شیشہ نازک ہے میرے سینے میں　　نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
نگاہ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے　　چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
شکست رونق بت خانہ ہو نہیں سکتی　　خلیل خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

اظہار جذب عشق پہ مائل تو ہو گئے　　تیرا اثر کہ آج وہ گھائل تو ہو گئے
مضطر وہ برق دش تھا لٹنے کو خود حجاب　　ہم آپ درمیان میں حائل تو ہو گئے

میرے انوار تجلی سے فضا پر نور ہے　　میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے
وہم سے بڑھ کر نہیں فرق جبر و اختیار　　غور سے دیکھو کہ جو مختار ہے مجبور ہے

دعویٰ غلط ہے عشق کی تمکین و ہوش کا　　ممکن نہیں کہ حسن سے ہو بے نیاز عشق
کتنی ہی مختصر ہو یہ کہانی حیات کی　　کھولے اگر نہ حسن کی زلف دراز عشق

مذکورہ بالا اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مرور ایام سے گو سید صاحب کے خیالات میں رفعت، جذبات میں شدت اور زبان و بندش میں صفائی اور پختگی پیدا

ہو تی گئی۔ لیکن بنیادی طور پر سید صاحب اب بھی اس رنگ و آہنگ سے ہم رنگ رہے جسے شعر و ادب کی تاریخ میں "لکھنویت" کا نام دیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے ہم ان اشعار کو معیاری قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شاعری کا پہلا دور ہو یا دوسرا۔ دونوں کی مشق سخن تمام تر تفریحی اور روایتی ہے، اور وہ خود بھی اس کو "رسمی و نقلی" شاعری کا نام دیتے ہیں[1]۔ امیر مینائی کے گہرے اثر کے باعث وہ کلی طور پر "لکھنویت" سے اپنا دامن دوسرے دور میں بھی نہ چھڑا سکے۔ جس ابتذال و سطحیت، خارجیت و معاملہ بندی اور حد سے زیادہ شوخی و رنگینی کے باعث لکھنوی اسکول کے شعراء مورد نقد و جرح ہیں۔ اس کے نشانات سے باین زہد و تقوی سید صاحب کا کلام بھی خالی نہیں ہے، ملاحظہ ہو ؎

کل شب مرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی
ہے کیوں نگاہ ناز مگر شرمسار آج

دست گستاخ کو اجازت دو
منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے
مجھے جب بوسہ لب سے کبھی وہ شاد کرتے ہیں

وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں
ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

گیسو سنگھا کے ہوش میں کیوں لا رہا ہے تو
یوں ہی تو چھوڑ دے مجھے اے یار چھوڑ دے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اشعار قطعی تقلیدی اور روایتی طور پر کہے گئے ہیں۔ شاعر کے اصل مزاج کے آئینہ دار ہرگز نہیں۔ بقول غلام محمد "وہ ایک سراسر دینی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کا "شخصی شاکلہ" تمام تر دینی رنگ قبول کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اس زمانے میں جو کچھ مشق سخن کی وہ (بجز ایک نعت اور دو نوحوں کے) محض

---

[1] غلام محمد: "ارمغان سلیمان"، مقدمہ ص ۷۔

رواج اور ماحول کی مطابقت کے لئے تھی۔[1] چنانچہ ان روایتی اور تقلیدی غزلوں میں بھی سید صاحب کے بنیادی مزاج کی جھلکیاں کہیں کہیں بہت صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اس شعر میں خدا ترسی کی جھلک ؎

لب پہ ہے نام خدا دل میں ہے سودائے صنم   مجھ کو اللہ کرے دیکھتا اللہ نہ ہو

اسی طرح درج ذیل اشعار میں سید صاحب کے اصل مزاج اور مصنوعی مذاق میں کس طرح کشمکش اور اضطراب پیدا ہوتا ہے اور راہ سلوک و معرفت کے ابتدائی دور میں وہ کیسی خلش و تپش، اضطراب و بے چینی، حیرانی و سراسیمگی اور طلب و تمنا کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

بت پرستی بھی کروں اور بت شکن بھی میں بنوں   کیش ابراہیم رکھ کر پیشۂ آذر کروں
دل میں بتخانہ بسا ہے آنکھ ہے کعبہ کی سمت   حیف اس مومن نما کافر کو گر رہبر کروں
آنکھ میں توبہ کے آنسو، دل میں اس بت کی ہوس   ہائے گنگا جل کو کیسے زمزم و کوثر کروں

اس دور میں سید صاحب نے غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(۶)

سید صاحب کی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کا کلام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے مستقل عنوان کا مستحق ہے۔ اس میں انھوں نے علم کی اقلیم سے نکل کر آسمان معرفت کی سیر اور بادہ و ساغر کے پردے میں "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کی ہے۔ سید صاحب کا دور آخر کا یہ کلام تمام تر عارفانہ اور متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اس رنگ کا آغاز مولانا تھانوی کی ارادت سے کچھ پہلے ہوا اور ان کی حلقہ بگوشی پر عروج و کمال کو پہونچا، اس سے پہلے سید صاحب کا مشغلۂ سخن محض تفریح خاطر اور تفنن طبع کے لئے جاری تھا۔ اس لئے اس میں موزونی طبع اور قادر الکلامی تو ملتی ہے، مگر "از دل خیزد بر دل ریزد"

---

[1] غلام محمد: ارمغان سلیمان، مقدمہ ص ۷۔

کی کیفیت معدوم ہے۔ لیکن آستانہ اشرفی سے تعلق کے بعد ان کے جذبات شوق میں جو شدت اور وفور پیدا ہوا، وہ زبان سے شعر و نغمہ بن کر ابلنے لگا۔

اس زمانے کے مقرب عینی شاہدین کا بیان ہے کہ ارادت کے بعد سید صاحب میں اتنا غیر معمولی تغیر ہوگیا کہ وہ ہر مجلس میں بلکہ ہر وقت نغمہ خوانی کرتے رہتے تھے۔ جب کہ اس سے پہلے یہ حالت نہ تھی[1]۔ جذبات کی شدت و فراوانی اور اشعار کی کثرت آمد کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایک دن میں کئی کئی غزلیں موزوں ہو جاتی تھیں۔ جب کسی نشست میں وہ عارفانہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین کو تڑپا دیتے تھے۔ اس عہد کے وفور جذبات کے بارے میں غلام محمد خود سید صاحب کا یہ بیان نقل کرتے ہیں :-

> "میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا (تھانوی قدس سرہٗ) کے تعلق سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہوگیا بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا۔ جو پھر باقی نہیں رہا۔" [2]

سیّد صاحب نے اپنے عارفانہ کلام کے مجموعہ کا نام "غزل الغزلات" خود تجویز کیا تھا۔ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا[3]۔ اس اشتراک اسمی سے فائدہ اٹھانا ان کے حسن ذوق کا بین ثبوت ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ کلام اس نام کا مستحق ہے۔ "غزل الغزلات" کو سید صاحب اپنا "رُوحانی سفرنامہ" کہا کرتے تھے، اور فی الواقع اس میں راہ سلوک و معرفت کے ہر مرحلہ کے نشانات ملتے ہیں[4]۔ ارمغان سلیمان کا یہ حصہ ۳۹ غزلیات، ۳ قطعات اور ایک فرد پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے خاتمہ پر تاریخ اور مقام تحریر درج ہے۔ کل اشعار کی مجموعی تعداد ۲۱۶ ہے۔ ان اشعار سے شاعر کے روحانی

---

[1] سید حسین : حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۳۲۷۔

[2] غلام محمد : تذکرہ سلیمان۔ ص ۱۲۲۔

[3] غلام محمد : ارمغان سلیمان۔ مقدمہ ص ۹۔

[4] شاہ معین الدّین : ارمغان سلیمان (مضمون) مشمولہ معارف، جولائی سنہ ۷۱ء ص ۱۴۔

ارتقاء اور عارفانہ مشاہدات کی تفصیل بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ شاہ معین الدّین احمد ندوی رقمطراز ہیں:۔

> "اس دور کا کلام تمام تر قلبی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ اس میں طور کی تجلیاں اور وادیٔ ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں"۔[1]

سید صاحب نے اپنے اشعار میں معرفت اور تصوف کے مسائل کو محض روایتی طور پر نظم نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت وہ ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ سیّد صاحب بادۂ تصوف اور مئے عرفان سے مست و سرشار تھے۔ اور انھوں نے اپنے وارداتِ عشق اور سفرِ معرفت کی روداد ہی کو شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کے کلام میں انھوں نے محض موزونیٔ طبع اور قدرتِ بیان کا کرشمہ نہیں دکھایا ہے۔ بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں   سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

فیض ہے یہ کس دلی وقت کا   اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

اردو شاعری میں دوسری بہت سی روایات کی طرح تصوف کی روایت بھی فارسی شاعری کے زیرِ اثر آئی "فارسی شاعری نے تصوف کی شراب کو اپنے پیمانوں میں اتنا رچایا، بسایا اور چھلکایا کہ وہ ایک طرف معرفت و سلوک کا نشہ بن کر چمکی۔ دوسری طرف عشقِ مجازی کی رگوں میں خون بن کر دوڑی، اور تیسری طرف انسان دوستی کا وہ لہو بنی جو رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ساتھ ساتھ سینۂ سنگ میں شرر بن کر تڑپا"۔[2] یوں تو یہ روایت اردو شاعری میں ہمیشہ پروان چڑھتی رہی۔ لیکن صاحبانِ دل شعرا نے اس کو وارداتِ دل کی زندہ تصویر بنا دیا۔ اور توحید و معرفت کے تمام راز پردۂ شعر میں فاش کیے۔ دکن میں

---

[1] شاہ معین الدین: "ارمغانِ سلیمان" (مضمون) معارف، جولائی ۵۴ء ص ۱۴۔

[2] وحید اختر: خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری ص ۲۹۶ (انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۷۱ء)۔

شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ گیسو دراز، میران جی شمس العشاق اور شاہ صبغت اللہ کے خانوادہ تصوف نے شعر و ادب پر بلاشبہ بہت گہرے نقوش چھوڑے اور تصوف کا اثر عام زندگی پر اتنا مضبوط ہو گیا کہ اس عہد کے وہ شعراء بھی جو صاحب معرفت نہیں کہلائے جا سکتے کسی نہ کسی درجہ میں تصوف کا رنگ قبول کرنے پر مجبور رہے۔ پھر جب ولی نے دہلی پہونچکر اردو شاعری کا صور پھونکا تو وہ خود چونکہ شاہ گلشن کے حلقہ بگوش تھے۔ اس لئے انھوں نے بادۂ عرفان کے چھلکتے ہوئے جام سے ہر نفس کو شادکام کیا۔ اور پھر اس کی روایت اتنی مقبول عام ہوئی کہ جو شعراء صوفی نہ تھے انھوں نے بھی تصوف کو "برائے شعر گفتن خوب" قرار دے کر رسم زمانہ کے مطابق مسائل تصوف کو جامۂ شعر پہنانا ضروری خیال کیا۔

لیکن اردو شاعری کے اس روایتی تصوف سے قطع نظر ایسے شعراء کے نام محض انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، جنھوں نے رسماً نہیں بلکہ محرم راز ہو کر مسائل تصوف کی ترجمانی کی ہے اور جو خود مئے معرفت کے لذت شناس، عارف باللہ اور سالک راہ طریقت تھے، ان شعرا نے اپنے کلام میں تصوف کے جن اسرار و رموز کا گنجینہ پیش کیا اور جس طرح اس کو گلہائے معرفت سے سجایا ہے وہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا صحیح مصداق ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:۔

> "یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دور قدیم میں جن شعراء کے کلام میں صوفیانہ جذبات ملتے ہیں وہ خود بھی حقیقی معنوں میں صوفی اور عارف باللہ تھے۔" [1]

ایسے گنتی کے شعراء میں ولی، مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، آتش، نیاز بریلوی، آسی غازی پوری، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے نام نمایاں ہیں جن کے ذوق سخن کی آبیاری یا تو تصوف کے سرچشمہ سے ہوئی یا پھر وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں اس کی لذت سے آشنا ہوئے۔ خصوصاً خواجہ میر درد نے جس طرح مضامین معرفت و سلوک کو شاعری میں سمویا ہے، اس کی مثال کم از کم اردو شاعری میں مفقود ہے۔ بلاشبہ ان کا

---

[1] اعجاز حسین: آئینہ معرفت ص ۱۷۸ (لالہ رام نرائن لعل بک سیلرز الہ آباد ۳۲ء)

اردو کلام بادۂ عرفان سے لبریز ہے۔[1] انھوں نے بقول آزاد "چھوٹی بحر کی غزلوں میں گویا تلوار کی آبداری نشتر میں بھر دی ہے"۔[2] اسی لیے ڈاکٹر اعجاز حسین نے انھیں صوفیانہ شاعری کا سرتاج قرار دیا ہے۔[3]

اوپر جن معدودے چند صاحبان دل اور سالکان طریقت اردو شعراء کا ذکر ہوا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا عہد آخر کا کلام انھیں بھی اسی صف میں جگہ دلاتا ہے، لیکن راقم سطور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سید صاحب کا شاعرانہ مرتبہ میر دردؔ، آتشؔ، یا حسرتؔ اور اصغرؔ کے برابر ہے۔ بلکہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ "غزل الغزلات" کے اشعار تمام تر دروں بینی، داخلیت اور حقیقی جذبات و احساسات کا شاہکار ہیں۔ اسی باعث وہ خود کہتے ہیں ؎

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوش مند ہیں   مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

اب ذیل میں اس روحانی سفرنامہ کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں، تصوف کا دارومدار عشق پر ہے۔ بغیر اس کے منزل مقصود تک پہونچنا محال ہے۔ بالخصوص چشتیہ عالیہ سلسلہ میں تو اوّل و آخر بس عشق ہی عشق ہے۔ اس لئے سید صاحب کی روح بھی وادی سلوک و معرفت میں آکر سوز و گداز عشق اور وجد و کیف سے معمور ہو گئی ہے اور پھر ان کی روح کے تار پر جو زخمہ بھی لگا وہ زبان کا نالہ یا دل کا نغمہ بن گیا۔ خود ہی کہتے ہیں ؎

نغمہ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی   جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

سید صاحب کے عارفانہ اشعار میں بھی عشق مجاز کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے مرشد اور محبوب حقیقی کو بھی مجازی محبوب تصوّر کر کے ان سے اظہار محبت کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں ؎

جس دن سے مرے دل میں تیری یاد بسی ہے   ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو   دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

---

[1] وحید اختر: خواجہ میر دردؔ، تصوف اور شاعری ص ۳۱۰۔
[2] محمد حسین آزاد: آب حیات ص ۱۸۹ (الہ آباد اڈیشن)۔
[3] اعجاز حسین: آئینہ معرفت۔ ص ۲۳۰۔

سجدے میں رکھ کے سر ترے پائے خیال پر   تعمیر ایک بہشت ارم کر رہا ہوں میں
کہہ کہہ کے دل فریب، دل آرا و دل نشیں،   تردید قصہ ہائے ستم کر رہا ہوں میں

معلوم نہیں کس دم فرمائیں مجھے وہ یاد   نام اُن کا نہ ہو اے دل، ایک لمحہ فراموش
حاصل ہے تصور میں کیفیت معراج   کیا کیا نہ مزہ پایا، پایا جو ہم آغوش

یاد ان کی دم بدم آتی نہیں   کیا مزاج یار برہم ہو گیا

گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمہیں،   اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

دل ہے اے ناداں تجلّی گاہ دوست   کیوں نگاہ شوق سوئے بام ہے

مرشد سے کمال محبّت، اس کی خانقاہ کے در و دیوار سے عقیدت، شیخ کی محفل اور "چشم ساقی" کے اثرات کے بے حد دلکش مرقعے "غزل الغزلات" کے ہر ورق پر ورق گل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ عارفانہ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ   آباد رہے یارب تا حشر وہ مےخانہ
زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں پی لی   گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ
حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی   آ دل میں مرے چھپ جا اے صورت جانانہ

ذرہ ذرہ عالم محسوس کا خاموش ہے   یار ہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے
چشم ساقی میں بھری کیا بادۂ سرجوش ہے   جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست ہے، مدہوش ہے

کیا بھری تاثیر میں مطرب تیری آواز ہے   جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا   تن میں جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے

حیات نو مجھے اس کی نگاہ ناز نے بخشی
بھرا ہے آب حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں
جو موسیٰ بھی ہوں تو بھی اتباع خضر لازم ہے
ہدایت منحصر ہے اتباع شیخ کامل میں

دل کے انوار و تجلیات سے معمور ہو جانے کے بعد خارجی دنیا کے تمام مظاہر اور سرمایۂ خرد، ہیچ نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ہوش و خرد کا جو خرمن جمع کیا تھا اس کو بھی آگ لگانے کو تیار ہو گئے ؎

میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں
لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

ساقی میخانہ سے نہایت مستی اور سرشاری کیساتھ مخاطب ہیں ؎

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں
سبز ہے، شاداب ہے، سیراب ہے، گلزار دل
دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی
تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خار دل
عشق کا رہبر دلیل راہ جس دن سے بنا
بن رہا ہے آپ ہی انکار دل، اقرار دل
ہوش ہے، گرمی و مستی ہے، وفور شوق ہے
شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبار دل

مہر و محبت سید صاحب کی شخصیت کے فطری جوہر تھے۔ جس کے گوناگوں جلوے باب دوم میں تفصیل سے پیش کئے جا چکے ہیں۔ ارادت کے بعد یہ جذبہ معرفت کی بھٹی میں تپ کر اور بھی کندن بن گیا ہے۔ کیوں کہ صوفیانہ شاعری میں عشق و محبت کا تصور ارضی و جسمانی محبت سے آگے بڑھ کر ایک پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اس تصور محبت کے زمزمے سید صاحب کی عہد آخر کی غزلوں میں بکثرت سامعہ نواز ہوتے ہیں، ان کی دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت تھی اور وہ اس "کونین کی دولت"، "آب حیات" سمجھتے تھے اور "اندوہ محبت" کو "گنجینۂ عشرت" خیال کرتے تھے ؎

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحب دولت ہے
اک ذرہ محبت کا کونین کی دولت ہے
آباد ہے اک عالم ہر گوشۂ خاطر میں
دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت ہے
اک گھونٹ میں بھولا ہے میخوار دو عالم کو
کیا تند نشہ تیرا اے جام محبت ہے

ترے نام ہی میں حلاوت ملے
جو ذوق محبت کی دولت ملے

محبت تو اے دل بڑی بات ہے   یہ کیا کم ہے اس کی جو مسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے   جو آب حیات محبت ملے

کشش پر ہے قائم نظام وجود   یہ گھر اک محبت سے معمور ہے

اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ   اندوہ محبت بھی گنجینہ عشرت ہے

کثرت ذکر سے جب رگ وپے میں حق ہی حق سرایت کر جاتا ہے تو ہر چیز میں حق کا ظہور اور ہر آواز میں حق کی پکار محسوس ہونے لگتی ہے، اور ہر موئے بدن ساز حقیقت بن جاتا ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح اس کو "سلطان الاذکار" کہتے ہیں ؎

کس نے چھیڑ دی یہ صدائے دلنواز   ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں   ہر صدا آواز الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاس حیات   جو کوئی دم ساز الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند   قلب ذکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں   جام مے آواز الا اللہ ہے

۱۹۴۹ء میں سید صاحب آخری بار سفر حج کے لئے مکہ معظمہ پہونچے تو اس ارض قدس میں قدم رکھتے ہی ان کے ذوق وشوق کے سمندر میں طغیانی آگئی۔ اور اس عالم میں ایک نہایت والہانہ غزل کہی، جس کے اوپر اپنے قلم سے "بوقت حاضری مکہ معظمہ" تحریر کیا ہے۔ نمونہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

دیدۂ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں   جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
ان کے کرم کے ہم نثار، ان کی عطا کا کیا شمار   دے دیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں
دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز و ساز   ہے یہ دعا بصد نیاز درگہ بے نیاز میں

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو درج ذیل قطعہ میں کس کیفیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ قطعہ "اللہ نور السمٰوات والأرض" کی تفسیر اور سید صاحب کے "سیر الی اللہ" کا آئینہ دار

ہے ؎

جہاں دیکھیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہو   تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہم نشیں تو ہے
تری ہی روشنی ہر چار سو پھیلی ہے عالم میں   کہیں مہر فلک تو ہے، کہیں نور زمیں تو ہے

وجدانی کوائف اور عارفانہ معارف و حقائق سے معمور چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

سما جا مرے دل میں ارمان ہو کر   دوئی دور کر دے مری جان ہو کر
تصور میں کیا کیا عنایت ہے انکی   مرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر

دل حریف نگہ یار کہاں سے لاؤں   جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل   فطرت دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں

ذکر حق سے صیقل کامل ہوا   محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا   جو نگاہ ناز کے قابل ہوا

مولانا تھانوی کی وفات (جولائی ۴۳ء) کے بعد سید صاحب کا چشمۂ سخن بالکل خشک ہو گیا اور شاعرانہ جذبات سرد ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد کے دس سال کی طویل مدّت میں انھوں نے صرف دو نعتیں اور سات آٹھ غزلیں کہیں۔ لیکن جو جذباتی ہیجان ارادت کے بعد ان میں پیدا ہوا تھا، اس کا جلوہ پھر تادم واپسیں نظر نہ آسکا۔

سیّد صاحب کا اس دور کا کلام بظاہر سلیس اور آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت معنوی اعتبار سے بہت عمیق اور دقیق ہے۔ اسی لئے سیّد صاحب نے "غزل الغزلات" کے حاشیہ میں بہت سے اشعار کے رموز و کنایات کی تشریح کر دی ہے۔ اور بعض مقامات پر ان کے مذاق آشنا مرتب دیوان نے بھی حاشیہ آرائی کی ہے۔

سیّد صاحب کے عارفانہ کلام کا جو نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے ارباب نظر کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں معرفت اور مسائل تصوف کا بیان محض "برائے شعر گفتن" نہیں ہے بلکہ شاعر نے اپنے دل کی دنیا میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں جو سوز و گداز، جذبات

کی شدت و فراوانی اور صداقت و واقعیت موجود ہے۔ وہ ان کے نکتہ چینوں کو بھی اعتراف حقیقت پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر شاعری جذبات کی بہترین ترجمانی کا نام ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سیّد صاحب کے عہد آخر کا کلام اس کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔

(۷)

سیّد صاحب نے غزل کے علاوہ نعت، قومی نظمیں، مراثی، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں جن سے ان کی قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ سنہ ۴۹ء میں آخری بار سفر حج کے موقع پر جب وہ مدینہ منوّرہ حاضر ہوئے تو روضۂ اطہر کے روبرو پہونچتے ہی ان کا چشمۂ حبّ رسول نعت کی شکل میں اُبل پڑا، چونکہ وہ نرے شاعر نہ تھے بلکہ مقام نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائص نبوت کے عارف و امین بھی تھے[1]۔ اپنی زندگی کی بہترین صلاحیتیں سیرت نبوی کی خدمت اور اس کے احیاء و اشاعت میں صرف کر دیں اس لئے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہ رسالت میں جو نعت پیش کی اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو　　خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ　　بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی　　محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

اور پھر جب حج سے فارغ ہو کر وطن واپس آ رہے تھے تو خسرو جہاز پر ایک دوسری نعت کہی، جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

عشق نبوی درد معاصی کی دوا ہے　　ظلمت کدہ دہر میں وہ شمع ہدیٰ ہے
آمد تری اے ابر کرم رونق عالم　　تیرے ہی لئے گلشن ہستی یہ بنا ہے
فرمان دو عالم تری توقیع سے نافذ　　تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
لے جائیگا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور　　جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

---

[1] شاہ معین الدّین احمد: ارمغان سلیمان (مضمون) معارف، جولائی سنہ ۵۱ء۔

ایک زمانہ تک صنف مرثیہ واقعات کربلا کے ساتھ مخصوص و محدود رہی۔ مولانا حالی نے اپنے مشہورۂ آفاق مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ جہاں اردو شاعری کے بہت سے دوسرے نقائص پر ضرب کاری لگائی وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اس میں مشاہیر قوم اور ارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا جائے[۱]۔ چنانچہ حالی نے مرثیہ غالب لکھ کر شخصی مراثی کے سرمایہ میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ کیا۔ سیّد صاحب نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی وفات پر نہایت دلدوز اور اثرانگیز مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے اور ساٹھ بندوں اور باسٹھ[۶۲] اشعار پر مشتمل ہے۔ سیّد صاحب کو اپنے استاذ سے جو غیر معمولی قلبی محبت اور عقیدت تھی، وہ اس کے لفظ لفظ سے تراوش کرتی ہے۔ اس میں ان کے سینہ کا گداز، قلب کا سوز، محبت و اخلاص اور درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا مرثیہ غم کا تاج محل ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے متاع عزت پیشیں کے پچھلے کارواں — آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں
جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی — جس کی ہر فریاد تھی صوت ورائے کارواں
جس کی اک اک بات تھی روح بلالی کی اذاں — جس کی رگ رگ میں تھیں سوز درد کی چنگاریاں
جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رود فرات — جس کے ہر صفحہ کا دامن رشک دریائے عماں

کیا فریب صبر کھائے غم نصیب دلفگار — جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا — پھر دل اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار
یاد آئے جب وہ اس کا فقرہ نامختتم — "آہ سیرت آہ سیرت" چھوڑ کر سب کاروبار
پھر رُکے کس طرح پر شوری قلب مضطرب — کس طرح رُک جائے خوں نابِ چشم اشکبار

کون اب بتلائے مجھ کو طرز اعجاز بیاں — کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں

---

[۱] حالی: مقدمہ شعر و شاعری ص ۵۰۔

اب پَرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے   پست مضمون کون پہونچائے گا اب تا آسماں
کون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوئے قلم   کون دیکھے گا مری جولانیِ طبعِ رواں
کس کے نامہ کا بناؤں اب میں عنوان خطاب   ”سیّدی“، ”مولائی“، ”استاذی“، ”غزالی الزماں“

جب یہ مرثیہ معارف نومبر ؁۱۶ء میں شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، مولانا حمیدین فراہی اور اکبر الہ آبادی نے اس کو پڑھ کر مرثیہ نگار کی سخنوری، اور نوحہ سنجی کی داد دی، اکبرؔ نے اپنے ایک مکتوب میں سیّد صاحب کو لکھا :۔

> ” نظم پہونچی، نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے۔ بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا ہے اور دل پر اثر پڑتا ہے۔
>
> ع مرکز امید تھا جو جب وہی جاتا رہا الخ
> ع اب پَرِ پرواز معنی کون بخشے گا مجھے الخ
> ع کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن الخ
> ع کون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوئے قلم الخ
>
> کیا لاجواب شعر ہیں، معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو سکونِ خاطر عطا فرمائے۔

اسی طرح جب ؁۱۷ء میں سید صاحب کی پہلی بیوی نے داغ مفارقت دیا تو دل کے پر درد نالے اشعار میں ڈھل گئے۔ اپریل ؁۱۷ء کے معارف میں ”مرگ یار“ کے عنوان سے ۱۴ اشعار کا یہ دردناک مرثیہ شائع ہوا، جس کے چند اشعار یہ ہیں ؂

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے   کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
یہ تماشائے جہاں خواب پریشاں ہی سہی   پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا
کس سے کیجے دلِ شیدا گلۂ تنہائی   مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبرؔ نہ ہوا
حیف اس خوں کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے   قطرۂ اشک ہوا گوہرِ احمر نہ ہوا

ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورّخہ ۱۲ اکتوبر ؁۱۶ء میں سیّد صاحب کو

لکھا تھا کہ "مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں نہایت مقبول ہوتیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے" سید صاحب نے اس نصیحت و مشورہ پر عمل کرتے ہوئے شبلی کے رنگ میں متعدد تاریخی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ "درس مساوات" کے عنوان سے ایک تاریخی نظم میں خلیفہ ہارون الرشید کا درج ذیل واقعہ نظم کیا ہے:-

> " ہارون الرشید ایک بار مدینہ گیا۔ شاہزادہ امین و مامون بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہاں اس وقت حضرت انس بن مالک کا حلقہ درس حدثنا و اخبرنا کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔ خلیفہ کی خواہش ہوئی کہ یہاں آکر اس کے لخت جگر حدیث کے اس چشمۂ حیواں سے تشنہ کام نہ جائیں، چنانچہ اس نے امام مالک کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرے لڑکے مجمع عام میں جا نہیں سکتے اس لئے آج "ایوان شہی" میں درس حدیث دیں ؎

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جا کر   جائیں محروم نہ اس در سے میرے لخت جگر
حکم پہونچا یہ خلافت سے کہ اے ابن انس   مجمع عام میں جا سکتے نہیں میرے پسر
اس لئے آج یہ بہتر ہے کہ تعلیم حدیث   آپ دیں خاص انھیں ایوان شہی میں آکر

امام مالک نے ارشاد فرمایا ؎

سن کے فرمان خلافت کا یہ ارشاد ہوا   اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر
ہے یہ علم نبوی تیرے ہی گھر کی دولت   خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

> ہارون نے امام صاحب کا یہ جواب سن کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اچھا ٹھیک ہے آپ تشریف نہ لائیں لیکن جب شاہزادے سماعت حدیث کے لئے حاضر ہوں تو اس وقت کوئی دوسرا شریک درس نہ ہو ؎

سن کے ہارون نے دربار امامت کا جواب　　بھیجا پیغام کہ خیر آپ نہ آئیں گے اگر
خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہونگے　　مگر اوروں کا نہ ہو بزم میں اس وقت گذر

امام مالک نے اس تجویز کو اسلامی شان مساوات کے خلاف قرار دے کر کمال استغنا سے رد کر دیا، اور پوری جرأت سے خلیفہ کو کہلا بھیجا ؎

مالک ابن انس نے اسے کہلا بھیجا　　مرے کاشانہ میں ممکن نہیں تمیز بشر
درسگہ خاص نہیں درسگہ عام ہے یہ　　ہو مساوات بشر معنی اسلام ہے یہ

اسی طرح جون سنہ ۱۶ء میں سیّد صاحب نے ایک نظم "سر الحیات" کے عنوان سے لکھی جس میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے انحطاط کا ذکر کر کے ان کی نشأۃ ثانیہ کی اصل روح بیان کی ہے اور "چشمۂ حیات" اور "قوت بشر" کی نشاندہی کی ہے ؎

اک شور ہے کہ قوم میں اب زندگی نہیں　　شیرازۂ جماعت قومی ہے منتشر
قوت نہ بازوؤں میں، نہ سر میں بلند فکر　　کچھ اضطراب قلب نہ کچھ کاوش جگر

اے چارہ گر تغافل دیریں سے ہوشیار　　معلوم ہے نہ رمز حیات امم مگر
مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے　　چرکے لگے ہوئے ہیں بہت جسم از دپر
یہ سب صحیح، پر ہے ضروری بقائے روح　　لازم ہے فکر زخم جگر سب سے پیشتر
وہ جذب مذہبی ہے وہ ملت کا جوش ہے　　جو چشمۂ حیات ہے اور قوت بشر
پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلہ کی شکل میں　　ہو جائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر
ان سست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہو
ان مضمحل قوی میں ہو طوفان کا اثر

رولٹ بل کے خلاف جس زمانے میں پورے ہندوستان میں بے چینی اور اضطراب برپا تھا۔ سید صاحب نے "انڈمنٹی بل اور رولٹ بل" کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی تھی جو اکتوبر سنہ ۱۹ء کے صبح امید لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد جلیانوالہ باغ کا حادثہ خونیں پیش

آیا۔ سیّد صاحب مولانا محمد علی کے ساتھ خلافت کا وفد لے کر انگلستان گئے۔ وہاں سے واپسی میں جہاز کے عرشہ سے بحر عرب کا منظر دیکھ کر ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا اور پندرہ سولہ اشعار کی ایک دلکش نظم معرضِ وجود میں آگئی۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

بحر العرب! مبارک تیری روانیاں ہیں   سطروں میں تیری لکھی اگلی کہانیاں ہیں
ہر سمت تو ہی تو ہے، تیری ہی گفتگو ہے   ہاں قطرہ قطرہ تیرا، ساز انا ہو ہے
کیا تیرے جزو کل میں وحدت کا اک سماں ہے   تو یا محیط ہستی، یا سایۂ خدا ہے

جولائی ۳۳ء میں سید صاحب راندیرا اور سورت کے ایک علمی سفر پر تشریف لے گئے، اور جب وہاں سے بھروچ جا رہے تھے تو راستہ میں دریائے نربدا کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور اُن کو اپنے کاروان رفتہ کی یاد آگئی اور اسی عنوان سے ایک نظم کہہ ڈالی، جس کے شروع میں کہتے ہیں ؎

نربدا، اے نربدا، اے جادۂ بحر عرب   گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب
ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے   ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز   تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو   چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
اے بھروچ، اے خاتم انگشت رودِ نربدا   عہدِ ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

رباعیات و قطعات میں بھی سیّد صاحب کی فکر سخن نے اپنی جولانی دکھائی ہے چنانچہ ۱ر مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کا مشہور حادثۂ پا پیش آیا تو اس پر مولانا حالی، نواب علی حسن خاں، خواجہ عزیز الدّین، اقبال سہیل اور مولانا عبد السلام ندوی نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف توجیہات کی گئی تھیں۔ علامہ مرحوم نے یہ تمام رباعیاں سیّد صاحب کو دے دیں، جنھوں نے ان کو ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں خود سیّد صاحب نے بھی اپنے محسن و مربّی کے اس عظیم المیہ پر دلی تاثرات شعری سانچے میں ڈھالے تھے، خود رقمطراز ہیں:۔

"خاکسار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا جس کو ادباؐ یا مولانا

کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا۔ اسی مہینہ موازنۂ انیس و دبیر شائع ہوئی تھی اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا ؎

تنقید مراثی کے صلہ میں استاد ؛   دربار حسینی میں سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی   اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی[1]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نکاح کے موقع پر سید صاحب نے جو قطعات موزوں کئے تھے اُن میں سے دو قطعات ملاحظہ فرمائیں ؎

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد   نوشاہ بنیں گے آج عبدالماجد
اللہ کرے وہ دن بھی جلد آجائے   بن جائیں گے وہ جب کسی کے والد ماجد

دنیا پہ کرے جو غور کوئی تھوڑا   پائے گا ہر ایک شے کو جوڑا جوڑا
دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا   اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

سید صاحب نے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شاعری کی ہے۔ باب اوّل میں ذکر آچکا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جب نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ کی تعلیم کا معائنہ کرنے تشریف لائے تو سید صاحب نے جو اس وقت طالب علم تھے نواب صاحب موصوف کی شان میں ایک عربی قصیدہ کہہ کر سنایا جسے سن کر نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے[2]۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی حیدرآباد کی ملازمت سے قطع تعلق کرکے ندوہ میں مستقل قیام کے لئے تشریف لائے تو سیّد صاحب نے اُن کے خیر مقدم میں ایک طویل قصیدہ فارسی میں کہا، جس کے چند ملاحظہ فرمائیں ؎

بیانش ابر باراں است می بخشد چو می بارد   بیوم شور سرسبزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم باعجاز قلم جاں زگر بخشد،   بحکم قم باذن العلم آں تن را کہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ ذاتش حی وقیوم است   بماند زندہ جاوید این شبلی نعمانی

---

[1] سیّد سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۷۰۔

[2] شاہ معین الدّین ندوی: حیات سلیمان ص ۱۹۔

نوشتم چوں مدیح حضرت الاستاذ برخواندم   ندا آمد مرا از پردۂ ناموس ربّانی
دلیل فضل ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد   بہ پیش مور سر تہ نہی کہ ہمنام سلیمانی

سنہ ۴۹ء میں سید صاحب نے فارسی میں ایک الہامی غزل کہی تھی، اس کے نیچے گوشہ میں "بوقت خاص" مرقوم ہے۔ اس اشارہ کی رمز کشائی کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں کہ "انیسویں شب رمضان کو نماز تہجّد پڑھ کر ذکر کرنے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتًا یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی۔ فارسی میں میری صرف یہی ایک غزل ہے۔ اس مرصع غزل کو دیکھ کر ایک سخن سنج نے کہا تھا کہ "اس پر تو عراقی کے کلام کا گمان ہوتا ہے"[1] چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

شیوۂ صید زبونم آرزوست   سینہ آغشتہ بخونم آرزوست
گوش می جوید پیام از وصل دوست   ارجعی وراجعونم آرزوست
خوش نمی آید سجودِ بے حضور   فی صلوٰۃ خاشعونم آرزوست
از حصار ایں وآں بیروں کشد   آں نگاہ پر فسونم آرزوست
خبرمن ہست آنچہ تو فرمودہ   آنچہ فرمودی ہمونم آرزوست

(۸)

سیّد سلیمان ندوی کے اعلیٰ ذوق سخن اور اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں قدرت کلام کے تمام تر اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے علم وادب، اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں جو روشن اور لافانی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کے مقابلہ میں ان کی شاعری کم مایہ اور فروتر ہے۔ سیّد صاحب اگر صرف شاعری کی طرف توجّہ کرتے تو وہ اپنے عہد کے آتش وحسرت نہ سہی، امیر مینائیؔ اور جلالؔ ضرور ثابت ہوتے لیکن بصورت موجودہ سیرت النبی، ارض القرآن، خیّام، عرب وہند کے تعلقات، اور حیات شبلی کی زنگارنگ نقش آرائیوں کے سامنے "ارمغان سلیمان" کی چاندنی بے کیف اور گہن آلود محسوس ہوتی ہے۔

---

[1] غلام محمد: تذکرِ سلیمان ص ۳۵۳۔

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب جس درجہ کے مصنّف و محقق اور ادیب تھے، اس مرتبہ کے شاعر نہ تھے اور نہ وہ خود اس درجہ کے شاعر بننا ہی چاہتے تھے۔ وہ صرف اس حد تک شاعر تھے کہ جب کبھی ان کا جی چاہتا یا ان کے واردات قلبی امنڈ پڑتے یا کسی واقعہ اور خبر سے متاثر ہو جاتے تو اپنی دلی کیفیات کو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے اور بس۔ غالباً یہی سبب ہے کہ نہ تو خود سیّد صاحب نے زندگی بھر کبھی اپنی شاعری کو اہمیت دی اور نہ دوسرے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ہی اس کو لائق اعتنا خیال کیا۔

باب ششم

تنقید

تنقیدی شعور اور انسانی وجود لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی ابتدا دوسرے کے آغاز سے وابستہ ہے۔ اس لئے کہ خوب و زشت میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسان میں ہمیشہ رہی ہے۔ اسی طرح اردو میں بھی تنقید کا وجود اتنا ہی قدیم ہے۔ جتنا خود اردو زبان کا وجود فنی ہیئت اختیار کرنے سے قبل بھی شعر و ادب کو پرکھنے اور نظم و نثر کی اصلاح و ترمیم کا عمل عام رہا ہے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔ تنقیدی شعور ادب کے ساتھ ساتھ عالم وجود میں آیا ہے۔

اردو نثر میں پہلی تحریر جو اصناف ادب پر تنقیدی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے۔ باقر آگاہ کے اردو دیوان کا دیباچہ ہے[1]۔ سلیس اردو میں لکھا ہوا یہ دیباچہ بلاشبہ تنقید نگاری کی طرف ایک اہم پیش قدمی ہے۔ گو اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگاہ کا اصل مقصود سودا پر اعتراضات کرنا۔ اور نصرتی کی پُشت پناہی کرنا تھا۔ اسی باعث انہوں نے نصرتی کی وکالت زیادہ کی اور صحیح جائزے کی طرف توجہ کم دی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس تبصرہ سے آگاہ کی ذہنی رجحان اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

اردو تنقید کی نشو و نما میں تذکروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تذکرہ نویسی میں تنقید نگاری کا ہیولیٰ بنتا ہوا نظر آتا ہے[2]۔ ان تذکروں کی اصل حیثیت تو تاریخ

---

[1] اس سے پہلے فائز دہلوی نے اپنے دیوان اردو کے شروع میں ایک مقدمہ لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے شاعری کے چند اہم اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔ جنہیں اردو میں تنقید کے اولین نقوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ مقدمہ فارسی زبان میں ہے۔ اسی طرح شاہ حاتم نے بھی "دیوان زادہ" کے مقدمہ میں اصلاح زبان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سودا کی دو تصنیفات عبرت الغافلین اور سبیل ہدایت میں شعر و شاعری سے متعلق نسبتہً واضح اور تفصیلی مواد ملتا ہے۔ بہرحال اس عہد کو تنقید پر محض ایک اظہار خیال کا دور ہی کہا جاسکتا ہے۔

[2] سیدہ جعفر: فن کی جانچ ص ۶۵ (نیشنل پریس حیدرآباد ۱۹۶۵ء)

ادب یا شعرار کی سوانح اور نمونہ کلام کے مجموعوں کی ہے۔ لیکن ان میں کہیں کہیں شاعری کے اصول و نظریات کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ نقادانِ ادب کے درمیان یہ شدید اختلافی مسئلہ رہا ہے کہ اردو شعرار کے یہ تذکرے تنقید میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں یا نہیں۔ سیّد احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی انہیں تنقید کے صف میں شامل کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ فاروقی کو تو تذکروں کا یہ تمام سرمایہ "ردّی کاغذوں کا ڈھیر" نظر آتا ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ تذکرہ نگاروں کو تنقیدی شعور کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض "اٹکل پچو" لکھ مارا ہے۔[1]

لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی[2]، پروفیسر مسیح الزماں[3]، حامد حسن[4] قادری، ڈاکٹر سیّد عبداللہ[5]، سیدہ جعفر[6] اور اختر انصاری[7] کی متفقہ رائے ہے کہ یہ تذکرے اپنی تمام فنّی خامیوں کے باوجود بہرحال تنقید کے ابتدائی مظہر ہیں۔ ان اکابرادب کی یہ دلیل کافی باوزن ہے کہ زندگی اور ماحول کے ساتھ تنقید بھی اسی ڈگر پر چلتی ہے، جس پر ادب چلتا ہے، تذکروں کے دور کا ماحول قطعاً اس طرح کی تنقیدوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا جو ہمارے دور میں ادبی سرمایہ بنتی جا رہی ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے شعرار کے کلام پر اجمالی طور پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ جنہیں تنقید کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ تذکرہ نگاروں سے تفصیلی تنقیدی جائزے کی توقع فضول ہے۔ ان کا بنیادی مقصد صرف شعرار کے مجمل حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کا تحفظ ہوتا تھا۔ لیکن تذکروں کے اس مختصر تنقیدی سرمائے سے قدمار کے سلسلہ میں تنقیدی رائے قائم کرنے میں بیحد مدد ملتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر احسن فاروقی : اردو میں تنقید ص ۱۵ (ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)۔

[2] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۱۵۔

[3] مسیح الزماں : اردو تنقید کی تاریخ ص ۴۷۔

[4] حامد حسن قادری : تاریخ و تنقید ص ۲۵۔

[5] سیّد عبداللہ : اردو شعرار کے تذکرے ص ۲۱۵۔

[6] سیدہ جعفر: فن کی جانچ ص ۵۹ [7] اختر انصاری: دیباچہ اردو کے تنقید معیار مرتبہ ایم حبیب خاں ص ۳۔

اردو شاعروں کے تذکرے بارہویں صدی ہجری کے وسط سے مرتب ہونے لگے تھے۔ ان میں سب سے پہلا تذکرہ میرؔ کا نکات الشعراء (مکتوبہ ۱۱۶۵ھ) ہے۔[1] اس کے بعد اردو میں بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ جن میں گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں قائم کا مخزن نکات، لچھمی نرائن شفیق کا چمنستان شعراء، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو، مصحفی کا تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحاء، ابراہیم خاں خلیل کا گلزار ابراہیم، مرزا علی لطف کا گلشن ہند، قدرت اللہ قاسم کا مجموعۂ نغز اور تمنا اورنگ آبادی کا گل عجائب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام تذکرے تقریباً ایک ہی نہج پر لکھے گئے ہیں، یعنی شاعر کے مختصر حالات یا واقعات زندگی، ماحول کا اجمالی خاکہ، نمونۂ کلام اور کلام پر مختصر رائیں، بس یہی ان کی کل کائنات تھی۔ لیکن کلام کے بارے میں ان مختصر رایوں سے جس تنقیدی شعور اور بصیرت کا سراغ ملتا ہے، وہی ان کا حاصل ہے۔

مرزا علی لطف کے گلشن ہند سے قبل تذکروں کی عام زبان فارسی تھی گلشن ہند پہلا تذکرہ ہے جس کی زبان اردو ہے، یہ دراصل گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے، لطف نے ترجمہ کے ساتھ حالات اور آراء کا مزید اضافہ بھی کیا ہے جس سے اس کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، اردو شعراء کے ان اہم تذکروں کے بعد تذکرہ نگاری کی ایک رَو چل پڑی۔ عبدالغفور نسّاخ کا سخن شعراء، شیفتہ کا گلشن بےخار، صابر کا گلستان سخن، تیلن اور کریم الدین کا طبقات الشعراء اسی عہد میں منصۂ شہود پر آئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء تک اردو تنقید اسی روش پر چلتی رہی۔

جدید اُردو تنقید اردو ادب کے ان ابواب میں سے ہے جو ہنگامہ غدر نے وا کئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سماجی زندگی میں جو عظیم تہذیبی ہلچل پیدا ہوئی اس کے اثرات تنقید پر بھی پڑے اور اس نے بھی اپنے اندر ایک انقلابی کیفیت پیدا کی۔ جدید تنقید اور قدیم تذکروں کے درمیان "آب حیات" کو تسلسل کی کڑی کی حیثیت حاصل ہے، محمد حسین آزاد نے مغربی ادب سے کافی حد تک اثر قبول کیا تھا۔ کرنل ہالرائڈ اور پنجاب سوسائٹی نے افادی

---

[1] عبدالحق: مقدمہ نکات الشعراء، ص ۱۔

ادب کے اسرار ان پر کھول دیئے تھے۔ اس لئے آب حیات مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کا ایک مرکب نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے محمد حسین آزاد کی تنقید نگاری کو "ناکامیاب کوشش" قرار دیتے ہوئے ان پر بہت سخت تنقید کی ہے[1]۔ لیکن بایں ہمہ وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ "چند مخصوص صفات کے باعث آب حیات تذکروں سے آگے بڑھ کر تاریخ ادب کے دائرہ میں آتی معلوم ہوتی ہے[2]"، اور "اردو تنقید نگاری کی تاریخ اس سے شروع کی جایا کرے گی"[3]

محمد حسین آزاد ہی کے دور میں جدید تنقید کی بنا حآلی نے رکھدی۔ ان کا شہرۂ آفاق "مقدمہ شعر و شاعری" اردو تنقید کا پہلا اہم صحیفہ بلکہ "عہد نامہ جدید" ہے۔ اس میں پہلی بار شاعری کی ماہیت اور اصول تنقید سے بحث کی گئی ہے۔ متعدد سوالات اٹھائے گئے ہیں، اور ان کے ذریعہ شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔[4] غالباً اسی اہمیت کے پیش نظر کلیم الدین احمد جیسے مغرب زدہ نقاد نے بھی حالی کے بارے میں جہاں نہایت سخت رائے ظاہر کی ہے کہ "خیالات ماخوذ" واقفیت محدود"، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنی، دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حآلی کی کل کائنات[5]"، وہیں وہ یہ لکھنے پر بھی مجبور ہوئے کہ "اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے مقدمہ شعر و شاعری اردو میں گویا پہلی اور اہم ترین ناقدانہ تصنیف ہے[6]"، ظاہر ہے کہ اس سے مقصود صرف حالی کے تنقیدی شعور کی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہے نہ کہ حالی سے پہلے تنقید کے وجود کی مطلق نفی۔ اختر انصاری نے حآلی کو "اردو کا پہلا باقاعدہ نقاد" لکھکر دراصل الفاظ کا صحیح استعمال کیا ہے[7]۔ مولوی عبدالحق حآلی کی تنقیدنگاری

---

[1] محمد احسن فاروقی : اردو میں تنقید ص ۴۸۔

[2] [3] محمد احسن فاروقی : اردو میں تنقید ص ۴۹، ۵۸۔

[4] عبدالقیوم : تنقیدی نقوش ص ۱۸۲ (انٹرنیشنل پریس کراچی سنہ ۶۳ء)۔

[5] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر (اشاعت سوم) ص ۱۰۹۔

[6] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر (اشاعت سوم) ص ۸۷۔

[7] اختر انصاری : "حالی" مضمون مشمولہ اردو تنقید کے معمار مرتبہ ایم حبیب خاں ص ۶۴۔

کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

> ”حالی نے صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی ان کا مقدمہ شعروشاعری ہمارے ادب میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف اور ان کے مقالات میں بھی تنقید کی شان نظر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ہماری زبان میں تنقید کا خاص چرچا شروع ہوگیا،،[1]

حالی نے مقدمہ عملاً مستقل کتاب کی حیثیت سے نہیں لکھا تھا اور نہ وہ مبادیات تنقید مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پیش نظر محض اپنی شاعری کے نئے رجحان کا جواز فراہم کرنا تھا۔ لیکن یہ ایک عہد آفریں تصنیف بن گئی۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی مقصدی ادب کے پہلے بالغ نظر مبلغ ہیں۔ ان کے یہاں تمام اصناف شاعری کا جائزہ محض تطہیر یا تہذیب کی غرض سے نہیں لیا گیا ہے۔ ابن فرید نے لکھا ہے کہ ”وہ ہیئت میں انقلاب سے زیادہ فکر میں انقلاب کے داعی ہیں۔ تمہید سے لے کر غزل و مثنوی کے دامنوں کو پارہ پارہ کرنے کے مرحلہ تک ان کے پیش نظر وہ اخلاقی اقدار ہر لحظہ رہتی ہیں جو ”پیروی مغربی“ کے ساتھ اعلیٰ انسانی صفات کی بھی ضامن رہتی ہیں۔ بالفاظ دیگر مقدمہ شعروشاعری ادب میں مغرب کی وکالت کے بجائے ادب میں ایک ایسے نظریئے کا صحیفہ ہے جس کی طرف اقبالؔ کے عروج تک ہم چشم پوشی کرتے رہے ہیں۔ اور یہ نظریہ معروف اخلاقی اقدار کا حامل نظریہ ہے۔ اس لئے صالح اور صحت مند تعمیری ادب کا پہلا داعی اور نقاد حالی ہی کو قرار دینا چاہیئے،،[2]

عبدالسلام ندوی نے حالی کے مقدمہ کو ”اردو لٹریچر میں معنوی حیثیت سے فن تنقید کا بہترین نمونہ“ قرار دیا ہے[3]۔ اختر انصاری نے لکھا ہے کہ :۔

> ”حالی اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد اور مقدمہ شعروشاعری

---

[1] بحوالہ اردو تنقید کے معمار مرتبہ ایم حبیب خاں ص ۱۳ ، [2] ابن زید : ”اردو تنقید کی تاریخ“ (مضمون) ماہنامہ ادیب علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء ص ، [3] عبدالسلام ندوی : شعرالہند ج ۲.

اردو میں تنقید کی پہلی کتاب ہے ،، [1]

پروفیسر آل احمد سرور رقمطراز ہیں :-

> "حالی ہمارے پہلے بڑے نقاد ہیں جنہیں تجربات میں فرق کرنا آتا ہے اور جو قدروں کا احساس رکھتے ہیں مگر جو تجربات اور قدروں کی وضاحت نہ کرسکے وہ ہمارے ادب کی خامی کا احساس شدت سے رکھتے تھے ، وہ جانتے تھے کہ ہمارے پاس کیا نہیں ہے ، کیا ہونا چاہیئے پر بھی ان کی نظر تھی . مگر کیسے ہو کے لئے وہ ہمیں زیادہ مدد نہیں دے سکے ،، [2]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حالی کے تنقیدی نظریات پر کافی سخت تنقید کی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ اعتراف حقیقت بھی کرتے ہیں کہ "ان تمام خامیوں کے باوجود حالی کے تنقیدی نظریات بہت اہم ہیں . ان میں مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کا امتزاج موجود ہے . ان دونوں کا مقابلہ بھی کیا ہے . لیکن ترجیح مغربی نظریات کو دی ہے . کیونکہ ان کے اندر ان کو زیادہ جامعیت نظر آتی ہے . حالی کے تنقیدی نظریات خیالات کی گہری سوچ کا نتیجہ ہیں . ان میں خلوص ہے ، سچائی ہے ، بے تکلفی ہے ، تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک ہیں . انہوں نے صوری و معنوی دونوں پہلوؤں کو شعر کے لئے ضروری قرار دیا ہے . [3]

پروفیسر عبدالشکور نے "مقدمہ" میں حالی کی تنقید نگاری کے چار نقائص کی نشاندہی کی ہے [4] پھر لکھتے ہیں کہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آزاد اور حالی ہم عصر تھے . اس قلیل مدت میں یہ تنقیدی لٹریچر پیدا کر لینا ان کا کمال ہے . آب حیات کا تنقیدی لٹریچر مقدمہ شعر و شاعری کے تنقیدی لٹریچر سے بدرجہا زیادہ کمتر اور ناقص ہے . حالی نے

---

[1] اختر انصاری : "حالی" مضمون مشمولہ اردو تنقید کے معمار مرتبہ ایم حبیب خاں ص ۶۴ .

[2] آل احمد سرور : تنقیدی اشارے (اشاعت چہارم) ص ۱۷۷ .

[3] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۶۲ (سود لیتھو پریس دہلی) [4] عبدالشکور : تنقیدی سرمایہ ص ۶۱ .

ایک نئے اور نہایت اہم فن یعنی تنقید کی بنیادیں استوار کیں۔ "مقدمہ" میں آب حیات کے مقابلہ میں ٹھوس، عالمانہ، با اصول اور مربوط تنقیدی لٹریچر ہے،،[1]

حالی صرف اصولی تنقید ہی کے امام نہیں ہیں۔ بلکہ عملی تنقید کی سربراہی بھی ان ہی کو نصیب ہوئی، یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حالی نے مغربی ادب سے براہِ راست اکتساب نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے مغربی ادب کے حوالے پیش کرتے ہوئے، اور مثالیں دیتے ہوئے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں، جدید نقادوں نے ان کی فروگذاشتوں پر بڑے ہنگامے برپا کئے لیکن بقول کلیم الدین احمد:—

> "اس کے باوجود اب تک کوئی تنقید کی تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری پر اضافہ ثابت نہ ہو سکی،،[2]

(۲)

اسی دور میں تنقید کے اسٹیج پر حالی کے بعد شبلی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اگر حالی کے یہاں مغربی اصول نقد پر اردو ادب کو جانچنے کی کوشش نظر آتی ہے تو شبلی مغرب سے استفادہ کے باوجود مشرق کا دامن تھامے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "مغرب نے انہیں متاثر ضرور کیا تھا۔ مگر ان کے مزاج کو جو خالص مشرقی تھا بدل نہ سکا۔ اسی لئے شبلی کی تنقید مشرقی طرز تنقید کی ترقی یافتہ شکل سے آگے نہ بڑھ سکی[3]،، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر شبلی کے تنقیدی شعور کی نمائندہ تصانیف ہیں۔

شعر العجم درحقیقت فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔ البتہ اس کی چوتھی جلد میں اصناف سخن کو اصول نقد پر لکھا گیا ہے۔ یہی حصہ شبلی کے تنقیدی شعور، نظریہ اور زاویہ کے سلسلہ میں اردو تنقید نگاروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے

---

[1] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۶۴۔

[2] کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر (اشاعت سوم) ص ۱۱۱۔

[3] ڈاکٹر احمر لاری: حسرت موہانی، حیات و کارنامے ص ۲۴۹ (نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۳ء)۔

رشبلی کی تنقیدی تصانیف میں اس کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے[1]۔ پرنسپل عبدالشکور نے بھی شبلی کے تنقیدی مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے شعر العجم کے حصۂ چہارم پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز کی ہے[2]۔ لیکن راقم سطور کے نزدیک شبلی کا سب سے اہم تنقیدی کارنامہ موازنہ انیس و دبیر ہے۔ اسی نے ان کو ایک منفرد نقاد کی حیثیت عطا کی ہے۔

نظریاتی اور اصولی تنقید کے ساتھ شبلی کے یہاں عملی تنقید کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ شعر العجم میں جہاں انہوں نے مختلف شعراء کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کے کلام کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔ ان تحریروں سے ان کی عملی تنقید کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ عبادت بریلوی رقمطراز ہیں :-

> "شبلی نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انہوں نے شاعری کے اصولوں پر بحث کی ہے۔ اصنافِ سخن کے اصول بھی وضع کئے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تصنیف شعر العجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔"[3]

موازنہ انیس و دبیر کی تنقید شعر العجم کی عملی تنقید سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہاں پہلے وہ فصاحت، بلاغت، کلام کی ترتیب، روزمرہ کے الفاظ کے استعمال، استعارات اور تشبیہات وغیرہ پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ علٰحدہ علٰحدہ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیات بتاتے ہیں۔ ان سے کلام میں جو خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور پھر ان سب کا اطلاق میر انیس کے کلام پر کرتے ہیں۔[4]

یہ بات یقیناً قابلِ ذکر ہے کہ حالی کے برخلاف شبلی نے مشرقی شاعری کو مشرقی اصولوں ہی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ان قوانین اور معیاروں کو مغربی

---

[1] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقار ص ۱۷۱۔
[2] عبدالشکور : تنقیدی سرمایہ ص ۶۷۔
[3] عبادت بریلوی : شبلی کی تنقید نگاری۔ (مضمون) مشمولہ "ادیب"، علی گڈھ شبلی نمبر ص ۲۱۱۔
[4] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقار ص ۱۸۴۔

تنقید سے مستعار لینے کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ جن کا حالی نے قدم قدم پر سہارا کیا ہے۔ دراصل یہی حال اور شبلی کے درمیان نمایاں خط فاصل ہے۔ اسی وجہ سے وہ حالی کے مقابلہ میں مشرقی ادب کی پنہائیوں میں اُتر سکے اور اس کی رُوح کو تلاش کر سکے ہیں۔ انہوں نے مغربی ادب کو بنظرِ تحسین ضرور دیکھا ہے مگر یہ کوشش نہیں کی ہے کہ مشرقی ادب کے ساتھ اسے خلط ملط کر دیں۔ [۱]

تمام نقادانِ سخن کا اتفاق ہے کہ شبلی کی تنقید نگاری میں مشرقی انداز تنقید کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کے تنقیدی افکار و نظریات میں مشرقیت نمایاں ہے۔ جب ہم ان کے اس رجحان کی بنیادوں کی جستجو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ادبی ذوق کی نشو و نما میں عربی شعر و ادب کے گہرے اثرات تھے۔ عربی نقادوں کے مطالعہ نے ان کو تنقیدی شعور پر جلا کی اور اس کی نشو و نما میں حصّہ لیا۔ [۲] وہ عربی ادب کی شہرۂ آفاق کتاب "العمدہ" کو بہت پسند کرتے تھے اور اس کو ابن رشیق کی تمام تصانیف کا "سرتاج" قرار دیتے تھے۔ [۳] انہوں نے رسالہ "الندوہ" دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس کتاب پر بہت مبسوط ریویو لکھکر اپنی پسندیدگی کے اسباب کی بہت مدلل وضاحت کی تھی۔

جس طرح اردو شاعری فارسی و عربی شاعری کی گود میں پروان چڑھی ہے۔ اسی طرح اردو تنقید بھی فارسی اور اس کے واسطے سے عربی تنقید کی رہینِ منت ہیں۔ یوں تو کتاب العمدہ سے قبل قدامہ بن جعفر کی نقد الشعر، ابو ہلال العسکری کی کتاب الصناعتین اور ابن قتیبہ کی ادب الکاتب وغیرہ جیسی قابل قدر کتابیں منصّۂ شہود پر آچکی تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ العمدہ کے مرتبہ کو کوئی تصنیف نہیں پہونچ سکی۔

ابن رشیق جس کے تنقیدی نظریات شبلی کی تنقید نگاری کا سرچشمہ ہیں، کتاب العمدہ میں لکھتا ہے کہ "شعر میں الفاظ جسم اور معانی روح کا درجہ رکھتے ہیں اور معانی کو الفاظ [۴] سے وہی

---

[۱] ابن فرید : اردو تنقید کی تاریخ (مضمون) مشمولہ ادیب علیگڈھ جون ۶۱ء۔

[۲] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۷۵۔

[۳] شبلی نعمانی : مقالات شبلی ج ۲ ص ۳۰۔

تعلق ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر شعر میں معانی بلند اور الفاظ کی کمی ہو تو وہ شعر ناقص ہوگا اور اسے پست کہا جائے گا اور اس کی مثال اس جسم کی ہوگی۔ جس کے تمام اعضا پورے نہ ہوں۔ اگر معانی میں افلاس ہوگا تو اس افلاس میں الفاظ کا حصہ زیادہ ہوگا اور معانی میں افلاس عموماً الفاظ کی کمی ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اگر معانی بالکل غائب ہوں اور اس کی غیبوبت دوسرے الفاظ کو بھی بگاڑ دے تو پھر اس کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں، اور وہ شعر بھی پست کہا جائے گا، اگرچہ وہ سننے میں کتنا ہی بھلا کیوں نہ ہو۔ جس طرح بظاہر ایک مُردہ آدمی کے جسم میں کوئی فرق نہیں آتا مگر اس سے نہ تو کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نہ وہ خود ہی کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر شعر میں الفاظ کی بالکل کمی ہو تو معانی دُرست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ روح بغیر جسم کے نہیں پائی جاتی[1]۔

شعر کی حسن کاری پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے "مجھے سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ شعر حسن اور سادگی کا جامع ہو۔ وہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہ ہو، غریب، ثقیل، اور وحشی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔ دقّت، مضمون آفرینی اور آورد سے پاک ہو مشہور امثال، موزوں تشبیہیں اور دلنشیں استعارے اپنے دامن میں لئے ہوئے ہو۔ لیکن تولید اور رقت کا یہ مفہوم نہیں کہ کلام پست، بے مزہ، پھیکا اور بازاری ہو۔ اسی طرح فصاحت، جزالت اور درشتی، ناہمواری، غرابت اور گنوارپن سے مختلف چیز ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان ایک اعتدالی حالت کا نام ہے،،[2]

اور اب شبلی کے تنقیدی نظریات کا جلوہ دیکھیں۔ انہوں نے شعر العجم میں صاف صاف اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ شاعری میں الفاظ کی اہمیت خیال سے کہیں زیادہ ہے، اس سلسلہ میں ابن رشیق کی اسی مذکورۃ الصدر رائے کو نقل کرنے کے بعد "لفظ جسم ہے اور مضمون روح، دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط" شبلی نے اہل فن کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک الفاظ کو ترجیح دیتا ہے دوسرا

---

[1] ابن رشیق : کتاب العمدہ ج ۱ ص ۱۰۳ (قاہرہ ۱۹۳۴ء)۔

[2] ابن رشیق قیروانی: کتاب العمدہ ص ۷۵۔

مضمون کو۔ لیکن اکثر کا مذہب یہی ہے کہ الفاظ مضمون سے زیادہ اہم ہیں اور آخر میں شبلی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:۔

> "شاعری یا انشاء پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے
> ...... گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے
> اور نادر نہیں۔ لیکن الفاظ کی فصاحت، ترتیب، اور تناسب
> نے اس میں سحر پیدا کر دیا ہے،،[1]

اپنی عملی تنقید میں بھی شبلی شاعری میں الفاظ اور صوری پہلو کو اہمیت دیکر زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ شبلی نے جدّت ادا، تشبیہ، استعارہ اور سادگی وغیرہ پر نہایت سادگی سے بحث کی ہے۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ فنّی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ بقول عبادت بریلوی "اس طرح کی بحثوں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا بنیادی مزاج مشرقی تھا، اسی باعث ان مشرقی اصطلاحات تنقید پر بہت زور دیتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مبالغہ آرائی اور لایعنی باتوں کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک اس مشرقیت کے باوجود واقعیت اور سادگی شاعری کے لئے ضروری ہیں، ان خیالات میں وہ حالی سے معانقہ کرتے نظر آتے ہیں،،[2]

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شبلی کے یہ تنقیدی افکار ابن رشیق ہی کے مذکورۃ الصدر خیالات کی صدائے بازگشت ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی پوری تنقید نگاری پر ابن رشیق اور کتاب العمدہ کے گہرے نقوش مرتسم ہیں۔ جدید اردو تنقید میں مغربی ادب کے میلانات کی جو زبردست لہر اس وقت تک آچکی تھی، اقتضائے عصر کے مطابق اس سے انہوں نے استفادہ ضرور کیا لیکن اپنے قلب و ذہن کو ابن رشیق اور کتاب العمدہ کے گہرے اثرات سے کلی طور پر آزاد نہ کر سکے۔ چنانچہ رہ رہ کر ان کا تنقیدی شعور اسی

---

[1] شبلی نعمانی: شعر العجم ج ۴ ص ۶۸۔

[2] عبادت بریلوی: "شبلی کی تنقید نگاری،، (مضمون) مشمولہ ادیب علی گڈھ شبلی نمبر ص ۲۰۹۔

مشرقی انداز تنقید کا علم بلند کرنے لگتا ہے۔ غالباً اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقمطراز ہیں کہ :۔

> „شبلی کی تنقید میں مشرقی انداز تنقید کا رنگ گہرا ہے، وہ نقاد سے زیادہ معانی و بیان کے عالم نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع کی سماجی اہمیت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ بس الفاظ کے صحیح استعمال ان کی شیرینی، ان کی سادگی، جدت ادا اور اسلوب کی دلآویزی کا ذکر کرتے رہتے ہیں، بہرحال وہ مشرقی تنقید کے علمبردار ہیں،،[1]

پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی اسی وجہ سے لکھا ہے کہ :۔

> „شبلی کا زاویۂ نظر، شبلی کی تنقید کا ساز و سامان شبلی کی طرزِ ادا۔ ان چیزوں میں قدیم تنقید کی صاف کارفرمائی ہے۔ نئی تنقید کے اصول، نئی تنقید کا زاویۂ نظر، نئی تنقید کی ٹیکنک یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتیں،،[2]

ڈاکٹر احسن فاروقی نے موازنہ انیس و دبیر پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے شبلی کے تنقیدی شعور پر کلیم الدین احمد کے انداز کی تیز و تند تنقید کی ہے[3] مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔

> „شبلی محمد حسین آزاد سے زیادہ تنقید نگار کہلانے کے مستحق ہیں اور حالی کو چھوڑ کر اب تک کوئی اردو کا نقاد ایسا نہیں نظر آتا جس کو ان سے بہتر کہا جا سکے۔ تنقید کے موجدوں میں حالی کے بعد ان کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا، اور موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد سب سے زیادہ رہے گی،،[4]

---

[1] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۸۵ [2] کلیم الدین احمد : اردو تنقید پر ایک نظر ص ۱۱۷۔
[3] [4] احسن فاروقی : اردو میں تنقید ص ۱۱۹، ۱۲۲۔

اردو تنقید میں شبلی کی ایک اور امتیازی خصوصیت قابل ذکر ہے۔ جس کا تتبع دبستان شبلی کے تمام نقادوں نے کیا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے انیس اور فردوسی پر جو نہایت مفصل اور مبسوط تنقیدیں لکھی ہیں، ان میں انہوں نے ان کی شاعری کا جائزہ ایک خاص انداز سے لیا ہے، یعنی مختلف عنوانات مثلاً نظام حکومت، فصاحت و بلاغت، تہذیب و تمدن، حکمت و موعظت، اور اخلاق و سیاست وغیرہ قائم کر کے ان کے تحت تفصیلی ریویو قلمبند کیا ہے[1]۔ عنوانات قائم کر کے تنقیدیں لکھنے کا یہ رواج اس کے بعد عرصہ تک عام رہا ہے۔ اس سے شبلی کے تنقیدی لٹریچر کے دور رس اور پائندہ اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جدید اردو تنقید میں شبلی کے امتیاز خاص کا اتباع بہت سے ذوق شناسان ادب نے کیا، اور اس کے نتیجہ میں مشرقی تنقید کا ایک مستقل دبستان وجود میں آگیا جس کے امام شبلی ہیں۔ مشرقی ادب کا اپنا مزاج ہے، مشرق کی اپنی تہذیب اور اقدار حیات ہیں لیکن انہیں ابھی تک منضبط تنقیدی اصول کی تشکل نہیں دی جا سکی ہے۔ شبلی کے یہاں اس کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ گو انہیں شعوری طور پر مرتب کرنے کا رجحان ان کے یہاں بھی نظر نہیں آتا۔ مگر اس کے باوجود بقول ابنِ فرید:—

> "اگر حالی جدید تنقید کے امام ہیں، تو شبلی جدید مشرقی تنقید کے امام ہیں"[2]

(۳)

جدید مشرقی تنقید کے جس دبستان کے شبلی امام تھے۔ اس کے مقتدیوں میں حکیم سید عبد الحئی، عبد السلام ندوی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، عبد الماجد دریابادی، اقبال سہیل، مرزا احسان احمد، شاہ معین الدین، سید صباح الدین، اور علامہ سید سلیمان ندوی کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں[3]۔ یوں تو شبلی کی مخصوص تنقیدی روایات بقول

---

[1] عبد الشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۷۵، [2] ابن فرید: اردو تنقید کی تاریخ (مضمون) مشمولہ ادیب علیگڈھ جون ۱۹۶۱ء ص ۱۰، [3] ان کے علاوہ حافظ محمود شیرانی، حامد حسن قادری، پنڈت دتاتریہ کیفی اور محی الدین زور بھی مشرقی تنقید ہی کے حامل نقاد ہیں

عبدالشکور پچیس ۲۵ تیس ۳۰ سال تک اردو ادب میں اثر انداز رہیں[۱]، اور شبلی کی تنقید کے زیرِ اثر ایک پوری جماعت علم و ادب کی جانب متوجہ ہوگئی، لیکن درحقیقت مذکورہ بالا "نورتن" ہی نے ان روایات کی شدت اہتمام اور کامل عقیدت کے ساتھ اتباع کی اور اس کو مزید آگے بڑھانے کے لئے سعی مشکور کی۔ دبستان شبلی کے تمام نقادوں کے تنقیدی اکتسابات سے بحث کرنا باعثِ طوالت بھی ہے۔ اور ہمارے موضوع سے براہِ راست غیر متعلق بھی۔ اس لئے ذیل میں سیدالطائفہ علاّمہ سیّد سلیمان ندوی کی تنقید نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

علاّمہ سید سلیمان ندوی کے قصرِ عظمت کے ستون علم و تحقیق کی بنیادوں پر بلند ہیں مذہب و تاریخ ان کی تحقیقات کے خصوصی جولانگاہ تھے۔ لیکن خالص ادبی و تحقیقی موضوعات بھی ان کے دائرۂ فکر و نظر سے باہر نہیں رہے۔ اس سلسلے میں ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے انہوں نے تنقید کو تحقیق سے گلے ملایا ہے، تحقیق و تنقید کا اتنا کامیاب، مکمل اور متناسب امتزاج اس سے پہلے ان کے استاذ شبلی کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ سیّد صاحب کے کے مضامین ہاشم کا مجموعہ مراثی، اردو کیوں کر پیدا ہوئی، جواہر الاسرار، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق، تہنید، اور ہماری زبان کا نام اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر "تحقیق و تنقید میں ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہوتا ہے، محقق اسی وقت اپنی تحقیق کو آگے بڑھا سکتا ہے، جب اسے ٹیکنک کا شعور ہو اور وہ اپنے ذہن میں تنقیدی اصولوں کا ایک واضح خاکہ رکھتا ہو، سلیمان ندوی کے ادبی مضامین اسی لئے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں تحقیق کے نچوڑ کے ساتھ ساتھ تنقید کی روح بھی موجود ہے"[۲]

"خیام" سیّد صاحب کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کا تحقیقی پایہ اس کی دوسری تمام حیثیتوں پر غالب ہے۔ اور بلاشبہہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کتاب کا بیشتر حصّہ سیرت نگاری پر مشتمل ہے، لیکن بایں ہمہ عمرِ خیام کی شاعری

---

[۱] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۷۶۔

[۲] ڈاکٹر سیدہ جعفر: اردو مضمون کا ارتقا ص ۱۵۴ (نیشنل پریس حیدرآباد سنہ ۷۲ء)۔

اور رباعی کے آغاز و ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ سیّد صاحب کا تنقیدی شعور روشن اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ:۔

> ”خیام میں تنقید کا پہلو نام کو نہیں ملتا۔ شاید تحقیق کی دھن میں انہوں نے تنقید سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے“[1]

یہ نہایت انتہا پسندانہ رائے ہے۔ پروفیسر عبدالشکور جن کا کسی نقاد کو سند قبول و اعتراف عطا کرنے کا معیار کلیم الدین احمد ہی کی طرح سخت ہے، ”خیام“ کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> ”خیام اردو تنقیدی ادب میں ایک بڑا یادگار اضافہ ہے اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اتنی بلند تنقیدی کتاب اردو تنقید کے گذشتہ دور میں کمیاب ہے“[2]

”خیام“ میں سیّد صاحب کی تنقید نگاری کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ خیام کی بادہ پرستی اور میخواری کی حقیقت واضح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> ”چونکہ آب و ہوا اور ساری فضا میں شراب کا نشہ بھرا ہوا تھا۔ اس لئے زاہد و عابد اور عالم و فاضل سے لے کر رند و آزاد تک اگر شراب پیتا نہ تھا تو شراب بولتا ضرور تھا۔ اور گل و بلبل کی طرح شراب و جام بھی تشبیہات و استعارات کا ضروری جزو بن گئے تھے .... فارسی شاعری کو تو گھٹی ہی میں شراب ملی چنانچہ آج تک فارسی شاعری اس نشہ سے چور ہے، کبھی وہ شراب معرفت تھی، کبھی مئے محبّت، اور آج بادۂ وطن ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے شراب کبھی چھوئی بھی نہیں جب شعر کہنے لگتے تھے۔

---

[1] عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقا ص ۲۶۵۔

[2] عبدالشکور: تنقیدی سرمایہ ص ۱۲۱۔

توکم از کم لفظوں میں اس کا خیالی لطف ضرور اٹھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہویں صدی ہجری کے اقراری بادہ نوش شاعر غالب کو یہ کہنا پڑا :۔

'' ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر'' [1]

سید سلیمان ندوی کی براہِ راست تنقیدی تحریریں ان مضامین اور مقدمات پر مشتمل ہیں، جن کا مجموعہ نقوشِ سلیمانی کے نام سے ۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ باب سوم میں اس کتاب میں شامل مضامین پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ ان میں سے جن مضامین میں خاص طور پر سید صاحب کے تنقیدی خیالات ملتے ہیں، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں :۔

اکبر کا ظریفانہ کلام، مکاتیب شبلی، مجموعہ مراثی ہاشم علی، مکاتیب مہدی، کلام شاد، کلیات عشق، شعلۂ طور، خمستان، مسدس حالی، عطرِ سخن، اور خیاباں۔ ان میں بھی شعراء کے دواوین پر مقدمے خصوصیت سے سید صاحب کے تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بقول عبدالماجد دریابادی :۔

'' سید صاحب کے تنقید و تبصرے کی بہار دیکھنا ہو تو مقدمات کی سیر کرنی چاہیئے۔ جو کتابیں گمنام، غیر معروف اور دھندلی تھیں وہ جیسے اس مسِ سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی روشن و معروف تھیں ان میں اور چار چاند لگ گئے ہیں،، [2]

سید سلیمان ندوی کی تنقید نگارشات میں وہی آب و رنگ پایا جاتا ہے۔ جو علامہ شبلی کا خاصۂ امتیازی تھا۔ دونوں کے یہاں یہ خصوصیت بھی مشترک ہے۔ کہ وہ کسی ادیب یا شاعر کو پسند پہلے کرتے ہیں اور اپنے پسند کی جواز کی بظاہر معقول وجوہ

---

[1] سید سلیمان ندوی : خیام ص ۴۳۵ (معارف پریس اعظم گڈھ ۳۳ء)۔

[2] عبدالماجد دریابادی : نقوش سلیمانی (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۴۲ ۔

بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً شبلی نے انیس اور فردوسی کے بارے میں جس طرز کی تنقید نگاری کی ہے۔ سید صاحب نے جگر، اکبر، شاد، اور امجد کی شاعری کا جائزہ بعینہٖ اسی انداز میں لیا ہے۔ محمود الحسن رضوی نے درست لکھا ہے کہ :۔

> "سلیمان ندوی نے ان روایات کی نمائندگی کی جن کی بنیاد شبلی نے قائم کی تھی۔ شبلی نے مذہبی مسائل، اسلامی معاشرت مشرقی تمدن، اور قدیم ادبی نظریات کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کی تھی۔ سلیمان ندوی بھی انہیں کے خیالات واصولوں کی وسعت دینے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی لئے ان کی ادبی تصانیف میں بھی مشرق کے قدیم انداز تحریر اور فنی معیار کی خصوصیات پائی جاتی ہیں،،[1]

سید صاحب نے کسی مضمون میں اپنے تنقیدی اصول ونظریات سے باقاعدہ بحث نہیں کی ہے۔ صرف بعض مضامین کے مطالعہ اور عملی تنقید کے نمونوں سے ان کے تنقیدی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ سید صاحب نے ہر آن اس بات کی کوشش کی ہے کہ شبلی کے نقش قدم پر چلیں اس لئے ان کے تنقیدی نظریات پر شبلی کے گہرے اثرات مرتسم نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ بھی شاعری کو جذباتی اظہار اور دلی احساسات وتاثرات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کی صحیح تعریف یہ ہے کہ :۔

> "وہ لفظوں میں شاعر کے جذبات وتاثرات کی تصویر ہے اور جذبات وتاثرات صرف ذاتی واردات ہو سکتے ہیں اور نقالی اور اخذ وسرقہ سے ادا نہیں ہو سکتے۔ یہ ہار سچے موتیوں سے تیار ہوتا ہے۔ جھوٹے موتی اس کے لئے بیکار ہیں،،[2]

---

[1] محمود الحسن رضوی : اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ص ۳۰۱ ۔

[2] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۴۵۴ ۔

یہ وہی خیالات ہیں جن پر شبلی نے اپنے تنقیدی نظریات کی بنیاد رکھی تھی۔ اور جس کے جلوے شعر العجم (جلد چہارم) اور مقالات شبلی کے اوراق میں نظر افروز ہوتے ہیں۔ سید صاحب کے مذکورہ خیال کے مطابق شاعری ایسے جذبات کا مجموعہ قرار پاتی ہے۔ جس میں خلوص ہو، سچائی ہو، اصلیت اور واقعیت ہو۔ یہاں سید صاحب حالی کی تنقیدی فکر سے بھی ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی شاعری کے مقصدی ہونے کے بھی قائل ہیں۔ اسی باعث وہ اکبر الہ آبادی کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ کہ اس کے پیچھے ایک گہرے اور دوررس مقصد کی کارفرمائی تھی۔ اکبر مغربی تہذیب وتمدن کے سیل رواں اور مضرات سے ہندوستانی قوم اور بالخصوص مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے اکبر کے کلام پر تفصیلی ریویو کرتے ہوئے ان کی نصب العینیت اور مقصدیت کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے[1]۔ ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ تبدیلی حالات کے ساتھ شاعری کے مقاصد بھی تغیر پذیر ہوجاتے ہیں۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:—

> "اب سلاطین کے فتوحات کی طاقت نہیں بلکہ قوم کی فاتحانہ اور اولوالعزمانہ طاقت اہل سخن اور اصحاب قلم کے سینوں میں جوش، زبانوں میں تیزی اور قلموں میں روانی پیدا کرتی ہے اب زمانہ سلاطین کے درباری شعراء کا نہیں بلکہ قومی اور ملی شاعروں کا ہے۔ جو بادشاہوں کے مدحیہ قصیدوں کی ملک وملت کے جذبات کی ترجمانی کریں اور اپنی رجز خوانی سے اس کے سپاہیوں کا دل بڑھائیں،،[2]

مذکورہ بیان سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو یہ کہ سماجی زندگی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب میں جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے، سید سلیمان ندوی کو اس کا شعور ہے

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۱۷۲، ۴۵۷۔

اور دوسرے ان کو اس بات کا احساس بھی ہے کہ ادب کو قوم و ملک کی بیداری میں نمایاں کام کرنا چاہیئے[1] لیکن بعض جگہ سید صاحب نے ایسے خیالات بھی ظاہر کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے اجتماعی مفہوم سے شاید پوری طرح باخبر نہیں۔ اکبر کے ظریفانہ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

> "ایک شاعر و خطیب میں سب سے بڑا نازک فرق یہی ہے کہ شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھاتا ہے اور خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے۔ اور ان کے خیالات و جذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعراء کا ایک خاص رنگ مذاق ہے۔ جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتا ہے،،[2]

ایک دوسری جگہ "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں ان ہی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :-

> "ہر فطری شاعر وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔ وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا، جو ہر جگہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے دل کی نہیں، دوسروں کی کہتے ہیں، وہ ہر رنگ محفل اور ہر ذوق دل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر وہ اس لحاظ سے شاعر نہیں بلکہ ایک پیشہ ور خطیب اور واعظ ہیں،،[3]

---

[1] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقاء ص ۲۶۶ ۔

[2] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۱۶۳ ۔

[3] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۴۳۰ ۔

مذکورہ بالا دونوں بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ ہر شاعر میں اپنی ایک انفرادیت ہونی چاہیئے۔ اور اس کے لئے دوسروں کی نقالی مناسب نہیں۔ سیّد صاحب کی اس معقول رائے سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا۔ مگر ان بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سیّد صاحب کو اجتماعی شعور سے مکمل اتفاق نہیں اور وہ شاعری کے لئے صرف یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ شاعر کے اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہو، اور اس کو عوام سے کوئی تعلق نہ ہو، یہاں ان کی تنقید عینیت کی طرف مڑتی نظر آتی ہے، شاعری یقیناً جذبات واحساسات کی ترجمانی ہے، اور شاعر جب چند خیالات پیش کرتا ہے تو اس میں خارجی حالات کے باعث پیدا شدہ کیفیات کی جھلک ہوتی ہے، خارجی حالات کا ہو بہو بیان نہیں ہوتا۔

لیکن شاعری کا سائنٹفک نظریہ تو یہ ہے کہ شاعر کسی حال میں بھی اجتماعی زندگی اور عوام سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ شاعر عوام کی ترجمانی کرکے یا ان کو مخاطب کرکے خطیب نہیں بن جاتا۔ اگر اس کے فن میں جان ہوتی ہے تو وہ بہر حال اس کی شاعری، شاعری رہتی ہے۔ خواہ اس کے فن میں خطابت کا رنگ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، شاعر کے متعلق صرف یہ خیال کرلینا صحیح نہیں ہے وہ صرف اپنا ہی دل دیکھتا ہے دوسروں سے اس کو سروکار نہیں ہوتا[1]۔ سیّد صاحب کے اس طرح کے تنقیدی خیالات وتصورات میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے الجھاؤ اور تضاد کی نشاندہی کی ہے وہ کہتی ہیں اور ایک حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو سیّد صاحب کے خیال میں فطری شاعر وہ ہے جو صرف اپنے احساسات میں ڈوبا رہے اور "ہر رنگ محفل" اور "ہر ذوق کی نمائندگی" شاعر کو غیر فطری بنا دیتی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب درباری شعراء کا نہیں بلکہ قومی وملی شاعروں کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے قومی شاعر تو دوسروں کے جذبات کی بھی ترجمانی کرے گا، اور سید صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق "پیشہ ور خطیب اور واعظ" قرار پائے گا[2]۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سیّد صاحب کی مذکورہ بالا رائے پر

---

[1] عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقاء ص ۲۶۷، [2] سیدہ جعفر: اردو مضمون کا ارتقاء ص ۱۵۵۔

تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

> "شاعر تو کائنات کی ہر چیز کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ اس کے احساسات کی شدت معمولی سے معمولی واقعہ کا گہرا نقش اس کے دل پر چھوڑتی ہے۔ پھر وہ عوام کے دلوں کو کیسے نہیں ٹٹولے گا اور اگر اس کو کچھ کہنا ہے اگر وہ پیام دینا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ عوام سے سروکار رکھے گا۔ اور اپنی آواز سے ان کو متاثر کرے گا۔ تاکہ وہ اس پر عمل کریں۔ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں نے ایسا کیا ہے۔ شاعری جذبات و احساسات کی ترجمانی ضرور ہے۔ لیکن اسی حد تک محدود نہیں ہے۔ وہ شاعر کے ادراک کا بھی نتیجہ ہوتی ہے، اور شاعر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ عوام سے غافل رہے اور ان کو متاثر کرنے سے خواہ مخواہ چشم پوشی کرے۔"[1]

سید سلیمان ندوی ادب میں ماحول کے اثرات کی اہمیت سے بھی واقف ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہر زمانہ کے حالات ہی اس زمانے کے ادب کی تشکیل کرتے ہیں، سماجی زندگی میں جو کیفیت ہوتی ہیں، حالات جو کروٹ لیتے ہیں، اس کی جھلک براہِ راست یا بالواسطہ ادب اور شعر میں نمایاں ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :۔

> "یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ ہماری شاعری کی پیدائش اس وقت ہوئی جب قوم پر مردنی چھائی تھی، اس کی ساری قوتیں ٹھنڈی تھیں اور یاس اور ناامیدی اس کو ہر طرف سے گھیرے تھی۔ ایسی قوم کے دل و دماغ میں قومی کا اشتعال، دافعیت کی قوت، مقصد کی بلندی، اور عزم و ہمت کا جوہر کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا، میں سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا، اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفریں عہد

---

[1] عبادت بریلوی : اردو تنقید کا ارتقاء، ص ۲۶۸۔

> پیدا نہ کرتی تو رستم و سہراب اور کیکاوس اور افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑ سکتی تھی۔ اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نہیب، تلواروں کی یہ جھنکار اور داد شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتے تھے،،[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں ماحول اور حالات و واقعات سے ادب اثر قبول کرتا ہے اور اس کے تمام شعبے سماجی حالات کے سانچے میں ڈھلتے ہیں، لیکن سید صاحب اپنی نگارشات میں اس بات پر زور کم ہی دیتے ہیں کہ ادب و شعر بھی ماحول میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ شعر و ادب کے مقصدی و نصب العینی ہونے کے قائل تو ضرور ہیں۔ لیکن ان کو انقلاب وارتقار کی منزل تک پہنچانے کے خیال سے ان کی تنقید کے پر جلتے ہیں۔

سید صاحب کے یہاں تیکنک کا شعور موجود ہے۔ وہ بعض ہیئتوں کو بعض خاص نوعیت کے خیالات کی ترجمانی کے لئے موزوں خیال کرتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں مواد و ہیئت میں ایک ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ مسدس حالی پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے اس خیال کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ اور بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالی نے جن خیالات کو پیش کیا ہے وہ مسدس ہی میں بہتر طریقے سے ادا ہو سکتے تھے۔

سید صاحب کی عملی تنقیدوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر کی خصوصیات تو بیان کر دیتے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں وہ کسی اصول سے کام نہیں لیتے، جس کے باعث ان کے یہاں کوئی معقول تجزیہ نہیں ملتا۔ خصوصیات شماری کے بعد نقاد کے لئے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان خصوصیات کے محرکات کو بھی اجاگر کرے ورنہ اس کا تجزیہ ناقص ہوگا۔ سید صاحب اکبر کی ظریفانہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے اس کی تمام خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں، لیکن اس پر قلم نہیں اٹھاتے کہ کن حالات کے ماتحت اکبر کے کلام میں ظرافت پیدا ہوئی۔ مسدس حالی کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان تمام باتوں کو پیش کرتے ہیں جو

---

[1] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۲۵۶۔

مسدس میں موجود ہیں، لیکن مسدس کو کن حالات نے پیدا کیا، آیا وہ اپنے وقت کی پیداوار ہے یا نہیں اس کا وہ مطلق ذکر نہیں کرتے۔ اگر ان کی تنقید میں کہیں یہ صفت پیدا بھی ہوئی ہے تو محض اشاروں کی صورت میں۔

وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں تنقید کی مشرقی اصطلاحات سے ہی کام لیتے ہیں، مثلاً فصاحت، بلاغت، تشبیہات واستعارات، لطافت وروانی، بے ساختگی آمد، آورد، جدّت ادا، غرض اس طرح کی تمام اصطلاحات ان کی تنقیدوں میں ملتی ہیں انہوں نے کہیں کہیں سادگی اور جوش بیان وغیرہ کی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ غدر کے بعد عہد قدیم کے ادب میں جو تغیرات رونما ہوئے تھے اور تنقید کے پرانے سانچوں میں جو تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں، سید صاحب ان سے بھی کسی حد تک متاثر ہوئے تھے۔

اب ذیل میں سید صاحب کی تنقیدی نگارشات کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں، جن سے سطور بالا کی تصریحات کی وضاحت ہوگی، اور اس کے ثبوت فراہم ہوں گے

وہ کلام شاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاؔد عظیم آبادی کی شاعری کو صحت الفاظ، فارسی تراکیب، سنجیدگی ومتانت حسن وعشق کی داستان سرائی، سادگی وصفائی، اور رقت میں میر تقی میر کا مماثل قرار دیتے ہیں،، [1]

> شاہؔ رکن الدین عشق کے کلام کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔
>
> ”عشق کے عاشقانہ کلام کی اصل خوبی سادگی، لطافت، جوش، بیان اور روانی ہے۔ مصرعوں میں اتنی برجستگی ہوتی ہے کہ ہر شعر خوبی وفصاحت کی ایک صاف ومصفیٰ سلسبیل ہے، نہ پیچیدگی ہے، نہ اشکال ہے، نہ ثقل تراکیب ہے۔ ساتھ ہی فصاحت وبلاغت کی یہ جوئے رواں ابتذال اور مضامین پامال کے خس وخاشاک سے پاک ہے۔،، [2]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی ص ۳۹۹، ص ۴۱۸۔

جگر کو "تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعر" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد ہے۔ موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق، اور آورد سے پاک۔ طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا۔ معنوی حیثیت سے سرمستی اور سرشاری، تاثیر اور دل فگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہے[1]"۔ صہبائی کے مجموعۂ کلام "خمستان" کی تقریظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

> "رباعی گوئی کے لئے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو۔ ترکیبیں چست اور رواں ہوں، اور پہلے مصرعہ سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ میں پورا زور نمایاں ہو جائے۔ یہ تو لفظی خوبیاں ہیں، معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقائق اور معانی ادا ہوں[2]"

مسدس حالی کی نمایاں خصوصیت سید صاحب کے نزدیک سادگی، بے تکلفی، روانی، سلاست، برجستگی، زبان کی گھلاوٹ، بیان کی حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے[3]۔ یہ صحیح ہے کہ سید صاحب کی اکثر تنقیدیں تاثراتی انداز سے قریب تر ہیں، لیکن اس میں بعض وقت تجزیاتی تنقید کے بھی اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مہدی افادی کی خطوط نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے اس میں حسب ذیل محاسن کی نشاندہی کی ہے۔

> "۱ تصویرِ فطرت کا جمال، ۲ قلم کا چلبلاپن اور البیلاپن، ۳ تلمیحات ۴ متین رنگینی اور سنجیدہ شوخی، ۵ جدت تراکیب، ۶ اختراع الفاظ، ۷ لطافت ذوق"[4]

اور محض تجزیہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے تجزیہ کو اصل خطوط کی متعدد مثالوں سے مدلل اور مبرہن کیا ہے، مذکورہ تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سید صاحب

---

[1] [2] [3] [4] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی۔ ص ۴۲۰، ۴۳۸، ۴۵۰، ۳۸۵ - ۳۸۹۔

کی تنقید نگاری کا تمام مسالہ اور ساز و سامان مشرقی تنقید کے کارخانے میں تیار ہوا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ۔ مشرقیت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ اگر کہیں شاذو نادر اس کے خلاف نظر آتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اقتضائے عصر کے تاثر کا نتیجہ ہے۔ عہد کے تغیر کے تمام نقاد تنقید و ادب کے جدید تقاضوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف ضرور تھے۔ لیکن بعض نقاد ان تقاضوں سے منحرف ہو کر تقلیدی طور پر کسی مخصوص دبستان تنقید سے وابستہ ہو گئے، اور اس کی خصوصیات اور انداز نقد کی اتباع کی۔ سید سلیمان ندوی بھی ایسے ہی نقادوں میں ہیں

سیّد صاحب کا تنقیدی پایہ کتنا ہی متنازعہ فیہ ہو، لیکن شبلی کے دبستان تنقید کے انفرادی امتیازات کی جس شدّت عقیدت اور کامل کامرانی کے ساتھ انہوں نے اتباع کی ہے اس کا اعتراف ہر مؤرخ تنقید نے کیا ہے۔ اردو تنقید نگاری کی تاریخ میں سیّد صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے تنقید کی خشکی و یبوست کو (جو فنّی طور پر اس کا لازمی عنصر خیال کر لی گئی ہے) باغ و بہار اور گل و گلزار بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کی خطوط نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> "اردو میں غالبؔ نے جب سے ادب کے گرم مجمر میں عود ہندی جلایا ہے اردوئے معلیٰ اس کی خوشبو سے بس گئی ہے۔ علما اور صوفیہ کے خطوط اور مکتوبات تو اپنی روحانی برکتوں، علمی بحثوں اور مذہبی عقیدتوں کے سبب سے ہماری عقیدت مندیوں کا صحیفہ ہیں۔ مگر غالب کے خطوط میں جو مزہ ہے وہ صرف ادبی نکتہ پردازیوں کے چٹخارہ سے ہے۔ مرزا غالب کیا کیا خون جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے۔ مگر تقدیر کی عجائب کاری دیکھئے کہ ان کے خون جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خزانے کا کوئی قیمتی لال نہ بن سکا اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے چہکتے اور چہچہاتے ان کی زبان قلم سے نکل گئے ان کا ہر لفظ قدردانوں

میں موتیوں سے زیادہ قیمتی ٹھہرا اور آج وہ ہمارے ادبی خزانے
کا بیش قیمت سرمایہ ہے"[1]

علامہ شبلی کی طرح سید صاحب بھی شعر و ادب کو اپنے علمی دسترخوان کی چٹنی کہا کرتے تھے۔ یعنی جسطرح ثقیل غذا کے ساتھ ذائقہ بدلنے کے لئے چٹنیاں استعمال کی جاتی ہیں اسی طرح علمی ذائقہ کی تبدیلی کے لئے یہ دونوں ارباب فن ادب و شعر کی طرف مائل ہوتے تھے۔ ورنہ دراصل ان کو قرآن و حدیث، تاریخ و سیرت، سیر و رجال اور تحقیق و جستجو میں فرط انہماک کسی اور طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔ مگر جب وہ ان علوم کے مطالعہ اور احاطہ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے ذہنی تفریح کرنا چاہتے تو میدان ادب میں اپنے اشہب قلم کو مہمیز دے دیتے تھے۔ اور چونکہ ان کے علم میں گہرائی اور نظر میں وسعت تھی اس لئے جو ادبی تحریریں محض تفریحاً ہی ان کے قلم سے تراوش کر گئیں وہ میزان قدر میں گراں پلہ قرار پائیں اور اس سے ان کی ہمہ گیری کے حدود میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔

* * *

---

[1] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ٢٧٨

باب ہفتم

صحافت

ماہنامہ الندوہ لکھنؤ

علامہ سید سلیمان ندوی کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک نمایاں رُخ اور ان کے لافانی کارناموں کی داستان کا ایک روشن ورق ان کی صحافت بھی ہے۔ لیکن یہ صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ یہ کہنا قطعی مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ صحافت کے روایتی طرز و آہنگ میں علمی وقار، ادبی پاکیزگی، اسلوبی متانت اور وسیع امکانات پیدا کرنا سید صاحب کے اوّلیات میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ یقیناً یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت اپنے شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی اور اس میدان میں بہت سے شاطرانِ کہنہ مشق اپنی مہارت و مقبولیت کا ثبوت دے چکے اور برابر دے رہے تھے۔ سید صاحب صحافت کے آسمان پر اس وقت طلوع ہوئے جب ہماری فضائے ادب مخزن، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ منتھلی، اردوئے معلّٰی، دلگداز، معارف (علی گڑھ) زمانہ، نگار، سچ، الناظر، ہمدرد، اور الہلال جیسے روشن اور تابناک ستاروں سے مزیّن تھی۔ اور شیخ عبدالقادر، سرسید، حسرت موہانی، عبدالحلیم شرر، وحیدالدین سلیم، منشی دیانرائن نگم، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی، ظفرالملک، محمد علی جوہر، اور ابوالکلام آزاد جیسے اساطین علم و ادب اردو صحافت کی آبرو شمار ہوتے تھے۔

لیکن اس سلسلہ میں سید صاحب کی انفرادیت اور ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صحافت کے مروّجہ تصور اور معیار کو اتنا بلند کر دیا کہ اس کی سرحدیں تخلیقی ادب علمی تصنیف سے مل گئیں۔ جیسا کہ آئندہ صفحات سے اس کے واضح ثبوت فراہم ہوں گے۔ بظاہر سید صاحب نے کئی سال تک الندوہ اور الہلال کے سب اڈیٹر اور مجلہ معارف کے اڈیٹر کی حیثیت سے بہت نمایاں کارنامے انجام دیئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو صحافت نہیں بلکہ ماورائے صحافت کسی اور ہی چیز سے تعبیر کرنا صحیح ہوگا۔ مالک رام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "صحافت کو بوجوہ ادب

میں شمار نہیں کیا جاتا"۔[1] لیکن سید صاحب نے الہلال اور معارف میں کثرت سے ایسے مقالے لکھے جو عروس ادب کی جبین کا نور ہیں۔ کیا ادب، کیا تحقیق اور کیا محاسن انشاء سب کا ایک دلکش، دل آویز، اور بصیرت افروز حسین گلدستہ ہے جس کی خوشبو سے سید صاحب کی پوری صحافتی زندگی معمور نظر آتی ہے۔ جیسا کہ مذکور ہوا، سید صاحب کے صحافتی کارنامے الندوہ، الہلال اور معارف پر مشتمل ہیں۔ اس لئے ذیل میں ان تینوں کا علیحدہ علیحدہ تنقیدی جائزہ لے کر سید صاحب کے صحافتی مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲)

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح دنیائے صحافت میں بھی سید صاحب کی غیرمعمولی کامیابی درحقیقت علامہ شبلی کے فیضان تربیت کا ثمرہ تھی۔ شبلی صحافت کا طویل تجربہ اور اس کی فنی نزاکتوں سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ وہ چار سال تک علی گڑھ منتھلی کا اردو حصہ ایڈٹ کرچکے تھے۔ اور پھر رسالہ "الندوہ" کے بانی اڈیٹر کی حیثیت سے بھی اس میدان میں اپنی مہارت کا ثبوت دے چکے تھے۔ مزید برآں انھوں نے عالم اسلام کی صحافت اور اس کے طرز و معیار کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اس لئے انھوں نے اپنے وسیع صحافتی تجربات و واقفیت سے سید صاحب کی صحافتی تربیت پر بھی خصوصی توجہ کی۔ چنانچہ مکاتیب شبلی جلد اول میں سید صاحب کے نام شبلی کے جو ۸۲ خطوط شامل ہیں ان میں سے متعدد سے اس کے شواہد فراہم ہوتے ہیں، اور اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ سید صاحب نے قصر صحافت کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ بہت سے شاطران کہنہ مشق بھی ورطۂ حیرت میں پڑ گئے۔

الندوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مشہور علمی رسالہ اور اس کا نقیب تھا علامہ شبلی کو اس کی اشاعت کا خیال سنہ ۱۹۰۲ء میں آیا۔[2] لیکن جب ندوہ کی طرف سے رسالہ نکالنا طے ہوگیا تو مجلس انتظامی کے ارکان نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو اس کا اڈیٹر

---

[1] مالک رام: "مولانا آزاد، صحافی و ادیب" (مضمون) سہ ماہی "صبح" دہلی مولانا آزاد نمبر سنہ ء۔

[2] اس کا سب سے پہلا ذکر مولانا شیروانی کے نام شبلی کے خط مورخہ ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۰۲ء میں ملتا ہے۔

بنا دیا۔ چنانچہ یہ کام شبلی کے خاص ذوق و رجحان کا تھا۔ اور اس کے محرک اوّل بھی تھے اس لئے ان کو ارکان ندوہ کے اس فیصلہ سے طبعاً ملال ہوا۔ اور انھوں نے مولانا شیروانی کے نام ۲۴ / اگست ۱۹۰۲ء کے ایک خط میں اپنی اس آزردگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں۔ اور شاید میں کسی قدر اس کو انجام بھی دے سکتا تھا۔ آپ نے دونوں سے مجھے الگ رکھا۔ مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لئے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں۔ مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے"[1] پھر بعض اور خطوط میں بھی شبلی نے اس شکایت کا اعادہ کیا ہے[2]۔ اس اثناء میں مولانا شیروانی برابر کوشاں رہے کہ اپنی ادارتی ذمہ داریوں میں علامہ شبلی کی بھی شرکت پر ارکان کو تیار کرلیں۔ چنانچہ ان کی مساعی بارآور ہوئیں اور ۱۹۰۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں شبلی رسالہ "الندوہ" کے سب اڈیٹر قرار دے دیئے گئے۔

اس مرحلے کے طے ہوتے ہی علامہ شبلی نے الندوہ کے اجراء کے لئے عملی جدوجہد شروع کر دی۔ مولانا شیروانی کے نام شبلی کے اس زمانہ کے متعدد خطوط میں اس کا ذکر ملتا ہے ان خطوط کے درج ذیل اقتباسات اس حیثیت سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے یہ اندازہ لگانے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ شبلی کے پیش نظر الندوہ کا کیا معیار و انداز تھا اور رسالہ کو اس تک پہونچانے کے لئے انھوں نے کیا تگ و دو کی۔

مولانا شیروانی کے نام ایک مکتوب (۱۵ / اکتوبر ۱۹۰۲ء) میں رقمطراز ہیں

"اس وقت دو کام ضروری ہیں۔ ندوہ کا رسالہ۔ یہ ندوہ کی علمی عزت کو تھام لے گا۔ یقین کیجئے میری تصنیفات کا سارا زور اس پر صرف ہوگا۔ رسالہ میں حسب ذیل چیزیں ہوں گی۔ علوم و فنون اسلامیہ پر ریویو، علوم قدیمہ و جدیدہ کا مقابلہ، اثبات عقائد اسلامیہ از عقل، تحقیقات جدیدہ، کتب قدیمہ نادرہ پر ریویو، اغراض ندوہ، رپورٹ ماہواری ندوہ، اڈیٹر آپ اور یہ خاکسار رہوگا۔ لیکن مضامین ہمیشہ بے نام چھپیں گے۔ کیوں کہ نام کی صورت میں ان

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۴۳۔

[2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۳۸۔

مضامین کی عزّت کا پایہ شبلی اور حبیب تک محدود رہے گا۔ اور یوں وہ مضامین ندوہ کی مجموعی طاقت کے مضامین ہوں گے۔ قیمت صرف ۲؍ روپے اور غایت کثرت سے تمام ہندوستان میں پھیلایا جائے گا۔ یہاں تک کہ کم از کم دس ہزار پرچے اس کے شائع ہونے لگیں۔"[1]

پھر رسالہ کی ترتیب و معیار اور امور طباعت و کتابت سے متعلق مولانا شیروانی کو ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کے خط میں لکھتے ہیں "(۱) اسلامی خبروں کو میں نے نکال ڈالا (۲) اڈیٹر کی تقسیم یوں ہوگی کہ ہر مہینہ میں نصف رسالہ کا مضمون آپ اور نصف کا میں بھیجا کروں، باہر سے جو مضامین آئیں وہ بالائی آمدنی ہوگی (۳) مضمون نگاروں کا یا کسی اور کا مضمون اس وقت تک نہ چھپنے پائے جب تک میں یا آپ اس کو دیکھ نہ لیں (۴) معاوضہ مضامین کے لیے پچاس روپے ماہوار مخصوص ہوں گے۔ صلہ حسب عمدگی مضامین باختلاف مراتب دیا جائیگا[2] (۵) اصل دشواری طبع کی ہے۔ آگرہ کو میں ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔ ندوہ کا رسالہ کم از کم اردوئے معلیٰ اور مخزن سے زیادہ خوش خط اور نفیس الطبع ہو۔ اس کے لئے ندوہ خود ایک پریس کیوں نہ کھولے۔"[3]

اس سلسلہ میں درج ذیل خط بھی نہایت تاریخی اور بہت اہم ہے یہ امر ملحوظ رہے کہ ابھی تک رسالہ کا اجراء عمل میں نہیں آیا ہے۔ بلکہ اس کے مقاصد، فراہمی مضامین، سائز، ضخامت اور طباعت وغیرہ امور پر بحث ہو رہی ہے۔ اس خط پر ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کی تاریخ درج ہے۔ لکھتے ہیں "یورپ میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی علمی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو قریباً سال بھر کے لئے مضامین تیار کرلیتے ہیں، تب نکالتے ہیں۔ الندوہ کیلئے بھی یہ ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ بڑی دقت چھپنے کی ہے۔ اس لئے میری تو یہ رائے ہے کہ دو تین مہینے کا ذخیرہ اس طرح چھپوا لیا جائے کہ صرف ٹائیٹل پیج اور علمی خبروں کا اضافہ کردینے کے بعد رسالہ بن جائے۔ میں نے ایک چھوٹا سا

---

[1] نقوش لاہور مکاتیب نمبر مرتبہ محمد طفیل۔ جلد اول نومبر ۵۷ء ص ۱۴۴۔

[2] غالباً الندوہ کی پوری تاریخ میں بوجوہ اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ لیکن اس سے بہرحال شبلی کے عزم و ہمت اور اقتضائے زمانہ سے باخبری کا اندازہ ہوتا ہے۔

[3] نقوش لاہور مکاتیب نمبر ج ۱ ص ۱۸۵۔

مضمون فن تفسیر پر، ایک ریویو فن منطق پر، جس میں یونانی منطق کی غلطیاں بتاتی ہیں۔ ایک فرنچ عالم کے مضمون کا جو اسلام پر ہے ترجمہ کر لیا ہے۔ مثنوی مولوی روم پر تقریظ کا ایک وسیع سلسلہ شروع کیا ہے۔ آپ بھی اسی طرح جستہ جستہ مضامین لکھ چلئے۔ صحابہ کے اخلاق سے شروع کیجئے، اور جو جو خیال آتا جائے۔ ہاں یہ بتائیے تقطیع کیا ہو۔ کیا اردوئے معلیٰ کے برابر؟ لیکن خط اس سے جلی ہونا چاہیئے۔ اڈیٹر کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ دبیر سے اچھا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ لوح پر اڈیٹروں کا نام لکھنا ہوگا۔ میں اس کو بھی اڑا دیتا۔ لیکن اول تو سرکاری احکام سے اس کی ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے لوگوں میں ندوہ کی ہوا اس قدر اکھڑ چکی ہے کہ محض ندوہ کے نام سے اس حلقہ میں اس کی کچھ وقعت نہ ہوگی۔ ہاں رسالہ کے صفحات کس قدر ہوں۔ میں تو دو جزو کافی سمجھتا ہوں“[1]

رسالہ الندوہ کے اجراء پر روشنی ڈالنے والے شبلی کے مذکورہ بالا اہم خطوط غالباً سید صاحب کو فراہم نہیں ہو سکے اس لئے یہ مکاتیب شبلی میں جگہ نہ پا سکے۔ ان خطوط سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ گو بعض اختلافی وجوہ کے باعث ارباب ندوہ شبلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب پھر رسالہ کے لئے مولانا شیروانی کے ساتھ شبلی کی ادارت طے پا گئی تو شبلی نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو اس رسالہ کی کامیابی کے لئے وقف کر دیا۔ خطوط بالا سے ایک تڑپ، لگن، اخلاص، انہماک اور برقی لہر کا احساس ہوتا ہے۔ جس نے نہ صرف شبلی کو بلکہ رسالہ الندوہ کو اردو صحافت کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل بنا دیا ہے۔

بہر حال رسالہ الندوہ کا پہلا شمارہ بڑی آب و تاب کے ساتھ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ کر اگست ۱۹۰۴ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ ۳۲ صفحہ کا یہ رسالہ شبلی کے بلند عزائم اور عالی حوصلگی کا پورا غماز تھا۔ الندوہ کے ٹائٹل پیج پر اس کا مقصد ”علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ“ بڑی پابندی کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ رسالہ کے سرورق پر علامہ شبلی اور مولانا شیروانی دونوں کا نام اڈیٹر کی حیثیت سے درج ہوتا تھا، لیکن درحقیقت دوسرا نام صرف ”نعمانی“ کے قافیہ اور وزن کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ ورنہ اصل

---

[1] نقوش لاہور مکاتیب نمبر مرتبہ محمد طفیل، ج ۱ ص ۱۸۵۔

ادارتی ذمہ داریاں علامہ شبلی ہی انجام دیتے تھے، اور ان ہی کے نام سے اس رسالہ کو شہرتِ دوام اور قبول عام حاصل ہوا۔ گو الندوہ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ لیکن اس کی شہرت کا عہد شباب ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ ہے۔ جب علامہ شبلی کی ادارت اور سید سلیمان ندوی کی نائب ادارت کا فخر اس کو حاصل تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس مقالہ نگار کا نام ایک بار بھی الندوہ کے صفحات پر نظر آجاتا وہ قوم کی آنکھوں کا تارہ بن جاتا تھا۔

الندوہ ایک نیم علمی نیم مذہبی رسالہ تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تین چوتھائی علمی اور صرف ایک چوتھائی مذہبی۔ اس لئے کہ اس کے جو مضمون مذہبی ہوتے تھے وہ بھی تاریخی، فلسفیانہ اور تمدنی غرض کوئی نہ کوئی علمی ہی رنگ لئے ہوتے تھے۔ علامہ شبلی کا معیار عصری تقاضوں کو دیکھتے ہوئے نہایت بلند تھا۔ اس لئے الندوہ میں ہما شما مقالہ نگاری کی ہمت بھی نہ کرتے تھے۔[1] بایں ہمہ اگر کوئی طالب علم بھی معیاری مقالہ تحریر کرتا تو نہ صرف الندوہ کے صفحات میں اس کو جگہ ملتی، بلکہ مولانا شبلی اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

الندوہ کے اجراء کا ایک مقصد طلبہ دارالعلوم کی تربیت بھی تھی۔ اس لئے وقتاً فوقتاً ہونہار و باصلاحیت طلبہ میں سے اس کے نائب اڈیٹر مقرر کئے جاتے تھے۔ تاکہ ان میں سلیقہ تحریر و تصنیف کے ساتھ رسالہ کو مرتب کرنے اور اس کے معیار کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے چنانچہ جون ۱۹۰۵ء میں سب سے پہلے نائب اڈیٹر مولانا عبداللہ العمادی ہوئے۔ اس وقت علامہ شبلی لکھنؤ میں مستقل قیام پذیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ اب رسالہ کی طباعت آگرہ کے بجائے آسی مدراسی کے مشہور مطبع اصح المطابع میں ہونے لگی۔[2]

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے سب اڈیٹر رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ان کی بعد کی عظمت و مقبولیت میں جہاں ان کی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کو دخل تھا۔ وہیں اس میں علامہ شبلی کے فیضان صحبت و تربیت کا بھی بڑا حصہ تھا۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون "مسلمانوں کا

---

[1] عبدالماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۲، جنوری ۱۹۵۴ء ص ۲۔

[2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۳۴۴۔

ذخیرہ علوم اور یورپ" اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں چھپا۔ اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل و مدلل تبصرہ لکھا جو الندوہ میں بالاقساط عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ الندوہ کے مضامین نے پورے ملک میں ابوالکلام کے نام کا ایسا غلغلہ بلند کیا کہ دنیائے صحافت میں ہر طرف سے ان کی مانگ ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں وہ اس زمانے کے مشہور اخبار وکیل میں امرتسر چلے گئے۔

(۳)

۱۹۰۶ء دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سید صاحب کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ سید صاحب کے علمی مضامین ۱۹۰۲ء ہی سے اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہو رہے تھے[1] مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد علامہ شبلی نے سید صاحب کو الندوہ کا سب اڈیٹر بنایا، اور پھر اس وقت سے ۱۹۱۲ء تک بعض درمیانی وقفوں کے ساتھ وہ بتفصیل ذیل اس منصب پر مامور رہے:۔

۱۔ از ۱۹۰۶ء تا مارچ ۱۹۰۸ء۔
۲۔ اگست ۱۹۰۸ء تا فروری ۱۹۱۰ء۔
۳۔ اگست ۱۹۱۱ء تا مئی ۱۹۱۲ء۔

درمیانی مدت میں دو مہینے (جون، جولائی ۱۹۰۸ء) عبداللہ عمادی اور گیارہ مہینے (مارچ ۱۹۱۰ء تا اپریل ۱۹۱۱ء) عبدالسلام ندوی (صاحب شعر الہند) الندوہ کے سب اڈیٹر رہے۔ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ سید سلیمان ندوی کی صحافتی زندگی تمام تر علامہ شبلی کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھی تھی۔ الندوہ کی نائب ادارت سنبھالنے کے بعد علامہ شبلی نے سید صاحب کے نام جو خطوط لکھے ان کے حسب ذیل اقتباسات سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

۱۔ "اڈیٹوریل نوٹ میں امور ذیل کو زور دے کر لکھو۔ ندوہ کا اثر،

---

[1] سید سلیمان ندوی: پیش لفظ مضامین سید سلیمان ندوی مرتبہ ابو سلمہ محمد شفیع ص ۳ (پٹنہ سنہ ء)

ایک انگریز کا ندوہ میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنا اور ندوہ سے اس کی کفالت، تعلیم سے اس کی غرض اشاعت اسلام"۔ [۱]

۲۔ "المنار میں اب کے مسلمانان روس کی تعلیمی و تجارتی حالت مفصل چھپی ہے اس کو الندوہ میں لو"۔ [۲]

۳۔ "الندوہ کے پرچے دیکھے۔ بدخطی اور ناموزونی ایک طرف، الفاظ کا مسخ ہونا کیوں کر گوارا کرتے ہو"۔ [۳]

۴۔ "تم سب اڈیٹر تھے۔ دفعتہً لکھنؤ سے چل دیئے۔ کسی کو خبر تک نہ کی، اس کی کچھ فکر نہیں کہ پرچۂ آئندہ کے لئے مضامین تیار ہیں یا نہیں۔ کاپیوں کی تصحیح کون کرے گا"۔ [۴]

۵۔ "چند روز تک میرے مضمون سے پرچہ خالی رہے گا۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ اپنی حیثیت سے گر جائے"۔ [۵]

۶۔ "کم از کم دو مہینے پہلے پرچہ کے تمام مضامین تیار رہنے چاہئیں تاکہ پرچہ وقت پر تیار رہے۔ تمام میگزین یہی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ تمام اہل قلم سے خط و کتابت رکھنی چاہیئے"۔ [۶]

۷۔ "تم نے غلطی کی اور ہمیشہ یہ غلطی ہوتی ہے کہ الندوہ میں علمی خبریں نہیں دیتے ہو..... مصر میں جامعہ مصریہ کا خاص پرچہ نکلا ہے۔ یہی نام ہے۔ اس کے اڈیٹر سے خط و کتابت کرو، اپنا پرچہ بھیجو اور مبادلہ کی درخواست کرو"۔ [۷]

---

[۱] مکاتیب شبلی جلد دوم، مکتوب نمبر ۱۰ مؤرخہ ۲۱ر اگست سنہ ۱۹۰۶ء۔ (طبع اول سنہ ۱۷ء)

[۲] " " " " " ۱۲ " ۵ر جنوری سنہ ۱۹۰۷ء۔

[۳] " " " " " ۱۳ " ۱۷ر مارچ سنہ ۱۹۰۷ء۔

[۴] " " " " " ۱۴ " ۱۲ر اپریل سنہ ۱۹۰۷ء۔

[۵] " " " " " ۱۹ " ۳۰ر فروری سنہ ۸ء۔

[۶] " " " " " ۲۱ " ۵ر مارچ سنہ ۸ء۔

[۷] " " " " " ۲۵ " " " "۔

اسی زمانے میں الندوہ کے دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء اور جنوری سنہ ۱۹۰۹ء کے شماروں میں سید صاحب کے مضامین ایمان بالغیب اور مکررات القرآن شائع ہوئے۔ علامہ شبلی نے ان کی قلمی جولانیوں پر اظہار مسرت کرتے ہوئے لکھا:-

> "دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا۔ اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا۔ البتہ عبارت کی کمزوری باقی ہے۔ وہ بھی جاتی رہے گی۔ ہاں شذرات ضرور ہونا چاہیئے۔" [1]

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے سید سلیمان ندوی کو ایک علمی رسالہ کے سلیقہ ترتیب، علمی معیار، حسن طباعت اور اس میدان کے دوسرے تمام ضروری گر ذہن نشین کرا دیئے تھے۔ جو ایک کامیاب صحافی اور معیاری صحافت کی ضمانت ہیں، ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں رسالہ معارف کو اس کی جن خصوصیات و محاسن نے اردو صحافت کی تاریخ کا ایک روشن باب بنایا اس کی تخم ریزی دراصل علامہ شبلی کے زیر تربیت، سید صاحب کے "الندوہ" کے زمانۂ ادارت ہی میں ہو گئی تھی۔

گو سیّد صاحب نے رسالہ الندوہ کی سب اڈیٹری کی ذمہ داریاں سنہ ۱۹۰۶ء ہی سے انجام دینا شروع کر دی تھیں، لیکن رسالے کے سرورق پر باضابطہ نائب اڈیٹر کی حیثیت سے ان کا نام پہلی بار مئی سنہ ۱۹۱۱ء کے نمبر میں آیا۔ اس سے قبل وہ اپنی ادارتی صلاحیتوں سے علامہ شبلی کو اتنا متاثر کر چکے تھے کہ جب عبدالسلام ندوی کے زمانہ سب اڈیٹری کے بعض شمارے شبلی کو پسند نہیں آئے تو انھوں نے سید صاحب کو لکھا۔ ہاں اب الندوہ یوں چلتا نظر نہیں آتا۔ پھر تم اپنے ہاتھ میں لو جو شرطیں پیش کرو گے منظور کر دوں گا۔ مجھ کو الندوہ سے کوئی غرض نہیں۔ لیکن وہ درحقیقت ندوہ کا ایک اعلان ہے۔ اس کو مٹانا نہیں چاہیئے۔ [2]

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم۔ مکتوب نمبر ۲۷ مورخہ ۱۴ر فروری سنہ ۱۹۰۹ء۔

[2] " " " " ۳۴ " ۲۹ر مئی سنہ ۱۹۱۱ء (طبع اول سنہ ۱۹۱۷ء)۔

الندوہ مئی ۱۹۱۱ء کا جو پرچہ سرورق پر سیّد صاحب کے باضابطہ نام کے اندراج کے ساتھ شائع ہوا[1]۔ اس کے بارے میں عبد الماجد دریابادی اپنے مخصوص طرز تحریر میں رقمطراز ہیں :-

> "بڑا انتظار مئی ۱۱ء کے الندوہ کا تھا۔ خبر مل چکی تھی کہ سید صاحب اس کے لئے ایک مقالہ بڑی محنت سے "اشتراکیت اور اسلام" کے عنوان سے سوشلزم کی تحقیق اور تردید میں تیار کر رہے ہیں۔ رسالہ بہت تاخیر سے نکلا...... یہ انتظار بہت ہی کھلا۔ لیکن جب مضمون پڑھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ الندوہ کی ضخامت کل ۴۲ صفحے کی ہوتی تھی۔ خود یہ مقالہ پورے ۳۲ صفحے کا تھا۔ مجبوراً شذرات کے دو صفحے بڑھا کر ۴۴ صفحے کا نکالنا پڑا، ضخامت سے قطع نظر مضمون واقعی بڑی کاوش وجامعیت کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ اور آج ۴۰۔ ۴۲ برس کے بعد بھی پڑھا جائے تو بھی انشاء اللہ ترمیم واضافہ کی گنجائش کم ہی نکلے گی"۔[2]

اس وقت اسلام پر سوشلزم کے حملہ کا آغاز ہی ہوا تھا اور علماء اس حملہ کے خلاف اپنی تمام علمی صلاحیتوں کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ آج اس صورت حال کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس وقت سوشلزم کے حملہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت اور دفاع کتنی اہمیت کی حامل تھی بہرحال سید صاحب کی علمی دھاک جو آگے چل کر مخالفین وموافقین دونوں کے دلوں پر بیٹھی، اس کی بنیاد ڈالنے میں مذکورہ بالا مقالے کا بڑا حصہ ہے۔

سید صاحب کی باضابطہ اور مسلسل سب اڈیٹری کا یہ زمانہ صرف ایک سال تک قائم رہا۔ اس مدت میں انھوں نے خالص علمی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر نہایت وقیع

---

[1] اس سے پہلے مئی جون ۱۹۰۷ء کے پرچوں کے سرورق پر بھی "سید سلیمان اسسٹنٹ اڈیٹر" درج ملتا ہے۔

[2] عبد الماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۲ر جنوری ۱۹۵۳ء ص ۴۔

وبسیط اور محققانہ مقالے کثرت سے لکھے۔ الندوہ ہی کے صفحات میں سید صاحب نے "طبقات ابن سعد" کو متعارف کرایا جو اس وقت ہندوستان کے اچھے اچھے اہل علم کے لئے بالکل ایک نئی کتاب تھی۔ سید صاحب مصر وشام کے عربی رسالے خصوصاً الہلال اور المقتطف کو نہایت اہتمام وانہماک کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ان رسالوں میں فرانسیسی وبرطانوی اہل علم اور ماہرین فن کی تحقیقات برابر شائع ہوتی رہتی تھیں، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے اور ان میں سے اہم وکارآمد چیزوں کو اخذ کر کے کبھی علمی خبروں کے تحت اور کبھی مستقل مضمون کے طور پر الندوہ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۲ء میں سید صاحب کا جو عالمانہ مضمون "سائنس فنائے مادہ کا قائل ہوگیا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ وہ مشہور فرانسیسی اہل قلم موسیو گستاؤلی بان کی کتاب ارتقائے مادّہ (Evolution Of Matter) سے مستفاد تھا۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ اب تک یورپ کے مادہ پرستوں کا عدم فنائے مادہ کا جو اصول تھا اس کی صحت اب متزلزل ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے یہ مذہب کی طرف سے الحاد پر بہت بڑی زد تھی[1]۔ چنانچہ اس نے مادیین کی صفوں میں ماتم برپا کر دیا۔ سید صاحب کے اسی طرح کے جدید سائنسی وتاریخی معلومات سے پر مقالوں نے نہ صرف الندوہ کو چار چاند لگائے بلکہ خود سید صاحب کی شہرت وعظمت علمی حلقوں میں خوب چمکی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ "سید صاحب کے الندوہ کی ایک سالہ ادارت کے دور میں نگاہیں جس شوق سے مولانا شبلی کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں، اس سے کچھ کم اشتیاق حضرت سلیمان کے بھی علمی افادات کا نہیں رہتا تھا۔"[2]

(۴)

رسالہ الندوہ اپنی زندگی میں متعدد نشیب وفراز سے گزرا۔ اس کا عہد زرّیں اگست ۱۹۰۴ء تا مئی ۱۹۱۲ء کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب اس کی مسند ادارت پر علامہ شبلی نعمانی

---

[1] [2] عبدالماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۲ر جنوری ۵۴ء ص ۴، ۵۔

اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی شخصیتیں متمکن تھیں۔ اور مولانا عمادی، ابوالکلام آزاد، عبدالسلام ندوی اور سب سے بڑھ کر سید سلیمان ندوی کی سب اڈیٹری کا شرف اس کو حاصل تھا۔ اس کے بعد ارکان ندوۃ العلماء کے باہمی نزاعات و اختلافات سے تنگ آکر مولانا شبلی اس کی ادارت سے مستعفی ہو گئے[1]۔ اب ندوہ کے منتظمین نے اس کی ادارت کی ذمہ داری دارالعلوم کے ایک مدرس میر عبدالکریم کے سپرد کی۔ وہ "مولوی مدن والی بات" تو پیدا نہ کر سکے۔ بایں ہمہ کچھ عرصہ تک کامیابی سے رسالہ نکالتے رہے۔ بعدازیں جولائی ۱۹۱۳ء سے مولوی اکرام اللہ خاں ندوی نے اس بار امانت کو سنبھالا۔ اور بالآخر ۱۹۱۶ء کے اواخر میں اس رسالہ کے دور قدیم کا خاتمہ ہوگیا[2]۔ پھر جنوری ۱۹۴۰ء میں سید سلیمان ندوی نے اپنی نگرانی میں ندوہ کے بعض پر جوش اور باصلاحیت فارغ التحصیل طلبہ کو اس کی ادارت سپرد کر کے بھولی ہوئی روایت کو دوبارہ تازہ کیا۔ اس کو الندوہ کا دور جدید کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر ناسازگار حالات کے باعث دور جدید کا رشتہ حیات بھی جلد ہی منقطع ہوگیا۔

رسالہ الندوہ کا سائز ۲۰×۲۶/۸ اور ضخامت معمولاً ۲ جزو یعنی ۳۲ صفحے رہی۔ کبھی کسی ہنگامی سبب کے باعث چالیس صفحات پر مشتمل شمارے بھی نکالے گئے۔ لیکن اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ یہ رسالہ ابتداء میں ۲ قسم کے کاغذ پر طبع ہوتا تھا۔ پہلے قسم اول کی سالانہ قیمت مع محصول للعہ اور قسم دوم کی تین روپیہ مقرر کی گئی تھی۔ مگر دو مہینہ بعد ہی بعض لوگوں کے مشورے پر اور حلقہ اشاعت زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی خاطر قیمت میں تخفیف کر کے قسم اول تین روپے اور قسم دوم دو روپے کر دی گئی۔ لیکن بعد میں پھر کاغذ کی دو رنگی ختم ہو گئی اور رسالہ ایک ہی قسم کے کاغذ پر چھپنے لگا۔ اور عام چندہ ڈھائی روپے سالانہ ہو گیا۔[3]

ندوۃ العلماء کے مددگار ناظم حکیم مولوی سید عبدالحئی (صاحب گل رعنا) کے نام سے رسالہ الندوہ کا رجسٹریشن تھا۔ اس لئے وہی شروع سے آخر تک اس کے منیجر رہے۔ اس وقت

---

[1] جولائی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں "معذرت" کے عنوان سے شائع شدہ ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ "شبلی نے اپنے مشاغل کثیرہ کے باعث اڈیٹری سے استعفا دے دیا" (صفحہ ٹائٹل ۲)۔

[2] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۴۷۔ [3] "الندوہ" لکھنؤ۔ جون ۱۹۰۵ء، ضروری اطلاع۔ صفحہ ٹائٹل ۳۔

ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا مسیح الزماں رئیس شاہ جہانپور تھے۔ اس لئے ندوہ کا آدھا دفتر اور مولوی عبدالحئی مینیجر رسالہ کا قیام بھی شاہ جہاں پور ہی میں تھا۔ چنانچہ الندوہ کے ابتدائی ۸-۹ ماہ کے شماروں کے آخری صفحہ پر یہ لکھا ہوتا تھا "کل خط وکتابت مینیجر رسالہ کے نام ندوۃ العلماء شاہ جہاں پور کے پتہ سے کی جائے اور روپیہ بھی اسی پتہ سے بھیجا جائے۔

پھر ۱۹۰۵ء کے اوائل میں جب علامہ شبلی نے لکھنؤ آکر مستقل قیام کیا تو اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کا دفتر بھی شاہ جہاں پور سے لکھنؤ منتقل ہوگیا۔ اور آخر تک وہیں سے رسالہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ الندوہ کی فائلوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی طباعت مختلف پریسوں میں ہوتی ہے۔ اس میں دوسرے وجوہ بھی کارفرما ہو سکتے ہیں۔ لیکن راقم سطور کے نزدیک اس کا ایک اہم سبب حسن طباعت کے سلسلہ میں مولانا شبلی اور سید صاحب کا بلند ذوق ومعیار ہے۔

"الندوہ" صرف علماء کا پرچہ نہیں تھا۔ بلکہ اس میں مضمون نگاری کے لئے ہر مسلک وخیال کے شخص کو صلائے عام تھی۔ شرط صرف مضمون کا معیاری اور بلند پایہ ہونا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۰۳ء کے آغاز میں ایک "ضروری گذارش" کے عنوان سے درج ذیل اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس سے رسالہ کی وسیع المشربی، عالی ظرفی اور کشادہ قلبی کا اظہار ہوتا ہے:۔

> "اکثر لوگوں نے بجائے خود یہ گمان کر لیا ہے کہ ہمارا اس پرچہ (الندوہ) میں صرف علماء مضمون لکھنے کے مجاز ہیں۔ اس بنا پر اس وقت تک کسی نے کوئی مضمون نہیں بھیجا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ الندوہ میں جو شخص چاہے مضمون لکھ سکتا ہے۔ صرف یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ علمی مضامین ہوں اور بلند پایہ ہوں۔"
>
> "الندوہ کے اصول سے اختلاف کا بھی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ اس پرچہ میں نصاب تعلیم پر جو مضمون ہے۔ وہ الندوہ کی رائے کے مخالف ہے۔ تاہم ہم نے اس کو بجنسہٖ شائع کر دیا ہے۔"

الندوہ کی تمام مقبولیت اور شہرت کے باوجود اس کے خریداروں کا حلقہ صرف

پانچ سو تک محدود تھا۔ میر عبدالکریم نے دسمبر ۱۲ء کے شمارہ میں قوم کی اس بے حسی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب علامہ شبلی جیسے لائق مضمون نگار کے نو سالہ اڈیٹری کے طویل زمانے میں الندوہ کو صرف مذکورہ بالا تعداد میں خریدار بہم پہونچ سکے تو پھر کوئی اور شخص کیا ذمہ داری لے سکتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے۔ جون ۱۹۱۲ء سے دار العلوم کے فقیہ اوّل میر عبدالکریم علوی الندوہ کے اڈیٹر ہو گئے۔ موصوف بھی بڑی خداداد صلاحیتوں کے انسان تھے۔ جس کا اندازہ اس طویل مضمون سے ہو سکتا ہے۔ جو انھوں نے "حرکت زمین پر بسیط بحث" کے عنوان سے اگست اور ستمبر ۱۲ء کے مکمل پرچوں (یعنی ۶۴ صفحوں) میں لکھا تھا۔ اور پھر بھی ناتمام رہا۔ اسی طرح مسئلہ قدم و حدوث عالم جولائی (۱۲ء) اور عبادت الٰہی (دسمبر ۱۲ء) بھی ان کے قابل ذکر مضامین شمار ہوتے ہیں۔ اس عہد کے الندوہ میں کوئی نمایاں ظاہری تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ایک بات البتہ قابل ذکر ہے کہ میر عبدالکریم کے پورے زمانہ ادارت میں شذرات کا صفحہ کہیں نہیں ملتا۔ نہ معلوم اس کا کیا سبب تھا۔ دراصل علمی رسائل میں شذرات نگاری علامہ شبلی کی سنت ہے۔ وہ اس کی اہمیت اور لزوم کے شدت سے قائل تھے۔ سید صاحب کے نام اپنے خطوط میں برابر اس کے لکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ الندوہ اور پھر بعد میں رسالہ "معارف" میں لکھے ہوئے سید صاحب کے اسم بامسمیٰ شذرات (سونے کے ڈلے) آج تک سرمۂ سلیمانی بنا کر آنکھوں سے لگائے جاتے ہیں۔

(۵)

رسالہ الندوہ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد کی حسب خواہ تبلیغ و اشاعت کی۔ ہندوستان میں عربی تعلیم کی اہمیت مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی۔ اور مسلمانوں کے فکر و نظر پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ پھر ان سب سے بڑھ کر اس رسالہ نے علمی حیثیت سے بہت قابل قدر اور اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح سے متعلق بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے۔

سید سلیمان ندوی خود الندوہ کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس رسالہ نے سیکڑوں برس بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی۔ اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل، منطق، عقائد اور فقہ کے چند مسائل قرار پاتے تھے۔ جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔ پھر بھی جو آتا تھا۔ وہ ان ہی کو دوہرا دوہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا۔ حالانکہ زمانہ کا رخ اِدھر سے اُدھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے لئے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے۔ الندوہ کا یہ بڑا فیض ہے کہ اس نے علماء کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ گئے ہوں۔ لیکن انھوں نے اس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے۔"

"اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا۔ اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے۔ زبان و بیان کے انداز و پیرایۂ بیان معلوم ہوئے۔"[1]

الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔

۲۔ جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔

۳۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴۔ اسلام اور تاریخ اسلام پر بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا۔

۵۔ قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی۔ اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشیں کرائی۔"[2]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی : حیات شبلی ص ۴۴۱، ۴۴۲۔

ظاہر ہے ان تمام علمی نتائج میں علامہ شبلی کے ساتھ سید سلیمان ندوی برابر کے شریک و سہیم تھے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ الندوہ میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ان ہی کے مضامین شائع ہوئے۔ بلکہ بعض پرچے تو شروع سے آخر تک ان ہی کی تحریروں کے رہین منت ہیں۔

رسالہ الندوہ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دریا کی تہ سے بکثرت لعل و جواہر کو اچھال کر ملک و قوم اور علم و ادب کی بارگاہ میں نذر کئے۔ اس کے آغوش تربیت میں پل کر بہت سے ایسے نوجوان باصلاحیت اہل قلم جوان ہوئے جو آگے چل کر علم و ادب کی مسند پر متمکن ہوئے۔ اور جن کے علمی کارناموں سے آج بھی گنبد مینا پر شور ہے۔ مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبداللہ عمادی، عبدالسلام ندوی، ضیاء الحسن علوی، عبدالواجد ندوی، اور معین الدین بہاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی علمی و قلمی نشو و نما تمام تر الندوہ کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ سید صاحب نے ایک جگہ بہت درست لکھا ہے:۔

> "نام نہیں لوں گا مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس رسالہ کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری اور اپنے اپنے دائرہ میں نام وری حاصل کی۔ اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہونچا۔ خود دارالعلوم ندوہ کے طالب علموں کو اس (الندوہ) سے بہت فائدہ پہونچا اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستاں میں ہوئی۔"[1]

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے الندوہ دورِ جدید کے پہلے شمارہ (جنوری سنہ ۳۰ء) کے لئے ایک "حوصلہ افزا پیغام" بھیجا تھا۔ اس میں وہ رقمطراز ہیں:۔

> "تیس سال پہلے کا الندوہ علمی و تحقیقی مضامین کا خزانہ تھا.....
> اس میں کوئی مضمون سرسری یا سطحی شائع نہ ہوتا تھا۔ خبریں بھی

---

[1] سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۴۱۔

> وہی شائع ہوتی تھیں جو علمی شان لئے ہوتیں۔ تازہ واردان بساطِ علم اس سے سبق حاصل کرتے تھے۔ مثلاً ۱۳۲۲ء کے رسالوں میں ایک عزیز نام ہے "سید سلیمان بہاری متعلم دار العلوم" یہ طالب علم ترقی کرکے آج بزم شبلی کا صدر نشین ہے۔ اور مولوی سید سلیمان ندوی کے نام سے ہمارے ملک بلکہ سارے عالم اسلامی میں مشہور و معروف "۔[1]

رسالہ الندوہ کی قدیم فائلوں کی ورق گردانی مختلف حیثیتوں سے نہایت مفید اور معلومات افزا ہے۔ اس کا مستقل کالم "علمی خبریں" غالباً اردو صحافت میں پہلا اور نہایت بیش قیمت اضافہ تھا۔ جس کی نظیر اس وقت تک دنیائے صحافت میں نہیں ملتی۔ اس کے تحت اسلامی علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کی خبریں درج ہوتی تھیں یہ کالم پہلے عموماً مولانا شبلی خود لکھتے تھے۔ پھر نائب اڈیٹروں میں مولانا آزاد اور سید صاحب نے بھی اس کو اپنے استاذ کے ہم رنگ ہو کر لکھا۔

الندوہ کے شذرات بھی علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت سے خاصے کی چیز ہوتے تھے علامہ شبلی کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت تھی۔ اس لئے عموماً شذرات وہ خود ہی لکھتے تھے۔ خواہ سب اڈیٹر کوئی ہو۔ یا پھر بعض مرتبہ ہدایات دے کر اپنی نگرانی میں سب اڈیٹر سے بھی لکھواتے اور نظر ثانی و ترمیم کے بعد کاتب کے حوالے کرتے تھے۔ سید صاحب کے نام علامہ شبلی کے خطوط میں کئی جگہ اڈیٹوریل نوٹ کے بارے میں واضح ہدایات اور رہنمائی کا ذکر ملتا ہے۔

ان عنوانات کے علاوہ الندوہ کے مستقل مفید و کارآمد عنوانات میں "جدید تالیفات"، "واقعات و خبریں" اور مطبوعات جدیدہ بھی لائق ذکر ہیں۔

(۶)

سید سلیمان ندوی نے رسالہ الندوہ میں مضمون نگاری زمانہ طالب علمی ہی

---

[1] الندوہ لکھنؤ، جنوری ۴۰ء ص ۲۔

میں شروع کردی تھی۔ اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں سے ابتدا ہی سے ملک کے ممتاز اہل علم وارباب فکر کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۰۵ء میں جب ان کا ایک مقالہ "علم الحدیث" کے عنوان سے شائع ہوکر مولانا حالی کی نظر سے گزرا تو انھوں نے مضمون کی تعریف وتحسین کرتے ہوئے علامہ شبلی کو لکھا:۔

> "سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا "فبارک اللہ فیہا وفی طلبتہا وفی تعلیمہا" مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کافی تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ایسا ایک بھی نہیں کر سکی ہے۔"[1]

علامہ شبلی نے الندوہ جون ۱۹۰۶ء کے شذرات میں مولانا حالی کے مذکورہ خط کو نقل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اظہار مسرت کیا:۔

> "ہم کو اس بات کی خوشی ہے کہ جو مضمون ہمارے دارالعلوم کے ایک طالب علم کا پچھلے پرچہ میں شائع ہوا۔ وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جناب مولوی الطاف حسین حالی نے ایک خط حال میں ہم کو لکھا ہے۔"[2]

اس کے بعد پھر سید صاحب کے اشہب قلم کی جولانی سے الندوہ کی فائلیں گرانبار، باوقار اور بلند معیار ہوتی چلی گئیں۔ بلکہ بعض بعض پرچے تو مکمل ان ہی کی تحریروں سے مزین ہیں۔ (دور شبلی وسلیمانی) میں شائع شدہ سید صاحب کے کچھ اہم مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ علم الحدیث — مئی ۱۹۰۵ء
۲۔ امام بخاری — مارچ ۱۹۰۶ء
۳۔ فرمانروایان اسلام — مئی ۱۹۰۶ء
۴۔ قضا وقدر اور قرآن — جولائی ۱۹۰۶ء

---

[1] [2] الندوہ لکھنؤ۔ جون ۱۹۰۶ء ص ۴۔

۵- امام مالک	جولائی	سنہ ۱۹۰۶ء
۶- القرآن والفلسفۃ الجدیدہ	ستمبر	″
۷- قوت باصرہ اور نور	اکتوبر	″
۸- علم ہیئت اور مسلمان	مئی	سنہ ۱۹۰۷ء
۹- مولانا بحر العلوم مدارس میں	جون	″
۱۰- عربی زبان کی وسعت	اگست	″
۱۱- علم ہیئت اور مسلمان	ستمبر	″
۱۲- مسلمان اور بے تعصبی	″	″
۱۳- عرب کے یوروپین سیاح	″	″
۱۴- طبقات العرض اور مسلمان	اکتوبر	″
۱۵- برنابا کی انجیل	″	″
۱۶- مسئلہ ارتقاء اور قرآن	دسمبر	″
۱۷- علماء سلف اور استغنا	″	″
۱۸- مسلمان عورتوں کی بہادری	فروری	سنہ ۱۹۰۸ء
۱۹- مادہ کے اجزائے ترکیبی	″	″
۲۰- حضرت عائشہؓ	اپریل	″
۲۱- تمدن اسلام	اکتوبر	″
۲۲- ابن خلقان	نومبر	″
۲۳- ایمان بالغیب	دسمبر	″
۲۴- مکررات القرآن	جنوری	سنہ ۱۹۰۹ء
۲۵- خاتونان اسلام کی شجاعت	جنوری	سنہ ۱۹۰۹ء
۲۶- اسلام اور تمدن	فروری	″
۲۷- اسلامی رصد خانے	مارچ	″
۲۸- ″ ″	جون	″
۲۹- سود اور صحف انبیاء	جولائی	″
۳۰- صحابہ کی تعداد	ستمبر	″
۳۱- قیامت	اکتوبر	″
۳۲- جنگ احد	″	″
۳۳- تحریم شراب	نومبر	″
۳۴- مکاتیب شبلی	″	″
۳۵- مادیت اور خدا کا وجود	جنوری	سنہ ۱۹۱۰ء
۳۶- اشتراکیت اور اسلام	مئی	سنہ ۱۹۱۱ء
۳۷- مذہب اسلام اور علم وعقل	جولائی	سنہ ۱۹۱۱ء
۳۸- مستشرقین یورپ	اگست	″
۳۹- کتب خانہ اسکندریہ	دسمبر	″
۴۰- سائنس فنائے مادہ کا قائل ہوگیا	جنوری	سنہ ۱۹۱۲ء

متذکرہ صدر فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سید صاحب نے

الندوہ میں ہیئت، علم اللسان، طبقات الارض، مذہب، تاریخ، سیر، سوانح اور عمرانیات ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ مقالے آج بھی محققین کا مستند ماخذ خیال کئے جاتے اور شوق و دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو علیحدہ کتاب یا رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں مثلاً سیرت عائشہؓ، امام مالک، اور خواتین اسلام کی بہادری۔

ان تمام مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب شدید مذہبی پابندی کے ساتھ ایک وسیع النظر اور روشن خیال عالم بننا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے شراب کہنہ کو جام نو میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ پرانی مذہبی چیزوں کو اقتضائے عصر کے مطابق جدید رنگ میں پیش کرنا دراصل ان کے استاذ شبلی کا ورثہ و خصوصیت ہے۔ سید صاحب کا مخاطب انگریزی داں طبقہ بھی تھا۔ اس لئے ان کے، بالخصوص الندوہ کے آخری زمانے کے، مضامین میں زیادہ تر وہی رنگ ہے جو بیشتر انگریزی زبان کے اہل قلم اختیار کرتے ہیں۔ مضامین کی تمہید و اختتامیہ میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو جملوں کی ساخت اور ترکیبوں کی بندش بھی خالص انگریزی داں انشاپردازوں کے انداز کی ہوتی ہے۔ اس لئے سید صاحب کے مضامین قدیم و جدید ہر طبقہ میں مقبول ہوتے اور شوق کے ہاتھوں لئے گئے۔

(۷)

یہاں الندوہ کے سلسلۂ جدید کا بھی جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کہ تقریباً تیس سال کے وقفہ کے بعد سید صاحب ہی کی تحریک اور نگرانی میں رسالہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تھی۔ گو اس کی ادارتی ذمہ داریاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائیؒ کے سپرد تھیں مگر کافی عرصہ تک شذرات خود سید صاحب سپرد قلم کرتے رہے[1]۔ اس کے علاوہ بعض اہم موضوعات پر علمی و تحقیقی مقالات لکھ کر اس کی زینت اور وقار میں اضافہ کیا۔

اس دور میں بھی الندوہ کی ضخامت حسب سابق دو جزو (۳۲ صفحے) اور سالانہ قیمت دو روپے مع محصول قائم رہی۔ سرورق پر "مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت" رسالہ کا مقصد

---

[1] اس کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائیؒ نے شذرات لکھنے شروع کئے اور وہی آخر تک لکھتے رہے۔

قرار دیا گیا تھا۔ اس کے پبلشر حامد علی ندوی اور پرنٹر بانکے لال سکسینہ تھے۔ نامی پریس میں طبع ہو کر بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ علمی مقالات کے علاوہ اس میں دو صفحے ندوہ کے حالات و کوائف اور دو صفحے انجمن طلبہ قدیم کی سرگرمیوں کی تفصیلات کے لئے خاص ہوتے تھے کبھی کبھی نقد و نظر کے عنوان سے جدید مطبوعات پر تبصرہ بھی شائع ہوتا تھا۔

جنوری سنہ ۴۰ء میں اس دور کا پہلا شمارہ منصۂ ظہور پر آیا۔ اس کے شذرات میں سیّد صاحب نے لکھا ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ندوۃ العلماء کے کارکنوں کو دین اور علم کی خدمت اور مجلس کے مقاصد اور حالات کی اشاعت کی خاطر رسالہ "الندوہ" دوبارہ جاری کرنے کی توفیق نصیب ہوئی اور :۔

> "یہ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس جنس کی طلب بازار میں بہت کم ہے۔ اس لئے ہمارا مشکلوں میں پھنسنا کچھ توقع کے خلاف نہیں پھر بھی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس فرض کو ادا کرنے میں مشکلات کا مقابلہ کریں"۔ [1]

پھر اس رسالہ کے مقاصد اجراء پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

> "ہر زمانہ کی ضرورتیں دوسرے زمانے سے مختلف ہوتی ہیں اور مذاق علمی بھی بدلتا رہتا ہے۔ الندوہ کے پہلے دور میں جس قسم کے مضامین اس میں نکلتے رہے جدید دور میں وہ رنگ قائم نہ رہ سکے گا۔ اب حالات کا اقتضا اور ضرورتوں کا تقاضا کچھ اور ہی ہے۔ عربی تعلیم کی ضرورت، عربی مدارس کی اہمیت، علوم اسلامیہ کی اشاعت، مسلمانوں کی اخلاقی و اقتصادی اصلاح، مسرفانہ غیر شرعی رسوم و رواج کا ابطال اور اسلامی مسائل کی صحیح تشریح اس رسالہ کی آئندہ زندگی کا مقصد ہے"۔ [2]

اس شمارہ کے پہلے ہی صفحہ کو حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے "حوصلہ افزا پیام" سے

---

[1] [2] "الندوہ" لکھنؤ۔ جون سنہ ۴۰ء ص ۴۔

مزین کیا گیا ہے جس میں انھوں نے اپنے اور علامہ شبلی کے عہد ادارت کی یاد بڑے مؤثر انداز میں تازہ کرتے ہوئے الندوہ کے دوبارہ اجراء پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے:۔

> "خیر مقدم مرحبا! ملک میں جو بد مذاقی وبا کی طرح پھیل گئی ہے اس کے لئے یہ تریاق ثابت ہوگا اور جو چند متین علمی رسالے ملک میں علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں ان کی تعداد میں شاندار اضافہ کرے گا۔ رب کریم اس کو کامیاب اور ملک کا حقیقی فیض رساں بنائے۔" [1]

اس دور میں سید صاحب کے حسب ذیل مضامین الندوہ میں شائع ہوئے:۔

۱۔ ندوۃ العلماء کی تاریخ کا پہلا صفحہ	جنوری فروری سنہ ۴۰ء
۲۔ غیر مذہبی عربی تعلیم	مارچ سنہ ۴۰ء
۳۔ خطبہ اسناد	اپریل سنہ ۴۰ء
۴۔ سیرت کا مختصر پیام	مئی 〃
۵۔ میری محسن کتابیں	نومبر 〃
۶۔ شیراز ہند پورب	فروری، مارچ، اپریل، مئی سنہ ۴۱ء
۷۔ اعیان وارکان ندوہ	اپریل سنہ ۴۲ء
۸۔ عربی مدارس کا نیا نظام	مئی 〃

علاوہ ازیں کئی مہینے تک شذرات (اڈیٹوریل نوٹ) بھی سید صاحب ہی کے قلم سے ہوتے تھے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے شذرات میں لکھتے ہیں:۔

> "ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس نووارد مہمان کو جس کا نام الندوہ ہے۔ اپنی فطری فیاضی سے نوازیں گے۔ صرف تین سو قدردانوں کی نوازش سے اس کو مستقل وجود حاصل ہو سکتا ہے۔ گو ابھی ہمارے دو ہی پرچے نکلے ہیں۔ مگر خریداروں کی

---

[1] الندوہ لکھنؤ۔ جنوری سنہ ۴۰ء ص ۱۔

> تعداد ایسی ہے جو ہمارے حوصلہ کو بڑھاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ناظرین اپنے دوستوں کے حلقے میں اس نووارد کا تعارف کرائیں اور ان کو اس کا ہمدرد بنائیں۔" [1]

"الندوہ" کے اس دور میں "میری محسن کتابوں" کے عنوان سے ایک مستقل سلسلہ مضمون نہایت مفید و کارآمد نکلا تھا۔ جس میں عبید اللہ سندھی، حبیب الرحمٰن شروانی، عبدالماجد دریابادی، عبدالباری ندوی، مناظر احسن گیلانی، میاں بشیر احمد (اڈیٹر ہمایوں) سید طلحہ (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) مولانا اعزاز علی، شاہ حلیم عطا، پروفیسر نواب علی، سعید احمد اکبر آبادی اور خود علامہ سیّد سلیمان ندوی وغیرہ جیسے مشاہیر اہل علم اور اساطین فکر و فن نے ان اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی شخصیت کی تعمیر اور علمی ذوق کی تشکیل میں نمایاں حصہ رکھتی ہیں۔ عبدالماجد دریابادی نے اس سلسلہ مضامین کو پڑھ کر اڈیٹر کو لکھا تھا:۔

> "یہ سلسلہ بھی آپ خوب نکال رہے ہیں اور بڑے بڑے چھپے رستموں کو گوشے سے باہر لا رہے ہیں۔" [2]

اس عنوان کے تحت شائع ہونے والے تمام مضامین کو بعد میں مولانا عمران خاں ندوی نے "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے مرتب کر کے علیحدہ کتابی شکل میں ۴۶ء میں مکتبہ جمعیۃ التعاون ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کر دیا۔

---

[1] ماہنامہ الندوہ لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۴۰ء ص ۷۔

[2] " " اکتوبر ۴۱ء۔ مضمون "الندوہ کو پڑھ کر"۔ ص ۲۔

ہفتہ وار الہلال کلکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد کا شہرۂ آفاق ہفت روزہ "الہلال" مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔[1] وہ صحیح معنوں میں ہماری سیاسی، صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی عہد آفریں شہرت وعظمت کا سہرا ابوالکلام کی نابغہ شخصیت کے سر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ الہلال کو بدر کامل بنانے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بھی بڑا اور نمایاں حصہ رہا ہے۔ کیوں کہ سید صاحب کے الہلال کے ادارۂ تحریر میں شرکت کا زمانہ ہی اصلاً الہلال کا عہد زریں تھا۔

الہلال عصری صحافت میں محض ایک اور اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ اپنی ذات سے ایک مستقل تحریک تھا۔ جس نے طوفان حوادث میں اسلامیان عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس سے سیاسی وادبی کارناموں کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس پس منظر کا اجمالی تذکرہ ناگزیر ہے۔ جس میں الہلال کا اجرار عمل میں آیا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں نہ صرف ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ بلکہ روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالے لے رہی تھی۔ استعماریت اپنے بقاء وتحفظ کے لئے ناخن وچنگال کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ جمہوریت کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوئے جا رہے تھے۔ اور قومی آزادی وخودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی استعمار کا طنطنہ ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہوگیا تھا۔

---

[1] "الہلال اپنے طرز کا پہلا پرچہ تھا جو اپنی ترتیب اور مواد کے لحاظ سے اس وقت کے بلند پایہ انگریزی اخبارات سے لگا کھاتا تھا۔" (آصف علی: "سوانح" (مضمون) مشمولہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ ص ۳۰)۔

ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی[1]، لیکن انگریزی سیاست نے اس پودے کو بارآور نہ ہونے دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس نے نفاق کی تخم ریزی اچھی طرح کر دی تھی۔ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے اور برطانوی حکومت سے وفاداری پیدا کرنے کیلئے مسلم لیگ قائم کی جا چکی تھی۔ مسلمانوں کی نگاہیں ترکی، بلقان اور طرابلس پر لگی ہوئی تھیں۔ اور سر سید کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمانوں کے دل میں قائم کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی، لیکن یہ انحراف واختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا۔ فاعلی نہ تھا انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا۔ بلکہ مذہب اور مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان اور طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کانگریس اجتماعی تحریک آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمانوں کے چند نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب بیرون ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے جن کا تعلق پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔ [2]

الہلال کے معاصرین میں ظفر علی خاں کے "زمیندار" (لاہور) وحید الدین سلیم کے "مسلم گزٹ" اور محمد علی کے "ہمدرد" کے نام قابل ذکر ہیں۔ زمیندار کو اپنے عہد میں بے اندازہ مقبولیت حاصل تھی[3]۔ تاہم اس کی توجہ کا تمام تر مرکز ترکی تھا۔ اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندے کی فراہمی تھا۔ اندرون ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اُسے بہت کم دلچسپی تھی۔ مسلم گزٹ کا غالب رجحان بلاشبہ قوم پرستی اور ملکی آزادی کی جانب تھا۔ اور اس کے اڈیٹر وحید الدین سلیم کے بے باک وبے خوف اور جری قلم نے مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور قومی خودداری سے متعلق نہایت صفائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے[4]۔ نیاز فتح پوری کی یہ رائے محل نظر ہے کہ "مسلم گزٹ آزادی وطن کا محرک ومعاون ضرور تھا۔ لیکن

---

[1] نیاز فتح پوری: "مولانا آزاد کی صحافتی عظمت" (مضمون) مشمولہ آج کل دہلی ابوالکلام نمبر ص ۱۸۔

[2] خواجہ احمد فاروقی: "مولانا آزاد کی صحافتی عظمت" (مضمون) مشمولہ "انوار" ابوالکلام ص ۶۸۔

[3] عابد رضا بیدار: "آزاد ایک صحافی" (مضمون) آجکل دہلی ابوالکلام نمبر ص۔ ۱۸۔

[4] منظر عباس نقوی: وحید الدین سلیم، حیات اور کارنامے ص ۲۲۱ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۹ء)۔

انگریز سامراجیت کے خلاف اس کی پالیسی واضح اور دو ٹوک نہیں تھی[1]۔" حقیقت یہ ہے کہ گزٹ مذکور دوسرے ہم عہد مسلم اخبارات کے برخلاف انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی موقف کا زبردست حامی تھا۔ سودیشی تحریک کی حمایت ہو یا ملکی صنعت و حرفت کی سرپرستی کی پالیسی، ہندوستانیوں کا حکومت خود اختیاری کا مطالبہ ہو یا مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ سب میں وہ حریت پسندوں اور وطن پرور مسلمانوں کے دل کا ترجمان اور قافلۂ سالار تھا اس معاملہ میں صرف ابوالکلام کا الہلال ہی اس کا شریک کہا جا سکتا ہے۔ جو مسلم گزٹ کے اجراء کے چھ ماہ بعد نکلنا شروع ہوا۔ [2]

اس ماحول، ان حالات اور مسلم ذہنیت کے اس پس منظر میں الہلال افق صحافت پر بڑی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا اور اس کی ضیا باری نے کلکتہ کے مطلع سے شروع ہو کر شرق و غرب، شمال و جنوب سب کو مطلع انوار بنا دیا۔ یہ اخبار اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نئی آواز، نئی دعوت اور نیا پیغام تھا۔ الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو منصۂ شہود پر آیا یہ ہفت روزہ دو کالمی اور رائل سائز کے ۲۴ر صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ سرورق پر لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین درج تھا۔ سالانہ قیمت آٹھ روپے، ششماہی چار روپے بارہ آنے، اور فی پرچہ تین آنے تھی۔ مدیر مسئول اور محرر خصوصی کی حیثیت سے مولانا آزاد کا نام "احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی" لکھا ہوتا تھا۔

الہلال ہمیشہ نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ میں تصویروں سے مزین شائع ہوتا تھا۔ عصری صحافت میں اس کا یہ امتیاز اس کے قبول عام کا باعث ہوا۔ بنیادی طور سے یہ ایک سیاسی پرچہ تھا۔ لیکن اس کے متنوع اور ہمہ گیر انداز میں سیاسیات، تبلیغ دین، فلسفہ و حکمت، احوال شرق و غرب، علمی سائنسی معلومات اور شعر و ادب سب شامل تھے[3]۔ مولانا آزاد کے لئے اس کی ترتیب کوئی پہلا تجربہ نہ تھا، بلکہ اس سے پہلے وہ گلدستہ، شعر و سخن،

---

[1] نیاز فتح پوری: مولانا آزاد کی صحافتی عظمت (مضمون) آجکل دہلی ابوالکلام نمبر ص ۱۸۔

[2] منظر عباس: وحید الدین سلیم ص ۲۱۶۔

[3] خواجہ مقبول احمد: ابوالکلام کی صحافت (مضمون) مشمولہ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ آزاد نمبر ص ۲۰۵۔

المصباح، حسن الاخبار، خدنگ نظر، لسان الصدق، نیرنگ عالم، الندوہ اور وکیل میں برسوں کوچۂ صحافت کی دشت نوردی کر کے ایک کہنہ مشق صحافی بن چکے تھے اور الہلال میں ان تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ [1]

الہلال محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صورِ قیامت تھا۔ جس کی ”صدائے رعد آسائے غفلت شکن“ نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔ ”سرگشتگان خواب ذلّت و خواری“ کو بیدار کیا۔ وہ شعلہ قیامت جو سرد ہو رہا تھا اس کو بھڑکا دیا۔ ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ کلمۂ حق کو بلند کیا۔ اور جرأت حق گوئی و راست بازی کی وہ روشن مثال قائم کی ہے جو ہماری صحافت کی تاریخ میں بالکل نئی ہے۔ انھوں نے قرآن کی معرفت اور تفسیری ترجمہ سے اسلام کی سچی تعلیم کے احیاء کی کوشش کی جس میں سب سے زیادہ زور راست گفتاری اور آزادی کے لئے لڑنے پر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے شرربار مقالوں کی دھوم مچ گئی اور بڑے بڑے اربابِ جبہ و دستار اور کہنہ مشق سیاستدانوں کے مذہبی و سیاسی افکار میں زبردست تبدیلی واقع ہوگئی۔ قدیم اقدار کو بدلنے، ہندوستانی مسلمانوں کے معتقدات میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے میں الہلال نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بیگم ڈاکٹر سید عبداللہ الہلال کے کارناموں اور نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

> ”یہ اخبار مسلمانان ہند کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار تھا۔ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ملکی اور بین الاقوامی امور کی آزاد ترجمانی کا شرف اس کو حاصل تھا۔ چنانچہ ترکی کے جدید انقلابات، طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے واقعات اور پھر جنگ عظیم میں ترکی کی حکمت عملی کے متعلق ”الہلال“ میں طویل بحثیں موجود ہیں۔
>
> اسی طرح ملکی سیاست میں مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے، حقوق و مراعات کے قصے اور انگریزوں کی ”پھوٹ ڈالو اور حکومت

---

[1] عبداللہ بٹ: مولانا ابوالکلام آزاد ص ۲۰۴۔

> کرو" کی تشریحیں بھی الہلال کے اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تعلیمی معاملات میں ندوہ اور علی گڑھ کی سرگرمیاں اور ان میں سرکار پرستوں کی دسیسہ کاریاں بھی الہلال نے اچھی طرح کھول کر واضح کی ہیں۔"[1]

الہلال کی امتیازی خصوصیت مولانا آزاد کے طرز تحریر کی بداہت، نئی زبان اور علوم اسلامیہ پر ان کی گہری نظر تھی[2]۔ جواہر لعل نہرو نے بھی الہلال کی اس نئی زبان پر خاص زور دیا ہے[3]۔ جذباتی قسم کا اسلوب بیان جس میں تحریر میں قیامت کی شان نظر آتی ہے۔ جملوں اور لفظوں کے تو وہ بادشاہ تھے اور محض ترتیب کے الٹ پھیر سے اپنی تحریروں میں وہ گرمی پیدا کر دیتے تھے جس کی آنچ مدھم ہوتے ہوتے بھی پڑھنے والے کے شعور کو بے بس کر جاتی تھی[4]۔ یہ حقیقت ہے کہ ابوالکلام کے یہاں جو مرصع کاری، مترادفات کی کثرت، کرسی نشینی الفاظ، استخواں بندی تراکیب، ابداع سخن اور اختراع معانی ہے۔ اس کا اہتمام کبھی بھی اردو صحافت میں اس سے پہلے اور اس پیمانے پر نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ لفظی گل کاری محض نمود و نمائش کے لئے نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک مقصد اور ایک تحریک وابستہ تھی۔ حالی اور سرسید کے زمانے میں ہمارے ادب کی کشتی دریا کی پرسکون موجوں پر بہہ رہی تھی۔ الہلال اور البلاغ میں وہ دفعتاً سمندر کے تھپیڑوں سے دوچار ہو گئی۔ ہر چیز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانا شہر کھود کر پھینک دیا گیا ہے۔ اور نیا بسایا گیا ہے۔ جس کے باشندے بھی نئے ہیں۔ انداز فکر بھی نیا ہے۔ استدلال بھی اور ان کی بولی بھی کچھ نئی نئی ہے۔

بقول خواجہ احمد فاروقی "مولانا آزاد نے آئینہ خانہ میں رنگینیاں قید نہیں کی ہیں اپنے اسلوب سے قومی کام لیا ہے۔ اور آزادی کی تحریک کو مہمیز کیا ہے۔ ہم ان کے جملے اشعار کی

---

[1] بیگم سیّد عبداللہ: ابوالکلام کی نثر (مضمون) ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ ص ۹۲۔

[2] مالک رام: مولانا آزاد صحافی و ادیب (مضمون) مشمولہ سہ ماہی صبح دہلی آزاد نمبر ص ۵۹۔

[3] جواہر لعل نہرو: ڈسکوری آف انڈیا ص ۳۵۰۔

[4] عابد رضا بیدار: آزاد ایک صحافی، سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ ص ۱۳۸۔ آزاد نمبر۔

طرح بار بار پڑھتے ہیں۔ اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی انفرادیت اور شخصیت ہر جملہ میں جملہ نشیں ہے۔ وہ ایک خوشبو ہے۔ جو تحریر کے گلہائے رنگ رنگ میں بسی ہے۔ ندرت ادا کی اس شیشہ گری کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آرٹ ہی نہیں وہ صحافت بھی ناقص ہے، جس میں کوئی طرز اور اسلوب نہیں"۔ [1]

ان ہی تمام وجوہ کے باعث الہلال کی مانگ گھر گھر تھی۔ اور اس کے پروں پر ابوالکلام کی شہرت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی[2]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے باقاعدہ خریداروں کی تعداد گیارہ ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں ایک پرچہ آتا دس بیس آدمیوں کے حلقہ میں سبقاً سبقاً اس کو پڑھا جاتا تھا اور سامعین ایسے والہانہ شوق سے سنتے جیسے کوئی الہامی چیز سنی جاتی ہے[3]۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ "میرے ایک عزیز علیحدہ کمرے میں سب بچوں کو بٹھا کر اس کو دست افشاں اور پاکوباں پڑھتے تھے۔ اور پڑھنے کے بعد پرچہ بکس میں بند کر دیتے تھے[4]"۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری صحافت کی پوری تاریخ میں کسی اخبار کی اس حیرت انگیز مقبولیت کی مثال خال خال ہی مل سکتی ہے۔

حکومت وقت الہلال کی آتش نوائی اور برق آسائی کا زیادہ عرصہ تک تحمل نہیں کر سکی اور صرف تین سال جاری رہ کر اس کا رشتہ حیات منقطع ہو گیا۔ اس مختصر سی مدت میں وہ اردو ادب کا ایک تاج محل بنا کر چھوڑ گیا۔ جس کے اندر شالا مار کی شادابی بھی ہے اور شیش محل کی نفاست بھی۔ اور جہاں سے کبھی کبھی نغمۂ ناہید بھی سنائی دیتا ہے۔

(۲)

الہلال کی ادبی و سیاسی اہمیت اس کے گوناگوں کارناموں اور دوررس

---

[1] خواجہ احمد فاروقی: مولانا آزاد کی صحافتی عظمت (مضمون) انوار ابوالکلام مرتبہ علی جواد زیدی ص ۸۲۔

[2] نصر اللہ خاں عزیز: ایک نفسیاتی مطالعہ (مضمون) ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ ص ۱۷۸۔

[3] سید صباح الدین: الہلال کا مطالعہ (مضمون) معارف جون ۱۹۵۸ء۔

[4] خواجہ احمد فاروقی: مولانا آزاد کی صحافتی عظمت، انوار ابوالکلام ص ۸۰۔

نتائج کا جو تجزیہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا کریڈٹ عام طور پر مولانا آزاد کو دیا جاتا ہے اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن الہلال کے چمن کو سدا بہار بلکہ فردوس نظیر بنانے میں اس کے اڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ملک کے دوسرے نامور اہل قلم نے بھی اپنا خونِ جگر شامل کیا ہے۔

الہلال کے دورِ اوّل میں اس کا ادارۂ تحریر کچھ تو مولانا آزاد کی دلکش شخصیت اور زیادہ تر اخبار کی تحریکی و دعوتی اہمیت اور غلغلہ کے باعث ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم اور بہترین اشخاص کا مجموعہ ہو گیا تھا۔ جس کا اندازہ ناموں کی اس فہرست سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، خواجہ عبدالواجد ندوی، عبداللہ عمادی اور حامد علی صدیقی[1]۔ الہلال کا تنوع ابوالکلام آزاد کے ساتھ ساتھ ان ممتاز قلم کاروں کا رہین منت ہے۔ بقول عبدالماجد دریابادی "روزنامہ کے لئے نہیں ایک ہفتہ وار کے لئے اتنا بڑا اور ایسا کھرا اسٹاف اردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کیوں نصیب ہوا ہوگا"[2] مالک رام نے بہت درست لکھا ہے:۔

> "الہلال کے تمام کارناموں سے قطع نظر اس کی اہمیت اور معیار کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس کا حیرت انگیز ادارۂ تحریر ہی کافی ہے۔ جو ملک کے صف اول کے ادیبوں اور انشاپردازوں پر مشتمل تھا۔ ہفتہ وار تو درکنار کسی اردو ماہنامے کو بھی آج تک ایسا شاندار اڈیٹوریل اسٹاف نہ ملا ہوگا۔"[3]

الہلال کی اس ادارتی کہکشاں میں علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت خصوصیت کے ساتھ کوکبِ تاباں کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید صاحب سے مولانا آزاد کے روابط الندوہ کی سب اڈیٹری کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکے تھے۔ علامہ شبلی کے واسطے سے دونوں خواجہ تاش اور پرانے رفیق تھے اور باہم اخلاص و مودت کے ساتھ دونوں

---

[1] عبدالماجد دریابادی: الہلال کا ادارۂ تحریر۔ مکتوب بنام عابد رضا بیدار مطبوعہ اردو ادب آزاد نمبر ص ۱۶۶۔

[2] " " : مولانا آزاد، چند یادیں (مضمون) سہ ماہی صبح دہلی ابوالکلام نمبر ص ۴۸۔

[3] مالک رام: آزاد صحافی و ادیب (مضمون) مشمولہ سہ ماہی صبح دہلی آزاد نمبر ص ۵۸۔

ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے کھلے دل سے معترف تھے جس پر سید صاحب کے نام مولانا آزاد کے خطوط شاہد عدل ہیں ۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب الہلال طلوع ہوا تو کچھ عرصہ تک مولانا آزاد نے اس کو تنہا سنبھالا، مگر پھر اپنی گوناگوں سیاسی مصروفیتوں کے باعث معاونین کے متلاشی ہوئے ۔ اور سید صاحب کو جن کی صلاحیتوں سے وہ کما حقہ واقف اور معترف تھے ۔ اس اخبار کے عملۂ ادارت میں شرکت کے لئے اصرار کیا ۔ ادھر سید صاحب علامہ شبلی کے ندوہ سے مستعفی ہوجانے کے باعث وہاں سے دل برداشتہ ہوچکے تھے ۔ چنانچہ الہلال کے مشن و دعوت کو اپنے خاص ذوق و رجحان کے مطابق پاکر وہ مئی سنہ ۱۹۱۳ء میں اس کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوگئے[1] ۔ سید صاحب نے اس سلسلہ میں خود ہی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں الہلال ایک سیاسی بین الاسلامی تحریک سمجھی جاتی تھی ۔ اور مجھے حضرت الاستاذ کی صحبت و تربیت میں اس سے دلچسپی تھی ۔ اس لئے مولانا ابوالکلام کے کہنے سے مولانا شبلی کے پاس سے مولانا ابوالکلام کے پاس الہلال میں چلا آیا[2]۔" شاہ معین الدین ندوی نے سید صاحب کے الہلال سے تعلق کا سنہ ۱۹۱۴ء بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے ۔ [3]

بہرحال سید صاحب الہلال کے ادارۂ تحریر سے چار پانچ ماہ وابستہ رہے[4] ۔ اس مختصر مدت میں انھوں نے بہت سے گرانقدر علمی و مذہبی مقالات لکھے ۔ خاص طور پر اسلامی و دینی موضوعات پر ان کے اور عبدالسلام ندوی کے مضامین نے الہلال کے مشن و دعوت کی تکمیل میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں :۔

> " سید صاحب جب الہلال میں پہونچے تو نام کا تو یہ اب بھی ہلال ہی رہا ۔ لیکن اہل بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر کامل بن گیا ہے ...... خود عربی کے قدیم و جدید ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے

---

[1] ملک زادہ منظور احمد : ابوالکلام فکر و فن ص ۱۴۷ ۔

[2] "الہلال کا ادارۂ تحریر" ۔ مکتوب سید صاحب بنام شاہ فضل امام مطبوعہ "ہماری زبان" علی گڑھ یکم ستمبر سنہ ۶۵ء ۔

[3] شاہ معین الدین : حیات سلیمان ص ۵۷ ۔

[4] مکتوب سید صاحب بنام ظہیر احمد صدیقی مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ یکم ستمبر سنہ ۶۵ء ۔

> دینی، تمدنی اور سیاسی وتاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا۔ یہ کام تو سید صاحب کا تھا ہی۔ باقی خود ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں سید صاحب اپنے چیف اڈیٹر سے پیچھے نہ رہے۔" [۱]

لیکن اسی چند ماہ میں مولانا آزاد کے عادات وخصائل کی بعض بوالعجبیوں کے باعث ان کا دل الہلال سے اچاٹ ہو گیا۔ اور وہ وہاں سے علیحدہ ہو کر پونا کالج میں فارسی کے استاذ ہو کر چلے گئے۔ مولانا آزاد کو سید صاحب کی علیحدگی کا بے حد ملال ہوا اور انھوں نے سید صاحب سے دوبارہ شرکت ومصالحت کے لئے ملتجیانہ اصرار کیا مگر وہ تیار نہیں ہوئے۔

الہلال میں ادارہ کی طرف سے جو مضامین شائع ہوتے تھے عموماً لکھنے والوں کے ناموں سے معرے ہوتے تھے۔ اس لئے یہ پتہ لگانا بہت دشوار امر ہے کہ سید صاحب نے الہلال میں کتنے اور کون کون سے مضامین لکھے۔ جن مضامین پر "السید سلیمان الزیدی" یا "سیّد سلیمان دسنوی" لکھا ملتا ہے۔ وہ یا تو مولانا ابوالکلام کی غیر موجودگی میں چھپے ہیں یا پھر سید صاحب کی الہلال سے علیحدگی کے بعد شائع ہوئے۔ مؤخر الذکر کے ساتھ اسی لئے "پروفیسر عربی کالج پونا" بھی لکھا ہوا ہے۔ مدیر الہلال سے سید صاحب کی جملہ شکایات میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ مضامین کو نام سے معرے کر کے اور اپنے "خامۂ اصلاح کی ضربات شدیدہ" کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ [۲] چنانچہ جب مولانا آزاد کلکتہ سے باہر ہوتے تو سیّد صاحب اپنے مضمون کو نام کی صراحت کے ساتھ شائع کرتے تھے۔

الہلال میں ناموں سے معرے مضامین کی اشاعت بعد میں بڑے فتنہ کا باعث ہوئی۔ کیوں کہ ادارہ میں شامل ہر اہل قلم اپنی تحریروں میں مخصوص ابوالکلامی رنگ سے ہم آہنگ ہو کر لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور وہ سب ابوالکلام کے سحر کار قلم کی تراوش سمجھ کر پڑھے جاتے تھے۔ غالباً اس وقت یہ پالیسی صحافیانہ مصلحت کے پیش نظر اختیار کی گئی ہوگی۔ لیکن اس کے باعث سب سے بڑا علمی نقصان یہ ہوا کہ عملۂ ادارت کے تمام ارکان کی تحریری کاوشوں پر پردہ

---

[۱] عبدالماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۲؍ جنوری سنہ ۵۴ء ص ۴۔

[۲] مکتوبات سلیمانی مرتبہ عبدالماجد دریابادی ج ۱، ص ۱۴۔

پڑگیا۔ علامہ شبلی نے عبدالسلام ندوی کو اسی لئے یہ دوررس مشورہ دیا تھا کہ تم الہلال میں جاؤ مضائقہ نہیں لیکن شرط یہ کرلو کہ تم الہلال میں جذب نہ ہو جاؤ یعنی جو لکھو اپنے نام سے لکھو ورنہ تمہاری زندگی پر بالکل پردہ پڑ جائے گا۔ اور آئندہ ترقیوں کے لئے مضر ہوگا۔"[1] ان ہی کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں :۔

> "تمہارے مضامین الہلال میں دیکھتا ہوں۔ مولوی ابوالکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو۔ ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں۔ اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہو جائے۔"[2]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد جب مضامین الہلال کے مجموعے مرتب کیے جانے لگے تو بلا تحقیق اس رنگ کے تمام مضامین ابوالکلام کی طرف منسوب کر دیئے گئے حالانکہ ان مضامین میں کشف ساق اسوۂ نوحی، اور اسوۂ ابراہیمی عبداللہ عمادی، الحرب فی الاسلام مولانا عبدالسلام ندوی اور "انسانیت موت کے دروازے پر" عبدالرزاق ملیح آبادی کے کاوش فکر و قلم کا ثمرہ ہیں۔ مگر ناشرین نے سب کو ابوالکلام کے نام سے شائع کر دیا ہے[3]۔ خود عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی صراحت سے لکھا ہے کہ :۔

> "الہلال میں میرا نام نہیں چھپتا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "عالم انسانیت موت کے دروازے پر" کے جتنے مضامین نکلے انھیں لوگوں نے مولانا کی تصنیف قرار دے کر کتابی صورت میں شائع کر دیا۔"[4]

اسی طرح بہت سے نقوش سلیمانی مثلاً مشہد اکبر، تذکار نزول قرآن، احرار اسلام اور قصص بنی اسرائیل اور الحریۃ فی الاسلام بھی مولانا آزاد کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے، ظفر حسین خاں نے بہت صحیح لکھا ہے کہ "مولانا آزاد کا اسلوب بلاشبہ ناقابل نقل ہے۔ لیکن

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم، مکتوب نمبر ۵، بنام عبدالسلام ص ۱۷۶۔

[2] " " مکتوب نمبر ۸ " ص ۱۷۹۔

[3] مکتوب سید سلیمان ندوی بنام شاہ فضل امام واقف مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۴۔

[4] عبدالرزاق ملیح آبادی : ذکر آزاد ص ۲۳۴ (بار اوّل اجالا پریس کلکتہ ۱۹۶۰ء)۔

الہلال کی بعض تحریریں جید سے جید ناقد فن کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر سید صاحب کی ہے اور کون سی مولانا آزاد کی۔ تو بتانا مشکل ہو گا۔ مولانا ابوالکلام کے مضامین اور مقالات جمع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہیئے جو سید صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔" [1]

راقم سطور کے نزدیک الہلال کے تمام مختلف فیہ مضامین کے ابوالکلام کی طرف منسوب ہو جانے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ الہلال کے عملۂ ادارت میں شامل سارے اہل قلم ابوالکلامی اسلوب کے تتبع کی کوشش کرتے تھے۔ گو ان میں "مولوی مدن" والی بات پیدا نہ ہو پاتی۔ تاہم یہ فرق اتنا باریک ہوتا تھا کہ کوئی دقیقہ رس نکتہ سنج اور وسیع النظر نقاد ہی اس کو محسوس کر سکتا تھا۔ غالباً الہلال کی مقبولیت و شہرت کی بقا کے لئے اس رنگ میں لکھنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اگر یہ مضمون نگار اپنے فطری اسلوب میں لکھتے تو پھر یہ اختلافی مسئلہ نہ کھڑا ہوتا۔

بہرحال ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم الہلال میں شائع شدہ سیّد سلیمان ندوی کے تمام مضامین کی نشاندہی کر سکیں۔ لیکن خود سید صاحب کے بیانات اور بعض دوسرے قرائن سے الہلال کے نقوش سلیمانی کی حسب ذیل فہرست مرتب ہوتی ہے:-

۱۔	الحربیۃ فی الاسلام	قسط اول	۲ر جولائی ۱۹۱۳ء
۲۔	" "	" دوم	۹ر " "
۳۔	" "	" سوم	۱۶ر " "
۴۔	" "	" چہارم	۲۴ر " "
۵۔	" "	" پنجم	یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء
۶۔	" "	" ششم	۸ر " "
۷۔	تذکار نزول قرآن		۶ر اگست "

---

[1] ظفر حسین خان: ابوالکلام بحیثیت انشا پرداز (مضمون) مشمولہ آج کل دہلی آزاد نمبر ص ۴۵۔

۸۔	مشہد اکبر اول[1]		۱۳؍اگست ۱۹۱۳؁ء
۹۔	تاریخ اسلام کا ایک غیر معروف صفحہ	قسط اول	۱۰؍ستمبر 〃
۱۰۔	〃 〃 〃 〃 〃	〃 دوم	۱۷؍ 〃 〃
۱۱۔	〃 〃 〃 〃 〃	〃 سوم	۲۴؍ 〃 〃
۱۲۔	〃 〃 〃 〃 〃	〃 چہارم	یکم اکتوبر 〃
۱۳۔	قصص بنی اسرائیل	قسط اول	۲۴؍ستمبر ۱۳؁ء
۱۴۔	〃 〃 〃	〃 دوم	۱۵؍اکتوبر 〃
۱۵۔	〃 〃 〃	〃 سوم	۱۲، ۱۹؍نومبر 〃
۱۶۔	عربی زبان اور علمی اصطلاحات	〃 اول	۲۷؍اگست 〃
۱۷۔	〃 〃 〃 〃 〃	〃 دوم	۳؍ستمبر 〃
۱۸۔	افکار و حوادث[2]		۱۷؍ستمبر 〃
۱۹۔	〃 〃		۸؍اکتوبر 〃
۲۰۔	〃 〃		۱۵؍ 〃 〃
۲۱۔	〃 〃		۲۲؍ 〃 〃
۲۲۔	〃 〃		۲۹؍ 〃 〃
۲۳۔	〃 〃		۵؍نومبر 〃
۲۴۔	علوم القرآن	قسط اول	۱۱؍فروری ۱۴؁ء

---

[1] ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مشہد اکبر کی دوسری قسط (شائع شدہ ۳؍دسمبر ۱۳؁ء) کو بھی سید صاحب کے الہلالی مضامین میں شمار کرایا ہے (ابوالکلام فکر و فن ص ۱۵۸) جو صحیح نہیں ہے۔ دراصل کانپور کے حادثہ فاجعہ پر الہلال میں اس عنوان سے ایک مستقل کالم کا آغاز کیا گیا تھا جس کے تحت مختلف اہل قلم کے مضامین اور مراسلات شائع کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ کا صرف پہلا مقالہ افتتاحیہ سید صاحب کا رشحۂ قلم تھا۔ دوسرے نمبر کے بارے میں اتفاق رائے ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے۔

[2] سید سلیمان ندوی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ الہلال میں رہے۔ افکار و حوادث کا مستقل کالم وہی لکھتے رہے (مکتوبات سلیمانی جلد اوّل مرتبہ عبدالماجد دریابادی ص ۱۸)۔

۲۵- علوم القرآن	قسط دوم		۲۵؍ مارچ ۱۴ء
۲۶- " "	" سوم		۸؍ جولائی "
۲۷- اساطیر الاولین			۱۵؍۲۲؍ اپریل "
۲۸- آثار اسلامیہ	قسط اول	البلاغ	۱۲؍ نومبر ۱۵ء
۲۹- " "	" دوم	"	۲۶ " "
۳۰- اسلام اور سوشلزم		"	۱۱؍ فروری ۱۶ء
۳۱- اصلاح معاشرت اور اسلام	قسط اول	"	۱۸؍ " "
۳۲- " " "	" دوم	"	۲۵؍ " "
۳۳- مدارس اسلامیہ (جامعہ ازہر)	" اول	"	۳؍۱۰؍ مارچ "
۳۴- " " "	" دوم	"	۱۷؍۲۴؍۳۱؍ مارچ "

(۳)

الہلال اور سید سلیمان ندوی کا ذکر آتے ہی ذہنی افق پر "مشہد اکبر" کا وہ قضیہ خود بخود ابھرنے لگتا ہے۔ جس نے کچھ عرصہ قبل دنیائے اردو کو بحث وجدال کی مبارزگاہ بنا کر رکھ دیا تھا اور ابوالکلام و سید صاحب دونوں کے عقیدت کیشوں کے سلسلۂ مضامین سے اخبارات و رسائل کے سیکڑوں صفحے سیاہ ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ کتنا ہی ناخوشگوار سہی لیکن متعدد دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ سے الہلال ۱۳؍ اگست ۱۹۱۳ء کے اداریہ "مشہد اکبر عا" کی ملکیت کا فیصلہ سید صاحب کے حق میں ہو چکا ہے۔[1] اس لئے سید صاحب کا کوئی محقق ان کی ادبی زندگی کے اس رخ سے صرف نظر کر کے حق تحقیق ادا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس مضمون سے سید صاحب کے طرز نگارش کے ارتقا اور مختلف اسالیب تحریر سے ہم آہنگ ہو کر کامیاب گزر جانے کے غیر معمولی کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس نزاعی مضمون کے سبب تحریر کی تفصیل یہ ہے کہ کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں

---

[1] رفعت حسینی: "آزاد کے لمحات غم" سہ ماہی صبح دہلی ابوالکلام نمبر ص ۱۸۰۔

لب سڑک ایک مسجد اور اس کے قریب ہی ایک مندر تھا۔ کانپور کی میونسپلٹی اس کے پاس سے ایک نئی سڑک نکالنا چاہتی تھی اور مندر کے بچانے میں مسجد کا وضوخانہ اس سڑک کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ مقامی حکام نے اس کو مسلمانوں کی مرضی کے خلاف بجبر منہدم کرا دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانان ہند میں غم وغصہ کی عام لہر دوڑ گئی۔ گاؤں گاؤں کے مسلم گھرانوں میں بے چینی و اضطراب پھیل گیا۔ ۱۳ر اگست ؁۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، کانپور کے مسلمانوں نے مولانا آزاد سبحانی کی سرکردگی میں اس کے خلاف ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ نے جوش وخروش میں مزید اضافہ کر دیا۔ اور مسلمانوں کا ایک گروہ جن میں بچے بھی تھے مسجد پہنچا۔ اور وضوخانہ کی گری ہوئی اینٹیں اٹھا کر منہدم دیوار پر چننے لگا۔ یہ دیکھ کر مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کانپور نے مسجد پر متعین فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ فوجی پولیس کے سپاہیوں نے ان پر نہایت بے رحمی سے فائرنگ کر دی اور قریب سے برچھے مارے۔ اس میں بہت سے مسلمانوں نے جن کی صحیح تعداد کا علم کسی کو نہیں ہو سکا، جام شہادت نوش کیا شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے[1]

اس خونیں واقعہ نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی۔ آتش فشاں مقرروں، شعلہ فشاں اہل قلم، اور شعلہ نفس شاعروں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور نظموں سے پورے ہندوستان میں آگ لگا دی[2] علامہ شبلی کی معرکۃ الآراء پر درد نظم "معرکۂ کانپور" اسی موقع کی تخلیق ہے۔ جس کا ہر شعر غم ودرد اور بے چینی و اضطراب قلب کی تصویر کشی کرتا ہے ہر مسلم اخبار نے اس المیہ کی مذمت میں اداریئے لکھے۔ چنانچہ الہلال نے بھی اس واقعہ محزنہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیا۔ ؁۱۹۱۳ء کی اخبار کی دوسری جلد کا اہم ترین مسئلہ یہی ہے۔ سید سلیمان ندوی اس واقعہ سے کچھ عرصہ پیشتر الہلال کے عملۂ ادارت میں شامل ہو چکے تھے۔ اپنے استاذ کی طرح ان کا دل بھی اس دردناک المیہ سے تڑپ اٹھا۔ اور فرط تاثر میں

---

[1] عابد رضا بیدار: ابوالکلام آزاد ص ۱۲۲۔ [2] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۵۷ مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۱۳۔ ابو علی: "الہلال کا ۱۳ر اگست کا اداریہ" ماہنامہ فاران ص ۵۳ ستمبر ؁۶۰ء۔

"مشہد اکبر"، کی سرخی سے الہلال کے اوراق کو رنگین کر دیا۔[1] اس آتش بار مقالے نے علمی و سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ بقول سید صباح الدین "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اس مقالہ کو سیاہی سے لکھنے کے بجائے خونِ جگر سے تحریر کیا ہے۔ الفاظ کے بجائے کاغذ کے صفحہ پر اپنے لخت ہائے جگر بکھیر کر رکھدیئے۔ اس کی ہر ہر سطر میں اندوہ و غم، جوش و ولولہ اور کرب و بے چینی کا ایک طوفان بپا نظر آتا ہے[2] حکومت کو اس کی اشاعت سے نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اس اشاعت کو ضبط کر لیا۔ اور الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی۔

سید صاحب کے اس مضمون کا طرز بیان اس قدر مختلف تھا کہ خود علامہ شبلی بھی جن سے زیادہ سید صاحب کے "انداز قد"، کا عارف کون ہو سکتا تھا، اندازہ نہ کر سکے کہ یہ مضمون کس کا ہے[3] اب ذیل میں اس آتش بار مضمون کے کچھ اہم اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ جسد سلیمانی میں روح ابوالکلامی کس شدت کے ساتھ حلول کر گئی ہے

مضمون کا آغاز فارسی کے چند اشعار اور آیات قرآنی سے کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

> "زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہیئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا! طرابلس کی سرزمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے۔ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی۔ سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی سرزمین بھی پیاسی ہے خون چاہتی ہے، کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی وہ بھی تیرا

---

[1] عبدالقوی دسنوی: سات تحریریں ص ۹۳ نظامی پریس لکھنؤ ۶۵ء۔

[2] سید صباح الدین: "سید صاحب کی علمی و ادبی خدمات" (مضمون) معارف اعظم گڈھ ستمبر ۷۷ء ص ۲۰۰۔

[3] مکاتیب شبلی جلد دوم مکتوب نمبر ۵۶ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۶ء۔

خون مانگتی ہے۔ لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے۔ وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔ ؏

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

"ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ تو تند و تیز ہوا کو روک لیتا ہے تو پُر غیظ و غضب بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک سکتا۔ کیا تو ہمارے خوف و غم کے بادل کو پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔"

پھر لکھتے ہیں:

"۳؍ اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت غریب و ناتواں اور غیر مسلح نوجوانوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان نوجوان انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل و انصاف کو زخمی کر رہی ہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے۔ وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو، جس کی محبت کا اظہار کر رہے ہو۔"

مشہد اکبر کی مرقع کشی اس طرح کرتے ہیں:

"وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانوی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم نم بادل پر غم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا۔ کئی معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیرِ کعبہ اسماعیل و ابراہیم کی زبان پر جاری تھی۔

> رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔
>
> پروردگار (اپنے گھر کیلئے ہماری ان چند اینٹوں کو) قبول کر۔ تو سننے اور جاننے والا ہے۔
>
> یہ پر اثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائیلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے۔ اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہوتا ہے، میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ چلیں۔"

اور آخر میں مقتولین، مجروحین، اور معصومین کانپور کو اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ غم کا طوفان امنڈنے لگتا ہے:

> "مقتولین کان پور! تم پر نمازیں نہیں پڑھی گئیں کہ تم مغفور تھے۔ ہم گنہ گار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے۔ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہیں ملا، گولیوں اور بندوقوں کی قطع برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ غزوۂ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں۔ ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں پھینک دیں اور زمین میں دفن نہیں کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھالیا کہ رضوان الٰہی ان کا منتظر تھا۔"
>
> "مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں۔ نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں۔ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی

> طرح لٹا تھا۔ جس کے بعد بنی امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا“
>
> ”معصوم بچو اور ریاض کے نو دمیدہ غنچو! تمھیں کس نے مرجھا دیا۔ سر جیمس مسٹن کے طعن نے تمھارے بے گناہ و نا آشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا۔ تم بڑھے کہ دھن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو۔ اے طائران قدس اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمھاری منتظر ہیں [۱]“

جیسا کہ اقتباسات بالا سے ظاہر ہے یہ مضمون الہلال کے روایتی رنگ میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ جو لوگ حقیقت سے واقف نہیں وہ آنکھ بند کر کے اس کو مولانا ابوالکلام ہی کے اشہب قلم کی جولانی خیال کرتے ہیں ۔ عبدالماجد دریابادی نے درست لکھا ہے کہ ”اس مضمون کو آج بھی اٹھا کر دیکھئے۔ کہیں سے پتہ بھی نہ چلنے پائے گا کہ یہ مضمون ابوالکلام کا نہیں ان کے ادبی ہم زاد کے قلم کا ہے [۲]“ اسی غلط فہمی کے باعث الہلال میں نام سے معری شائع شدہ سید صاحب کے بعض مضامین کے ساتھ مذکورہ بالا مقالہ بھی مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب کر دیا گیا۔ راقم کی تحقیق کے مطابق سید صاحب نے مشہد اکبر پر اپنے دعوے کا اظہار سب سے پہلے مکاتیب شبلی جلد دوم کے ایک مکتوب کے سلسلہ میں کیا ہے [۳] علامہ شبلی نے الہلال کی شرکت ادارت کے زمانے میں سید صاحب کو ایک خط لکھا۔ جس میں یہ بھی تحریر تھا کہ:

> ”الٰہ آباد گورنمنٹ نے الہلال کا پرچہ مشہد اکبر قابل ضبطی قرار دیا ہے“۔

اس پر سید صاحب نے حاشیہ میں یہ توضیحی نوٹ سپرد قلم کیا ہے:

> ”مشہد اکبر کی سرخی سے مکتوب الیہ ہی کا لکھا ہوا مضمون الہلال کے لیڈنگ آرٹیکل میں واقعہ کان پور کی نسبت شائع ہوا تھا۔ تمام ملک نے اس مضمون کو پسند کیا اور اب تک اس کا نام بچہ بچہ کی

---

[۱] الہلال ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء۔

[۲] عبدالماجد دریابادی ”سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے“ (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۲ر جولائی ۱۹۵۴ء ص ۴۔

[۳] یعنی مضمون لکھنے کے چار برس اور الہلال دور اول کے بند ہونے کے ایک سال بعد۔

> زبان پر ہے مضمون اس قدر پرجوش تھا کہ گورنمنٹ نے اس کو قابل
> ضبطی قرار دیا اور اس جرم میں الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی مولینا
> شبلی کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس کا لکھا ہوا تھا۔"[۵۱]

مکاتیب شبلی کی یہ جلد ۱۹۱۶ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آئی تھی اور دار المصنفین کی تمام نئی مطبوعات کی طرح حسب معمول یہ کتاب بھی مولانا آزاد کے مطالعہ سے ضرور گزری ہو گی۔ اس وقت سے ۱۹۴۵ء تک نہ تو خود مولانا ابو الکلام نے اور نہ کسی اور ہی اہل نظر نے سید صاحب کے مذکورہ بالا دعوے کی تغلیط و تردید کی کوشش کی۔ اس بنا پر ہمیشہ یہ حقیقت ثابتہ خیال کی جاتی رہی ہے کہ مشہد اکبر کا مذکورۃ الصدر اداریہ سید سلیمان ندوی کے قلم کا رہین منت ہے۔

اس کے ۲۴ برس کے بعد رسالہ معارف کے متعدد نمبروں میں "اسلامی نظریہ سیاست" پر مولانا حیدر زماں صدیقی کا ایک عالمانہ مقالہ شائع ہوا، جس کی افادیت کے پیش نظر بعد میں مضمون نگار نے اس کو علیحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس پر سید صاحب سے مقدمہ لکھوایا۔ اس مقدمہ میں سید صاحب نے تحدیث نعمت کے طور پر لکھا کہ "اب تو الحمد للہ اس موضوع پر لکھنے والے بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن آج سے ۲۵۔ ۳۰ برس پہلے اللہ تعالے نے مجھ کو اس پر لکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور الندوہ ۱۹۰۸ء میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اس وقت بہت پسند کیا گیا۔ پھر اس کو الہلال کی شرکت ادارت کے زمانے میں از سر نو لکھا اور وہ الحریۃ فی الاسلام کے عنوان سے الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا۔" چونکہ حسب معمول یہ سلسلہ مضمون بھی الہلال میں مضمون نگار کے نام سے معری شائع ہوا تھا۔ اس لئے محض اظہار واقعہ کے لئے اس پر سید صاحب نے یہ حاشیہ لکھا:

> "الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے
> اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعے شائع کرنے والوں نے
> بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابو الکلام کی طرف منسوب کر دیا حالانکہ

---

[۵۱] مکاتیب شبلی جلد دوم بار اول ص ۱۱۳ مکتوب نمبر ۵۲۔

> یہ صحیح نہیں ہے۔ الحریۃ فی الاسلام[1] تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر نمبر اول وغیرہ میرے مضامین ہیں[2]۔“

مذکورہ کتاب کا یہ مقدمہ بعد میں سید ریاست علی ندوی نے اپنی سب اڈیٹری کے زمانے میں ”سیاسیات اسلام کے نظریے“ کے عنوان سے حاشیہ مذکور کے ساتھ معارف میں شائع کر دیا اور پھر وہاں سے اس کو کراچی کے رسالہ مستقبل (اکتوبر ۴۹ء) نے اپنے صفحات میں نقل کیا۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ نقل در نقل سے یہ راز سربستہ واشگاف ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام کے کسی ارادت مند نے ان سے اس سلسلہ میں رجوع کیا تو مولانا نے جو جواب دیا وہ ان کی طبعی فراخ دلی، بلندیٔ مرتبت اور معروف انانیت پسندی کے شایان شان نہیں معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا:

> ”میرے بھائی! اگر سید سلیمان کسی مضمون کو اپنا بناتے ہیں تو لے لیں اس میں میرا کیا بگڑتا ہے۔“

مولانا آزاد کے اس بیان نے دنیائے ادب میں ایک جدید بحث اور نئے فتنہ کا دروازہ کھول دیا اور اخبار مدینہ (بجنور) ہماری زبان (علی گڑھ) فاران (کراچی) معارف (اعظم گڈھ) میں سید صاحب اور ابوالکلام کے عقیدت کیشوں کے مضامین و مراسلات کا سیلاب سا آ گیا چنانچہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے مئی ۱۹۵۲ء میں سید صاحب کو براہ راست ایک خط لکھا جس میں اس قضیہ پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سید صاحب نے ۲۵؍ جون ۵۲ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے بہت تفصیل سے لکھا کہ:

> ”........ مسجد کانپور کے واقعہ کے زمانے میں اڈیٹر صاحب کسی

---

[1] مولانا آزاد سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ”الحریۃ فی الاسلام“ کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے شاید آپ لے گئے۔ انھیں ضرور ہی بھیج دیجئے اسی طرح چھپ جائے گا۔ اور سلسلہ مکمل ہو جائے گا (معارف جنوری ۵۴ء ص ۷۶)۔

[2] معارف ماہ اکتوبر ۴۷ء۔

> مصلحت سے مہینہ دو مہینہ کے لئے مسوری تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں...... شائع ہوئیں ان تحریروں میں مشہد اکبر، تذکار نزول قرآن، قصص بنی اسرائیل وغیرہ میرے مضامین ہیں۔...... جہاں تک یاد آتا ہے، حریت اسلام کے سلسلہ میں اسلام کے نظام سیاسی کا مضمون میں نے لکھا تھا۔ جو اس سے پہلے الندوہ میں اسلام اور اشتراکیت کے عنوان سے چھپ چکا ہے اس کو دوبارہ الہلال کے رنگ میں لکھا۔"

پھر بعض دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام کے نام سے شائع کر دیا ہے اس میں ابوالکلام کا قصور خاموشی کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنی شہرت کے لئے ہمارے قلم کے محتاج نہیں ہیں۔ اور ہم لوگ بھی ان کے محتاج نہیں۔ مگر واقعہ ہے۔"

سید صاحب کا یہ متوازن وضاحتی مراسلہ ظہیر احمد صدیقی نے اپنے تبصرہ ورائے کے ساتھ ہفتہ وار "ہماری زبان" (علی گڑھ) ۱۵ر جولائی ۱۹۶۰ء میں شائع کر دیا۔ راقم سطور کا خیال ہے کہ مولانا آزاد کا مستفسر کو مذکورہ بالا جواب، جو اس بحث کا باب آغاز ہے، ضرور کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یعنی یا تو سوال اس انداز سے کیا گیا جو مولانا کو ناگوار گزرا۔ یا پھر وہ خود اس وقت کسی دوسرے موڈ میں تھے۔ یہ بھی امکان ہے کہ مولانا آزاد کے جواب کو سمجھنے میں سائل سے غلطی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ مذکورہ جواب کے الفاظ مولانا کے نہیں بلکہ سائل کے ہیں۔ صرف ان کا مفہوم مولانا سے منسوب ہے۔

میرے اس خیال کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اس طرز کا جواب ابوالکلام کے مزاج اور فطرت کے قطعی خلاف ہے۔ اُن کے آرٹ کا دیوتا اتنا غیور اور مغرور تھا کہ وہ اپنی انفرادیت میں شرک کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اور ارباب نظر بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مشہد اکبر دوسرے نمبر (۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء) جو بالاتفاق مولانا آزاد کے سحر نگار قلم سے نکلا ہے، کے اسلوب اور

مشہد اکبر نمبر ایک طرز میں حیرت انگیز مماثلت ہونے کے باوجود اصل و نقل کا فرق بہر حال موجود ہے دونوں کے مخصوص الفاظ و تراکیب کو بالمقابل رکھ کر مطالعہ کرنے سے یہ داخلی شہادت قوی سے قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اداریہ نمبر ۲ میں جو پرشکوہ الفاظ، شاندار ترکیبیں، پرزور تشبیہات، لطیف استعارات، اردو اور فارسی کے نگینہ کی طرح جڑے ہوئے اشعار، قرآن پاک کی برمحل آیات، شان خطابت اور رنگینی و رعنائی پھوٹی پڑ رہی ہے، اس سے مشہد اکبر نمبر ۱ عاری ہے لہذا مولانا آزاد کی معروف انانیت اور انفرادیت پسندی کسی طرح سید صاحب کے لکھے ہوئے مقالے کو اپنا قرار دینا پسند نہیں کر سکتی تھی۔

آخری بات یہ عرض کرنی ہے کہ الہلال کا مذکورۂ صدر مقالہ افتتاحیہ تمام تر وقتی جوش و خروش اور عارضی نوعیت کی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی یا بعض اور مضامین کی ملکیت اور عدم ملکیت سے مرحومین کے فضل و کمال پر قطعی اثر نہیں پڑتا ہے۔ الہلال کی عظمت کی بنیاد تو ان مضامین پر ضرور قائم ہے لیکن سید سلیمان ندوی کی عظمت کی اصل بنیاد وہ ضخیم علمی و تحقیقی تصانیف ہیں جنھوں نے مستشرقین یورپ سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ ان کے مقابلہ میں مشہد اکبر کا مضمون کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

ماہنامہ معارف اعظم گڈھ

سیّد سلیمان ندوی کے اصل جوہر ادب کی اس خاص صنف میں اس وقت چمکے جب انھوں نے ماہنامہ "معارف" کسی کے نائب ہو کر نہیں، خود اپنی ذمہ داری پر اور خود مختار ہو کر جاری کیا۔ دراصل معارف کے اجراء کا خیال دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی کے ذہن میں اسی وقت پیدا ہوا تھا جب وہ علی گڑھ میں تھے[1]۔ لیکن کسی وجہ سے اس وقت ان کا یہ خواب شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا۔ اور وحید الدین سلیم نے اس نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ جو اردو صحافت میں اپنا ایک مقام پیدا کر کے ساڑھے تین سال میں بند ہو گیا۔

پھر جب علامہ شبلی نے دارالمصنفین کا خاکہ تیار کیا تو اس میں ایک علمی رسالہ کا اجراء بھی شامل تھا۔ دارالمصنفین میں شبلی کی ایک قلمی یادداشت محفوظ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجوزہ علمی رسالہ کا نام "معارف" اور اس کے اغراض و مقاصد کا ایک خاکہ مولانا شبلی نے خود تیار کیا تھا۔ اس قلمی یادداشت کو یہاں نقل کرنا افادیت سے خالی نہ ہو گا:۔

(۱) نام معارف ہو گا۔

(۲) چیف اڈیٹر: شبلی۔

اسٹاف: مولوی سلیمان، مولوی عبدالماجد، مسٹر حفیظ، مولوی عبدالسلام۔

(۳) تعداد صفحات، تقطیع و کاغذ: ۲۰×۲۹۔ ضخامت ۸۰، قیمت ہے۔

تنوعات مضامین: فلسفہ، تاریخ قدیم و جدید، سائنس۔

ادبیات: شعر، اردو شاعری کی تاریخ اور اسالیب متنوعہ۔

اقتباسات: مجلات علمیہ یورپ اور مصر و بیروت۔

فن تعلیم: کتب نادرہ کا ذکر اور ان کے اقتباسات یا ان پر اظہار رائے۔

---

[1] عابد رضا بیدار: پیش گفتار اشاریہ رسالہ معارف ص ۴۔

تنقید: کتب یا علوم قدیمہ پر۔
مصر سے المقتطف، الہلال، المنار اور بیروت سے المقتبس
منگوائے جائیں۔ بقیمت۔
یورپ کے علمی پرچے منگوائے جائیں۔"

لیکن "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"، علامہ شبلی کی ناگہانی وفات سے ان کی زندگی میں تو یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ مگر جب ان کے لائق شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کی وصیت کے مطابق ان کے علمی خوابوں کی تکمیل کا بار گراں اٹھایا تو دارالمصنفین کے قیام کے ساتھ اس علمی رسالے کے اجراء کی فکر بھی دامن گیر ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال کے بعد جب دارالمصنفین نے جون ۱۹۱۶ء میں اپنا پریس قائم کر لیا تو شبلی کا یہ دیرینہ خواب سید صاحب کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچا۔

معارف کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا۔ یہ رسالہ دارالمصنفین کا علمی ترجمان تھا۔ اس کے مقاصد وہی تھے جو خود دارالمصنفین کے قیام کے تھے۔ سید صاحب نے معارف کے پہلے نمبر میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ معارف کے اجراء، اس کے اغراض ولائحہ عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طویل اداریہ کے کچھ اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

> "حضرت الاستاد علامہ شبلی نعمانی مرحوم دارالمصنفین کے ساتھ ساتھ معارف نام کے ایک ماہوار علمی اور دینی رسالے کا تخیل بھی رکھتے تھے۔ حاشیہ نشینان بساط شبلی نے اس محسن کی یاد میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی بساط بھر ان کی تمام تحریکوں کو زندہ رکھیں گے۔ دو سال کی گذشتہ مدت دارالمصنفین کے قیام وتاسیس میں صرف ہو گئی۔ اب جب ادھر سے اطمینان میسر آیا تو دوسرے فرائض یاد آئے۔ ان میں ایک معارف کا اجراء بھی تھا۔ ہم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک ایک خاص علمی رسالہ کی اعانت کے لئے کہاں تک تیار ہے۔ تاہم ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے۔"

" رسالہ کا موضوع اور مقصد سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن موجودہ نسل کے بجائے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اس حالت میں اب غور کرو کہ اس گروہ کے کیا علمی مہمات ہوں گے۔

اس سوال کا جواب قیاس اور فرض نہیں بلکہ اصول و تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے۔ علمائے سلف اور ان کے کارنامے دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے زمانے تک تمام اسلامی علوم بالکل سادگی اور ایک رُخی حالت میں تھے۔ دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتاً ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ سب سے پہلے ایک گروہ پیدا ہوا جس نے مختلف زمانے کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کر دیئے۔ ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوانوں پر میناکاریاں اور نقش آرائیاں شروع کر دیں۔ عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی۔ عربیت نے معانی و بلاغت کا قالب بدلا۔ اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہو گئے۔ تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی۔ فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہو گئے۔ ان باتوں کے ساتھ ان علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی۔ جہاں غلطیاں دیکھیں، اصلاح کی۔ جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا۔ جو حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا۔ تحلیل کر دیا۔ جو اصل عقائد سے آ کر ٹکراتا تھا اس کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔

آج بعینہٖ اس قسم کی حالت اور اس قسم کا موقع ہے۔ ممالکِ مغربیہ نے اکثر علوم و فنون کے قالب بدل دیئے ہیں۔ فلسفہ نے

بالکل نئی صورت اختیار کی ہے۔ منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ معانی و بلاغت کا اصول بدل گیا ہے۔ تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے۔ مذہبی علوم میں اب ہزاروں نئے مباحث کی ضرورت سے پیش آگئی ہے۔ اسلوب ادا اور طرز تعبیر کا اختلاف اب نئے سرے سے ان کی مستقل ترتیب و تہذیب کا طالب ہے۔

اسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے جو علوم قدیمہ کے ساتھ انھوں نے کیا تھا۔ علم کلام کو فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ میں وہ مرتب کرتے۔ تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، اور فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قابل قبول ہیں۔ اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے سامنے کیوں کر پیوند دیا جا سکتا ہے۔ یا ان کے نمونے پر علوم قدیمہ کی روش کیوں کر بدلی جا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج قوم میں رازی و غزالی، البیرونی و ابن ہیثم، اور ابن خلدون و مقریزی موجود نہیں ہیں۔ تاہم اس کے لئے کام پڑا نہیں رہ سکتا، اور جو کچھ کام جہاں تک بھی بن آئے وہ قابل قدر ہے۔"

"دار المصنفین علامہ مرحوم کے ان ہی تخئیلات کا نتیجہ ہے، اور ہم اپنی کائنات کے مطابق ان ہی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ بالا خیالات کے مطابق معارف سے جن خدمات کی توقع رکھنا چاہیئے اور اس کے مقاصد میں جو نوعیت ہوگی وہ حسب ذیل ہے:

فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتدبہ حصہ پبلک میں لایا جائے عقاید اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔ علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے۔ علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے،

> اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا، اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔ علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بعید کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔ اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تران کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو۔ عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے، اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواھر امانت رکھے ہیں، اور سب سے آخر لیکن سب سے اوّل یہ ہے کہ قرآن کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدّنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں"۔
>
> "اگر صرف ان ہی مقاصد پر قناعت کر لی جائے تو ہمارے نزدیک بڑا کام ہے۔ لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے۔ اس لئے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوان سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے گی"۔[1]

مذکورہ بالا شذرات کے ان اقتباسات سے دنیائے صحافت میں سید صاحب کے وسیع تجربات اور پھر ان سے فائدہ اٹھا کر معارف کو ہر حیثیت سے ملک کے اردو رسائل میں ایک امتیاز عطا کرنے کے عزم و حوصلہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ معارف نے گذشتہ ۶۸ سال کی مدّت میں مذکورہ بالا مقاصد کو جس طرح بوجہ احسن پورا کیا اس پر اس کی فائلوں کی ایک سو چھتیس جلدیں شاہد عدل ہیں۔

معارف ایسے وقت میں نکلا جب ملک کو ایک بلند پایہ علمی رسالہ کی سخت طلب تھی۔ اس لئے اہل علم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ممتاز اخبارات و رسائل نے اس پر نہایت عمدہ ریویو کئے، اور اس کے مضامین کو اپنے کالموں میں نقل کیا۔ چنانچہ سید صاحب جنوری ۱۷ء

---

[1] سید سلیمان ندوی: "شذرات" معارف اعظم گڈھ، جولائی ۱۶ء۔

شذرات (ادارتی نوٹ) میں تحریر فرماتے ہیں :-

> "معارف کی نسبت ملک کے کثیر وقیع اور مشہور اخبارات و رسائل نے جن مادحانہ اور قدردانہ الفاظ کا اظہار کیا ہے، وہ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اکثر معاصرین اس کے مضامین کو اپنے اخبارات ورسائل میں نقل کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔ ملک کے تمام روشن خیال اور علم دوست طبقہ بحیثیت مجموعی اس کو وقعت دیتا ہے اور عزیز رکھتا ہے۔ تاہم اپنے عیوب سے ہم بے خبر نہیں اس لئے اپنے بعض دوستوں کے نیک مشورے کو ہم نے خوشی سے سنا اور قبول کیا، کہتے ہیں کہ علمی مضامین کی خشکی اور تلخی کو گوارا بنایا جائے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ طبیبوں سے فرمائش ہے کہ قند وشکر کے اضافہ سے دوا کی تلخی دور کی جائے۔ ہاں نفاست پسند مریضوں سے بھی التجا ہے کہ ان کو اپنی زبانوں کی قوت ذائقہ کی درستی کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔"[1]

معارف کے اجراء کے بعد عرصہ دراز تک اس کی ادارت کے جملہ فرائض سید صاحب بالکل تنہا انجام دیتے رہے۔ وہی بلاشرکت غیرے اس کے مدیر مسئول تھے۔ صرف ۱۹۲۰ء میں جب وہ یورپ کے سفر پر گئے تو آٹھ ماہ کے لئے عبدالماجد دریابادی نے اس رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں سید صاحب ریاست بھوپال کے امور مذہبی کے افسر اعلیٰ ہو کر چلے گئے۔ اس وقت بھی رسالہ کی فی الجملہ نگرانی کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ لیکن ان کی عدم موجودگی میں عملی طور پر شاہ معین الدین ندوی نے رسالہ کی ادارت کی (درمیان میں صرف ایک سال یعنی ۱۹۴۷ء میں ریاست علی ندوی اس کے مدیر رہے) انھیں نے شذرات اور تبصرے بھی لکھے جو پہلے سید صاحب خود لکھتے تھے۔ ۱۹۴۹ء سے شریک مرتب کی حیثیت سے رسالہ کے سرورق پر شاہ معین الدین ندوی کا نام باقاعدہ طور پر آنے لگا، حالانکہ اب بلاشرکت غیرے تمام تر اُن ہی کی ترتیب ہوتی تھی۔

---

[1] سید سلیمان ندوی: شذرات، معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۱۷ء

۱۹۵۱ء میں جب سید صاحب پاکستان منتقل ہو گئے تو بعض قانونی پیچیدگیوں کے باعث رسالہ کے سرورق سے اس کے بانی و محسن کا نام ختم کرنا پڑا، اور جولائی ۱۹۵۱ء سے معارف کی ادارت ایک مستقل مجلس کے سپرد کی گئی، جس کے ارکان میں ملک کے منتخب اہل علم اور اکابر اہل قلم شامل تھے۔ اس مجلس کے چیف اڈیٹر شاہ معین الدین ندوی مقرر ہوئے۔ جو سید صاحب کے تربیت یافتہ اور ان ہی کے فیضان کمال کا عکس جمیل تھے۔ معارف کی مجلس ادارت میں مختلف وقتوں میں عبدالماجد دریابادی، مناظر احسن گیلانی، عبدالستار صدیقی، عبدالسلام ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد، محمد اویس نگرامی، عبدالسلام قدوائی، ڈاکٹر نذیر احمد، اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام ملتے ہیں"۔ [1]

(۲)

معارف کا سائز ہمیشہ ابتداء سے آج تک ۲۰×۲۶/۸ ہے۔ شروع کے تین سالوں اور زمانہ جنگ میں اس کی ضخامت ۶۰؍ صفحے تھی۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۹ء سے تادم تحریر برابر ۸۰؍ صفحے پر شائع ہو رہا ہے۔ کاغذ کی گرانی اور مصارف طبع میں اضافہ کے مطابق اس کی سالانہ قیمت برابر تبدیل ہوتی رہی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:-

۱- جولائی ۱۹۱۶ء	تا	جون ۱۹۱۹ء	سالانہ قیمت	۴؍ روپے
۲- جولائی ۱۹۱۹ء	تا	دسمبر ۱۹۴۷ء	"	۵؍ روپے
۳- جنوری ۱۹۴۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۲ء	"	۶؍ روپے
۴- جنوری ۱۹۵۳ء	تا	نومبر ۱۹۷۰ء	"	۸؍ روپے
۵- دسمبر ۱۹۷۰ء	تا	جون ۱۹۷۴ء	"	۱۰؍ روپے
۶- جولائی ۱۹۷۴ء	تا	جون ۱۹۷۵ء	"	۱۲؍ روپے
۷- جولائی ۱۹۷۵ء	تا	حال (یعنی ۱۹۷۶ء تک)	"	۱۵؍ روپے

---

[1] رسالہ معارف کے موجودہ اڈیٹر محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہیں اور اس کی مجلس ادارت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر نذیر احمد اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے نام شامل ہیں۔

معارف کی سالانہ قیمت میں تدریجی اضافہ کے مذکورہ نقشہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ہر عہد میں سب سے سستا اردو رسالہ رہا ہے۔ اس کی قیمت اصل لاگت سے بھی کم رکھی جاتی تھی۔ تاکہ اس کی افادیت بیش از بیش عام ہو سکے۔ خالص علمی رسالہ ہونے کے باعث اس کے خریداروں کا حلقہ بہت محدود رہا۔ لیکن اپنے محدود حلقے میں یہ رسالہ بے حد مقبول رہا ہے، گو اس کے خریدار کم رہے ہیں، مگر اس کے پڑھنے والوں کا دائرہ خاصا وسیع رہا ہے۔

معارف کو خوب سے خوب تر بنانے اور عصری صحافت میں اس کو صف پیشیں میں جگہ دلانے کے لئے سید صاحب نے اپنی تمام علمی و صحافتی صلاحیتوں کو صرف کر دیا تھا۔ جب ۱۹۱۶ء میں اس کا اجراء ہوا ہے۔ اس وقت سے کئی سال تک مسلسل اس رسالہ کا تمام بار تن تنہا اپنے دوش ناتواں پر اٹھاتے رہے۔ ہر نمبر کے لئے دو ایک مستقل مقالے لکھنا، کئی کئی صفحے کے شذرات تیار کرنا، جس میں علم، مذہب اور ادب سب پر گوناگوں تبصرہ ہو، اور متعدد کتابوں پر ریویو کرنا، یہ سب سید صاحب کے ذمہ تھا۔ ان ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ مستقل تصنیف و تالیف، جا بجا لکچر، کانفرنسوں اور انجمنوں میں شرکت، ناظم دار المصنفین کی حیثیت سے ملک بھر سے وسیع مراسلت وغیرہ کا کام مستزاد تھا[1]۔ خود سید صاحب نے عبد الماجد دریابادی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ دار المصنفین کے قیام اور معارف کے اجراء کے ابتدائی زمانے میں انھیں روزانہ بارہ گھنٹے مسلسل تحریر و تالیف کا کام کرنا پڑا ہے۔ اسی باعث ۱۶ء کے وسط ہی سے ان کی بینائی متاثر ہونے لگی تھی۔[2]

معارف کو اپنی نوعیت کا مثالی رسالہ بنانے کے لئے سید صاحب نے ان تمام تجربات سے فائدہ اٹھایا جو الندوہ اور الہلال کی سب اڈیٹری کے زمانے میں انھوں نے حاصل کئے تھے۔ بیسیوں انگریزی رسالے انگلستان و امریکہ سے اور عربی رسائل مصر و شام وغیرہ سے منگوائے، ملک کے مشاہیر اہل قلم سے تعاون کی درخواست کی اور ان سے بلند پایہ مقالے لکھوائے۔ مضامین کے انتخاب میں ذوق صحیح سے کام لیا۔ ان میں مناسب ترمیم و اصلاح اور حک و اضافہ کیا۔ معارف

---

[1] عبد الماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۹ر جنوری ۵۴ء ص ۴۔

[2] مکتوبات سلیمانی ج ۱ ص ۵۵ مکتوب نمبر ۳۱ مورخہ ۱۹ر جولائی ۱۶ء۔

کے ابتدائی دور میں سیّد صاحب نے ابوالکلام آزاد سے خالص فقہی موضوعات پر مضامین حاصل کئے ۔ مثلاً غیر مسلموں کا داخلہ مساجد اور طلاق ثلاثہ ۔ اسی طرح انھوں نے فلسفہ قدیم وجدید اور سائنسی موضوعات پر ان فنون کے ماہرین سے مضامین لکھوائے

ابتدا میں معارف کی ایک جلد سال بھر کے بارہ نمبروں پر مشتمل ہوتی تھی ، اس طرح کی تین جلدیں شائع ہوئیں ۔ مگر پھر جولائی ۱۹ء سے ہر ششماہی پر ایک جلد ختم ہونے لگی اور تاہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے ۔ اس تبدیلی کا اعلان بعض دوسری اہم معنوی تبدیلیوں کے ساتھ ہم کو جون ۱۹ء کے شذرات میں ملتا ہے :۔

> " مضامین کے لحاظ سے جدّت خاص یہ ہوگی کہ شذرات میں ہر مہینہ کے اہم علمی حوادث کے متعلق تبصرہ ہوگا ۔ مقالات کے تحت مشرق و مغربی علوم و مسائل خصوصاً یورپ کی جدید تحقیقات و مسائل و علوم و نظریات پر محققانہ مضامین ہوں گے ۔ سائنٹفک اور فلسفیانہ مضامین جو یورپ کے اہم ترین رسائل کے نچوڑ اور عطر ہوں گے ۔ اور مشاہیر اہل قلم کی کوششوں کے نتائج ہوں گے ۔ پیش کئے جائیں گے ، ریویو اور تنقید کا حصّہ خاص طور سے اہم ہوگا ، جس میں نہایت سنجیدگی ، متانت اور وسعت نظر کے ساتھ ماہانہ اُردو مطبوعات پر تبصرہ ہوگا ۔ یورپ اور امریکہ کے تمام علمی رسائل کا ماہوار خلاصہ درج کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔ مشرقی علوم کے متعلق بھی معارف اپنا فرض فراموش نہیں کرے گا ۔ اکثر نمبروں میں سیر العلم یا دنیا کی علمی رفتار کے نام سے ہر مہینہ اکتشافات و ایجادات و نظریات علمی کی خبریں درج کی جائیں گی ۔"
>
> " معارف کا ہر نمبر ہر مہینہ کی علمی ترقیوں کا آئینہ ہوگا ۔ جس میں ہر پڑھنے والے کو یہ نظر آجائے گا کہ دنیا کی علمی سطح روزانہ کس قدر بلند ہو رہی ہے ۔ اور اس کی ترقی کی رفتار ہر مہینہ کس قدر تیز ہے ۔"

"بہترین علمی مضامین پر معارف کی طرف سے مضمون نگاروں کو معاوضہ دیا جائے گا۔"[1]

مذکورہ بالا اعلان سے سید صاحب کی وسعت نظر، فن صحافت سے گہری واقفیت، اور اس کی کامیابی کی تیکنک کے شعور کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عرصہ تک معارف کے بلند پایہ مضمون نگاروں کی خدمت میں معقول معاوضہ پیش کیا جاتا رہا۔[2] لیکن رسالہ کی مالی حالت کی خرابی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک زمانہ میں سید صاحب کا عزم و حوصلہ اس کی ضخامت کو مزید بڑھا کر سو صفحے کرنے کا بھی ہو گیا تھا۔ مگر حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔ معارف کے تمام ظاہری و معنوی محاسن کے باوجود اور پورے ملک میں اس کی مقبولیت و شہرت کے باوصف یہ حقیقت بڑی افسوسناک ہے کہ اس کے خریداروں کا حلقہ کبھی سید صاحب کی توقع اور حوصلہ کے مطابق وسیع نہ ہو سکا، اسی لئے یہ رسالہ ہمیشہ ادارہ پر اپنی کفالت کا بار ڈالے رہا ہے۔

سید صاحب ملک کے ممتاز اہل قلم سے کس منت و سماجت کے ساتھ معارف کے لئے قلمی تعاون کی درخواست کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ عبد الماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:-

> "آپ گلہ کرتے ہیں کہ معارف میں مذہبی رنگ تیز ہے لیکن میں نے آپ کو اور مولوی عبد الباری صاحب کو پہلے ہی تنبیہ کر دی تھی کہ اگر مشرقیات کا جلوہ اس میں زیادہ روشن ہے تو یہ عاشقان مغربیات کا قصور ہے۔ اب بھی رحم فرمائیے۔"[3]

اسی طرح سید صاحب نے خطوط لکھ لکھ کر ڈاکٹر حفیظ سید، عبد الباری ندوی، کرامت حسین، اور ظفر حسین خاں سے فلسفیانہ مضامین طلب کئے اور خود منقولات کا پایہ سنبھالا۔[4]

---

[1] اعلان "ظاہری و معنوی تغیرات" معارف جون ۱۹۱۹ء۔

[2] سید سلیمان ندوی: شذرات معارف فروری ۱۹۲۰ء۔

[3] مکتوبات سلیمانی ج ۱ ص ۵۸ (مکتوب ۳۲ مورخہ ۹ راگست ۱۹۱۶ء۔

[4] " " ج ۱ ص ۵۶۔

معارف کے ظاہری پیکر، معنوی مواد اور اس کے نظام اشاعت کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جو اسے عصری صحافت میں ایک انفرادیت اور خصوصی تمغۂ امتیاز عطا کرتی ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ یہ رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تاریخ کو نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو جاتا ہے۔ اس کی طویل ترین تاریخ میں کبھی اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ الا ماشاء اللہ۔

۲۔ گذشتہ ۶۸ر سال میں کبھی ایک اشاعت کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔

۳۔ اس کا سرورق ہمیشہ سادہ، متین اور پروقار رہا۔ کبھی اس کو رنگین اور جاذب نظر بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ ملک کے ممتاز آرٹسٹوں نے بلا اجرت اس کے ٹائٹل پیج کو حسین وخوشنما بنانے کی پیش کش کی۔ اور اس کے لئے متعدد چربے بھی بنائے۔ [1]

۴۔ معارف کا ایک خاص امتیاز اس کی غیر معمولی متانت اور سنجیدگی ہے۔ بقول عبدالماجد دریا بادی "سنجیدہ و متین اسلوب میں علمی و ادبی مضامین کا اتنا ضخیم ماہوار مجموعہ قابل داد ہے۔" [2]

۵۔ اس کی کتابت وطباعت ہمیشہ معیاری رہی۔ اور کاغذ بھی اعلیٰ قسم کا استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں رسالہ معارف اپنی حسن کتابت وطباعت کے باعث معارف پریس کے اشتہار کا کام کرتا تھا۔ اور اس کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ بعد میں گوناگوں وجوہ کے باعث اس معیار میں کمی وپستی آگئی۔ سید صاحب کتابت وطباعت کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جب ملک کے تمام رسائل اس کے

---

[1] استاذ مرحوم شاہ معین الدین ندویؒ نے راقم سطور کو خود یہ بات بتائی تھی۔

[2] سید سلیمان ندوی: شذرات معارف جنوری ۱۹۲۷ء۔

شراروں سے جھلسنے لگے تھے۔ معارف نے اپنی آن بان کو برقرار رکھا۔ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں :۔

"معارف رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ مطابق جولائی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا میں جنگ وجدل کے شرارے اڑ رہے تھے۔ کاغذ کی گرانی اور سامان طبع کی نایابی نے پرانے پرانے مطبوں کے دیوالے نکال دیئے تھے، لیکن معارف نے پوری دلیری سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔" [1]

۶۔ معارف نے عصری صحافت کے عام اور مقبول عوام رجحان کے برخلاف اپنی پوری تاریخ میں "سلیمان نمبر" اور "شروانی نمبر" کے علاوہ کبھی کوئی خصوصی شمارہ یہاں تک کہ سالنامہ بھی نہیں نکالا۔ اس روایت کی بنیاد خود سید صاحب نے قائم کی تھی۔ ضخیم و معیاری خاص نمبر مرتب کرنا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ان کی زندگی میں اس کے مواقع بھی کثرت سے آئے، لیکن شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنی انفرادی راہ قائم کرنا معارف اور سید صاحب کا عظیم کارنامہ رہا ہے۔

۷۔ معارف میں کبھی اشتہارات شائع نہیں ہوئے۔ اس خصوصیت میں بعض اور رسالے بھی معارف کے سہیم ہیں۔ اس میں دارالمصنفین کی مطبوعات کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت مروجہ اشتہار کی نہیں ہے۔ دراصل معارف کا ہر مقالہ نئے صفحہ سے شروع ہوتا ہے۔ کوئی مقالہ اگر پورے صفحہ سے پہلے ہی ختم ہو جائے تو باقی جگہ میں اس مقالہ کی مناسبت [2] سے دارالمصنفین کی کسی کتاب کا تعارف

---

[1] سید سلیمان ندوی : شذرات معارف جنوری ۲۷ء۔

[2] مثال کے طور پر اگر اقبال کی شخصیت یا کلام سے متعلق کوئی مقالہ شائع ہوا ہے تو اس کے آخر میں "اقبال کامل" مصنفہ عبدالسلام ندوی کا اشتہار دیا جائے گا۔ علی ہذا القیاس۔

کرادیا جاتا ہے۔

۸ - معارف میں تنوع قائم رکھنے کا بھی خصوصی خیال کیا جاتا رہا ہے۔ یعنی کسی نمبر میں بھی اکتا دینے والی یکسانیت نہ ہو۔ بلکہ تاریخ، ادب، سیرت، شاعری اور فلسفہ ومنطق کے رنگا رنگ مضامین کا خوشنما گلدستہ تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رسالہ کا ہر شمارہ اس کی شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ معارف کا ایک اہم اور امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کے علمی وتصنیفی جمود کو توڑا اور خالص علمی وتحقیقی موضوعات پر سنجیدہ تحریریں لکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار کردی۔ مثال کے طور پر مناظر احسن گیلانی، ظفر احمد عثمانی، عبدالباری ندوی، میر ولی الدین، ظفر حسین خاں، مہدی افادی، عشرت حسین انور، شوکت سبزواری، خواجہ عبدالحمید اور عبدالسلام خاں رام پوری وغیرہ جو مقالہ نگاری کے مطلع شہرت پر خوب چمکے، دراصل معارف ہی کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح سید صاحب کے فیضان تربیت میں رہ کر معارف کے ممتاز اہل قلم کی صف میں بیٹھنے والوں میں عبدالرحمٰن نگرامی، شاہ معین الدین ندوی، ریاست علی ندوی، ابوالجلال ندوی، سعید انصاری، نجیب اشرف ندوی، ابوظفر ندوی، ابوالحسنات ندوی، محمد اویس نگرامی، مجیب اللہ ندوی، اور سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کے نام خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کے جن مضمون نگاروں نے بالواسطہ معارف سے اکتساب فیض کر کے قلم چلانا سیکھا اور ان میں تحقیقی وعلمی ذوق پیدا ہوا۔ ان کی تعداد کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہے۔

(۳)

معارف کے اجراء کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت پرآشوب دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم کی آگ ابھی سرد نہ ہوئی تھی۔ اس ماحول میں علمی وتحقیقی مضامین لکھنے والے بس خال خال ہی تھے۔ معارف نے صور بیداری پھونکا اور لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کا

ایک ٹھوس حلقہ پیدا کیا، جو روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اس کے اثر سے نئے اور پرانے دونوں طبقے متاثر ہوئے۔ پرانے طبقہ کو اس نے مذہب اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کے لئے وسائل اور علمی مسائل کی تحقیق و تنقید و انشاء و تحریر کے نئے طریقوں سے آشنا کیا، اور جدید طبقہ جو اپنی ماضی کی عظمت سے ناواقف تھا۔ اس کو تاریخ اور علوم و فنون کی طرف متوجہ کیا۔

بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:۔

> "معارف نے سیکڑوں علمی موضوعات اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے علوم اسلامی کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جا سکتی ہے"۔ [1]

قدیم و جدید کا کونسا مسئلہ ہے۔ جس پر معارف میں مضمون شائع نہیں ہوا۔ خصوصاً مغربی افکار و خیالات کی تردید میں تو صدہا مضامین اس میں شائع ہوئے۔ خود علامہ سید صاحب نے جو بیش قیمت مضامین اس میں لکھے ہیں، ان کی ضخامت کئی ہزار صفحات ہوگی۔ انھوں نے خاص طور سے مستشرقین کے افکار و نظریات کے جواب میں بعض بے حد گرانقدر مقالے معارف میں سپرد قلم کئے، مثلاً یورپ کے مشہور مستشرق مارگولیتھ کی کتاب کے حوالے سے مانچسٹر گارجین میں ایک مضمون حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارے میں شائع ہوا تھا، جس میں مضمون نگار نے بعض نامناسب باتیں واقدی کی روایت سے نقل کی تھیں۔ سید صاحب نے معارف کے کئی نمبروں میں اس کا محققانہ جواب دیا۔ اس بحث میں مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گویلم نے بھی حصہ لیا۔ [2] سید صاحب نے ان دونوں کو اپنے عالمانہ و تحقیقی مقالات سے خاموش کر دیا۔ اسی طرح سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک یوروپین اہل قلم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے"۔ سید صاحب نے اس کا بھی نہایت محققانہ جواب لکھا۔ اور ثابت کیا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی خدمت ضرور کی ہے مگر اس فلسفہ کے وہ مقلد محض نہیں ہیں۔ بلکہ انھوں نے اس کے سالے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اسی زمانہ میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام پر اعتراض کیا گیا۔

---

[1] شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۱۱۱۔

[2] مجیب اللہ ندوی: تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۶۸۔

اس کے رد میں ایک طویل مضمون لکھا۔ مغربی اہل قلم کے حملوں کا دفاع کرنے کے ساتھ سید صاحب نے خود ہندوستان کے بہت سے فتنہ نگاروں سے بھی قلمی جہاد کیا اور ہر مرحلہ میں کامرانی نے قدم چومے۔

معارف کی اہمیت اور قدر افزائی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ملک کے اساطین علم وادب نہ صرف اس کو شوق کے ہاتھوں لے کر پابندی سے پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کی جلدوں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے سیّد صاحب کے نام اپنے ایک خط میں معارف پر اظہار کرتے ہوئے لکھا:۔

> "یہی ایک رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔"[1]

مولانا محمد علی جوہر کو بھی اس رسالہ سے بڑا انس تھا۔ ایک بار انھوں نے سید صاحب کو لکھا:۔

> "میرے پاس متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں۔ ..... یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا۔ کہ مجلدات تیار کرائی جائیں۔"[2]

مولانا ابوالکلام اپنے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر کرتے ہیں:۔

> "معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ صرف یہی ایک پرچہ ہے۔ اور ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہیں گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم و تصنیف کے لئے وقف ہے۔"[3]

عبدالمجید سالک نے معارف پر تبصرہ کرتے ہوتے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:۔

"سنہ ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین کا مشہور و معروف علمی پرچہ معارف

---

[1] اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اول ص ۸۰ مکتوب نمبر ۴۸۔

[2] خطوط محمد علی مرتبہ محمد سرور ص ۶۶ (مکتبہ جامعہ دہلی سنہ ۱۹۴۰ء)۔

[3] مکاتیب ابوالکلام بنام سید سلیمان مطبوعہ رسالہ معارف اکتوبر سنہ ۱۹۵۳ء ص ۳۱۳۔

> جاری ہوا۔ جو بلا مبالغہ دنیائے اسلام کا بہترین علمی و تحقیقی رسالہ ہے، اور جس نے ہمارے تاریخ و تحقیق کے ذخیرہ کو مالا مال کیا۔" [1]

ایک مرتبہ معارف میں ڈاکٹر نکلسن پر کچھ لکھا گیا تو اس کے متعلق آصف فیضی صاحب نے کیمبرج سے سید صاحب کو لکھا:۔

> "معارف میں ڈاکٹر نکلسن پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کو انھوں نے پسند کیا اور معارف کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مشترقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و خیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔" [2]

یہی نہیں بلکہ معارف کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر نکلسن نے اسلامی تصوف پر اپنا ایک گرانقدر مقالہ بھی معارف میں اشاعت کے لئے بھیجا جو جون ۲۳ء کے نمبر میں شائع ہوا۔ معارف کے بکثرت ایسے مضامین جن میں مستشرقین کے اعتراضات کے قلعے مسمار کئے گئے تھے۔ ترجمہ ہو کر اسلامک ریویو ووکنگ میں شائع ہوئے۔ معارف کی مشرق و مغرب دونوں میں مقبولیت کا یہی راز ہے کہ اس نے ملک کی دماغی اور ذہنی رفتار پر ہمیشہ نگاہ رکھی۔ اور اسلام مخالف لٹریچر سے وہ خواہ یورپ سے شائع ہوا ہو یا ملک کے اندر۔ یہاں کے ذہن و دماغ کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہر دام تزویر کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

معارف جس زمانے میں نکلا ہے، اپنے رنگ میں اردو کا تنہا علمی رسالہ تھا صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے منتخب اور چوٹی کے رسالوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے بعد معارف کی تقلید میں جو رسالے نکلے ان میں ایک علمی حیثیت سے اس کے رتبہ کو نہ پہونچ سکا۔

سید صاحب معارف جون ۲۷ء کے شذرات میں رقمطراز ہیں:۔

> "گو بعد میں اردو رسائل کی دنیا میں بڑے انقلابات اور تغیرات

---

[1] عبدالمجید سالک: رسالہ ماہ نو کراچی، جنوری ۵۴ء ص ۲۵۔

[2] شذرات، معارف، اپریل ۱۹۲۳ء ص ۲۴۳۔

> پیدا ہوگئے۔ لیکن معارف جس وقت نکلا تھا تو زمانہ (کانپور) الناظر (لکھنؤ) نقاد (آگرہ) اور مخزن (لاہور) کے سوا کوئی قابل ذکر رسالہ موجود نہ تھا اور ان میں الناظر کے سوا بقیہ تمام رسائل کا سرمایہ تمام تر ادبیات تھا۔ سنجیدہ، ٹھوس، علمی اور محققانہ مضامین کی ملک میں نہ مانگ تھی نہ درآمد تھی۔ معارف اس غیر مطلوبہ سامان کو لے کر جب بازار میں آیا تو خلاف توقع قدردانوں نے اس کو پسند کیا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا۔"[1]

معارف بنیادی طور پر ایک علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔ اس لئے اس میں بیشتر اسلامی اور مشرقی موضوعات پر مستند اور معیاری مضامین شائع ہوتے ہیں۔ لیکن تنوع قائم رکھنے کے لئے تنقیدی و ادبی مقالات بھی کثرت سے شائع کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ معارف کو جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے علوم اسلامیہ کی مفقود النظیر انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں مختلف علمی موضوعات پر مشاہیر اہل قلم کے اعلیٰ پایہ مقالات شائع ہوئے۔ ذیل کی فہرست سے اس کے تنوع اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

۱۔ اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات	مناظر احسن گیلانی	اپریل ؁۵۲ء
۲۔ ہندوؤں کا ایک عجیب فرقہ	سید سلیمان ندوی	جولائی ؁۳۲ء
۳۔ بائبل قرآن و حدیث کی روشنی میں	محمد اویس ندوی	نومبر، دسمبر ؁۴۰ء
۴۔ جمع و تدوین قرآن	سید صدیق حسن	جنوری ؁۶۴ء
۵۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	محمد تقی امینی	جنوری، فروری ؁۵۹ء
۶۔ فساد زمانہ اور عموم بلوی	مجیب اللہ ندوی	اگست، ستمبر ؁۶۲ء
۷۔ سند معافی جزیہ عہد عالمگیر	سید سلیمان ندوی	اپریل ؁۵۱ء
۸۔ مسلمانان ہند کی مذہبی تعلیم	" " "	مارچ ؁۵۵ء
۹۔ وقف اور امام ابوحنیفہ	سید فضل اللہ	جولائی ؁۵۴ء

---

[1] شذرات، معارف، جنوری ؁۱۹۲۷ء ص ۴۔

۱۰۔ جنایات بوجہ غفلت	محمد غوث	جولائی تا دسمبر سنہ ۵۳ء
۱۱۔ فلسفیانہ وحدۃ الوجود	عبدالباری ندوی	اگست سنہ ۲۲ء
۱۲۔ اسلامی تصوف کا نظری و عملی پہلو	گوپی چند نارنگ	اپریل سنہ ۵۷ء
۱۳۔ حقیقت معرفت	ظفر احمد تھانوی	جنوری سنہ ۴۳ء
۱۴۔ بے خوف زندگی	میر ولی الدین	دسمبر سنہ ۵۷ء
۱۵۔ قوت ایمانیہ اور ظہور غیب	″ ″	نومبر سنہ ۵۱ء
۱۶۔ قرآن اور فلسفہ	″ ″	دسمبر سنہ ۴۷ء
۱۷۔ مدارج سلوک	″ ″	″ سنہ ۵۷ء
۱۸۔ ملفوظات خواجگان چشت	صباح الدین عبدالرحمٰن	نومبر سنہ ۶۴ء
۱۹۔ مآل و مشیت	ظفر حسین خاں	جون سنہ ۴۷ء
۲۰۔ ارتقاء کا ایک نیا نظریہ	خواجہ احمد فاروقی	ستمبر ″
۲۱۔ ماہیت مادہ	عبدالباری ندوی	دسمبر سنہ ۱۸ء
۲۲۔ اشتراکیت اور فوضویت	عبدالسلام ندوی	جون سنہ ۱۷ء
۲۳۔ مکالمات برکلے	عبدالماجد دریابادی	نومبر دسمبر ″
۲۴۔ فلسفہ لیبان	عبدالسلام ندوی	مارچ ″
۲۵۔ عقلیت پرستی پر ایک نظر	مظہر الدین صدیقی	نومبر دسمبر سنہ ۴۰ء
۲۶۔ ہندی فلسفہ	بشیر احمد ڈار	جون سنہ ۳۳ء
۲۷۔ اہل سنت والجماعت	سید سلیمان ندوی	مئی جون سنہ ۱۷ء
۲۸۔ اسلام کا اثر یورپ پر	قاضی احمد میاں اختر	اپریل سنہ ۲۱ء
۲۹۔ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام	مناظر احسن گیلانی	جون سنہ ۳۰ء
۳۰۔ عالم برزخ	ثناء اللہ امرتسری	نومبر سنہ ۳۲ء
۳۱۔ اسلام اور تکمیل اخلاق	عبدالسلام ندوی	مئی ″
۳۲۔ اسلامی نظریہ سیاست	حیدر زماں صدیقی	اگست سنہ ۴۶ء

۳۳۔ اشتراکیت اور اسلام	منظہر الدین صدیقی	جولائی اگست سنہ ۴۳ء
۳۴۔ اسلام کا معاشیاتی نظام	″ ″	فروری مارچ سنہ ۴۸ء
۳۵۔ اسلامی قانون اجرت	مجیب اللہ ندوی	مئی سنہ ۶۰ء
۳۶۔ اسلام میں نظام زمینداری	ظفر احمد عثمانی	اپریل جون سنہ ۵۳ء
۳۷۔ تقویم جلالی	ڈاکٹر حمید اللہ	جولائی سنہ ۴۳ء
۳۸۔ اسلامی رصد خانے	شبیر احمد غوری	جنوری سنہ ۶۴ء
۳۹۔ مسلم علم ہیئت کا اجمالی جائزہ	″ ″	جون سنہ ۶۵ء
۴۰۔ لاہور کا ایک فلکی آلات ساز	سید سلیمان ندوی	مارچ سنہ ۳۳ء
۴۱۔ اسلامی طب کی مختصر تاریخ	عبد السلام ندوی	جولائی اگست سنہ ۴۷ء
۴۲۔ عربوں کی بحری تصنیفات	سید سلیمان ندوی	مارچ سنہ ۳۵ء
۴۳۔ مسلمانوں کا علم ہندسہ	شبیر احمد غوری	اکتوبر نومبر سنہ ۵۶ء
۴۴۔ اکبری دور کا ایک موجد	معین الدین رہبر فاروقی	مئی جون سنہ ۳۸ء
۴۵۔ مسلمانوں کی آئندہ تعلیم	سید سلیمان ندوی	اکتوبر سنہ ۵۸ء
۴۶۔ عہد نبوی میں نظام تعلیم	پروفیسر حمید اللہ	نومبر سنہ ۴۸ء
۴۷۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں	سید سلیمان ندوی	جنوری فروری سنہ ۱۸ء
۴۸۔ علامہ ابن عساکر	ضیاء الدین اصلاحی	مئی سنہ ۵۸ء
۴۹۔ ابن الجزری	عبد الحلیم چشتی	نومبر دسمبر سنہ ۵۷ء
۵۰۔ مغل یا مونگل	شیخ عنایت اللہ	اکتوبر دسمبر سنہ ۴۸ء
۵۱۔ دنیائے اسلام میں ذہنی انقلاب	سید سلیمان ندوی	نومبر سنہ ۲۲ء
۵۲۔ خانان چغتائیہ	شیخ عنایت اللہ	اکتوبر دسمبر سنہ ۴۸ء
۵۳۔ عہد اسلامی کا ہندوستان	ریاست علی ندوی	جون سنہ ۴۹ء
۵۴۔ خاندان تغلق	سعید انصاری	دسمبر سنہ ۱۶ء
۵۵۔ ہندوستان میں توپ کی تاریخ	ابو ظفر ندوی	جنوری فروری سنہ ۵۰ء

۵۶۔ ہندو کش عالم گیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں	سید سلیمان ندوی	جون سنہ ۲۹ء
۵۷۔ جہانگیر کا علمی ذوق	سید صباح الدین	جولائی سنہ ۳۶ء
۵۸۔ تاج محل کے طراح اور معمار	عبداللہ چغتائی	جنوری سنہ ۳۱ء
۵۹۔ ہند عہد اورنگ زیب میں	نجیب اشرف ندوی	فروری سنہ ۲۵ء
۶۰۔ حجاز کے کتب خانے	سید سلیمان ندوی	اکتوبر تا دسمبر سنہ ۲۶ء

اس فہرست کی حیثیت محض خروار کی ایک مشت کی ہے۔ ورنہ معارف کی ضخیم فائلوں میں یہ جلوے قدم قدم پر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کا انتخاب آسان کام نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مضامین سے معارف کے تنوع کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس میں مذاہب عالم سے بحث بھی ہے اور قرآنیات کے مباحث بھی، حدیث کی باریکیاں اور فقہ کے اسرار بھی، تصوّف کی چاشنی بھی، اور فلسفہ و کلام کی دقیق بحثیں بھی۔ فرق اسلامی کی تاریخ بھی، سیاسیات، معاشیات، اور تقویم و ہیئت بھی۔ تذکرہ و سوانح بھی اور تاریخ و سیرت بھی۔ سفر نامہ و جغرافیہ بھی اور تعلیمی مسائل بھی۔ ان تمام نقش ہائے رنگ رنگ کے باعث معارف اردو صحافت کی تاریخ میں نقوش جاوداں مرتسم کرچکا ہے۔ پھر جب ہم ان بلند پایہ مضامین کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان علم و فن کے تمام نجوم و کواکب بساط معارف پر صف آرا ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو پہلی بار معارف کے صفحات پر نمودار ہوئے اور آگے چل کر آبروئے علم و ادب قرار پائے اور ملک کے ممتاز مصنفین میں شمار کیے گئے۔ خود سید سلیمان ندوی کے علمی و تحقیقی مقالات کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ان مقالات کے تین مجموعے "مقالات سلیمان" (تاریخی۱، مذہبی۲، علمی۳) کے نام سے دارالمصنفین سے شائع ہوچکے ہیں[1] اور باقی جلدوں کی ترتیب کا کام جاری ہے۔

سیّد صاحب نے معارف میں بعض مقالات اتنے مبسوط و مفصل لکھے جو بعد میں مستقل رسالہ کی شکل میں یا ان کی کسی تصنیف کا جزو بن کر شائع ہوئے۔ اور آج تک اپنے موضوع کی ندرت و تازگی کے باعث اسی طرح شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً سید صاحب کا ایک اہم رسالہ "اہل السنۃ والجماعۃ" پہلے معارف ہی میں قسط وار نکلا۔ اسی طرح خلافت اور ہندوستان"

---

[1] تادم تحریر یعنی سنہ ۷۹ء تک۔

(سنہ ۲۱ء) خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام (سنہ ۲۲ء) اور "حیات مالکؒ" بھی جو پہلے معارف میں شائع ہوئے تھے علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کئے گئے۔ اور تحریک خلافت کے پرآشوب اور ہنگامہ پرور زمانے میں ان کے کئی اڈیشن نکلے۔ سید صاحب کا معارف میں شائع شدہ "سفرنامہ افغانستان" بھی اب کتابی شکل میں "سیر افغانستان" کے نام سے نفیس اکیڈمی حیدرآباد کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

(۴)

یوں تو معارف کے علمی و مذہبی مضامین بھی ادب و انشا کی چاشنی سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن خالص ادبی و تنقیدی موضوعات اور اُردو زبان کے مسائل پر بھی اس میں کثرت سے مضامین شائع ہوئے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ خود سید صاحب نے معارف کے ابتدائی زمانے میں ادبی مضامین خاصی تعداد میں لکھے۔ وہ ادبیات کو منہ کا مزہ تبدیل کرنے کا ایک ذریعہ خیال کیا کرتے تھے۔ یعنی سنجیدہ اور ٹھوس تاریخی و مذہبی مضامین لکھتے لکھتے ادب و شعر کے گل و گلزار میں سبک خرامی سے ذہنی تازگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان ادبی مضامین کا تحقیقی اور علمی معیار کتنے ذہنی ریاض و کاوش کی نشاندہی کرتا ہے۔ سید صاحب کے اہم ادبی مضامین کا مجموعہ سنہ ۱۹۳۹ء میں "نقوش سلیمانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ گذشتہ اوراق میں ادبی خدمات کے تحت ان مضامین کا تفصیل سے جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ معارف میں ملک کے دوسرے ممتاز اہل قلم کے جو ادبی مضامین شائع ہوتے ان میں سے چند یہ ہیں:-

۱۔ ارتقائے ادب اردو	مہدی افادی	ستمبر	سنہ ۱۷ء
۲۔ شبلی سوسائٹی	"	جون	سنہ ۱۸ء
۳۔ شبلی کی شاعری	محبوب الرحمٰن کلیم	دسمبر	"
۴۔ حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک	مہدی افادی	اپریل	سنہ ۱۹ء
۵۔ ڈاکٹر اقبال کی اردو	محمد زمان	مئی	سنہ ۲۸ء

۶۔ اقبال اور برگساں	عبدُ السلام خاں	فروری تا اپریل	؁۴۱ء
۷۔ کلامِ اقبال کی دقتیں	سید عبداللہ	مارچ اپریل	؁۴۴ء
۸۔ اقبال انا اور تخلیق	خواجہ عبدالحمید	نومبر دسمبر	''
۹۔ عزیز لکھنوی کے قصائد	غلام مصطفےٰ خاں	نومبر	؁۴۵ء
۱۰۔ اقبال کے تصور خودی کے مآخذ	بشیر الحق مخفی	ستمبر	''
۱۱۔ فلسفہ اقبال کا مرکزی خیال	شوکت سبزواری	فروری	؁۴۶ء
۱۲۔ اقبال اور نطشے	عشرت حسین انور	جولائی	؁۵۱ء
۱۳۔ اقبال اور جیمس وارڈ	'' '' ''	اگست تا نومبر	''
۱۴۔ اقبال اور وہائٹ ہیڈ	'' '' ''	دسمبر	''
۱۵۔ اقبال رومی اور برگساں	'' '' ''	مارچ	؁۵۴ء
۱۶۔ اقبال رومی اور شنکر	'' '' ''	جولائی تا ستمبر	''
۱۷۔ موازنہ اقبال و غالب	عبدالمغنی	اکتوبر	؁۶۳ء
۱۸۔ لکھنؤ کی زبان	شوکت سبزواری	دسمبر	؁۵۱ء
۱۹۔ محسن کاکوروی کا کلام	ابواللیث صدیقی	ستمبر اکتوبر	؁۴۱ء
۲۰۔ مثنوی گلزار نسیم کا مآخذ	سید ظہور الحسن	اگست	؁۴۶ء
۲۱۔ قائم چاندپوری کا انفرادی رنگ	ڈاکٹر محمد عرفان	دسمبر	؁۶۳ء
۲۲۔ اردو شاعری میں انقلاب	عبدالسلام ندوی	جولائی اگست	؁۵۳ء
۲۳۔ اقبال سہیل میری نظر میں	مرزا احسان احمد	فروری مارچ	؁۵۶ء
۲۴۔ غبار خاطر پر ایک نظر	فیض الرحمن اعظمی	جنوری	؁۵۹ء
۲۵۔ اردو شاعری اور فن تنقید	عبدالسلام ندوی	مئی تا دسمبر	؁۶۱ء
۲۶۔ اردو کے چند مظلوم ادیب	عبدالماجد دریابادی	اگست	؁۶۲ء
۲۷۔ چکبست لکھنوی	کشن پرشاد کول	نومبر	؁۵۲ء
۲۸۔ اشرف علی فغاں	سید صباح الدین	جنوری تا مارچ	؁۴۸ء

۲۹۔ اردو ادب کی تاریخ کے لئے نصب العین	حفیظ سید	اگست	؁۴۵ء
۳۰۔ اکبر کا سنجیدہ کلام	عبدالسلام ندوی	جون	؁۱۷ء
۳۱۔ دیوان حسرت موہانی	〃	مارچ	〃
۳۲۔ شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام	کلب علی خاں	ستمبر	؁۵۴ء
۳۳۔ تسکین اور اس کا کلام	عابد رضا بیدار	جنوری	؁۵۳ء
۳۴۔ غالب کا سکہ شعر	خواجہ احمد فاروقی	نومبر	؁۵۸ء
۳۵۔ خوب چند ذکا اور غالب	〃	اکتوبر	؁۳۰ء
۳۶۔ الہلال کا مطالعہ	سید صباح الدین	جون	؁۵۸ء
۳۷۔ مولانا ابوالکلام	رشید احمد صدیقی	دسمبر	〃

معارف کے ادبی مضامین کی اس اجمالی جھلک سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس رسالہ کا ادبی پایہ کتنا بلند ہے۔ اگر اس کے صرف ادبی مقالات ہی کو یکجا کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔ ان مقالات میں ادبی موضوعات کا جو تنوع ہے وہ درحقیقت مستقل تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔ غالبیات، اقبالیات، شبلیات اور ابوالکلامیات پر خصوصی اعتنا کے ساتھ شعر و ادب کا کوئی گوشہ بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں رہا ہے۔ دارالمصنفین کے باہر کے اہل قلم سے ادبی مضامین کا حصول بھی سید صاحب کے ادبی ذوق اور تنقیدی شعور کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

معارف میں شائع ہونے والی سید صاحب کی جو ادبی تحریریں ان کے مجموعۂ مضامین نقوش سلیمانی میں کسی وجہ سے شامل نہ ہو سکیں۔ ذیل میں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے:-

۱۔ نقدالشعر	جولائی ؁۱۹۱۶ء
۲۔ قدیم اساتذہ اردو کے کلام میں جدید شاعری	جنوری ؁۱۷ء
۳۔ ناشرین اردو سے خطاب	مئی ؁۱۷ء
۴۔ مثنوی لیلےٰ مجنوں	جنوری ؁۱۸ء
۵۔ رموز بے خودی	اپریل 〃

۶۔ وضع اصطلاحات	اپریل ؁۲۱ء
۷۔ شعرالعجم اور عمر خیام	فروری ؁۲۴ء
۸۔ سیر المصنفین	ستمبر ؁۲۵ء
۹۔ رباعی کی تاریخ اور آغاز پر ایک نظر	اپریل ؁۳۲ء
۱۰۔ بال جبریل	جون ؁۳۵ء

۱۱۔	مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟	اگست ۴۶ء
۱۲۔	طوفانِ محبت	مارچ ۴۷ء
۱۳۔	ہندوستانی کی اصل اور اس کے اصول	نومبر ۴۸ء
۱۴۔	اُردو کے جدید مسائل	دسمبر ۲۳ء
۱۵۔	دنیائے افسانہ	فروری ۲۵ء
۱۶۔	غبارِ خاطر	جون ۴۶ء

* * *

(۵)

سید صاحب نے معارف کے ادارتی صفحہ کا مستقل عنوان "شذرات" رکھا تھا اس کے تحت ہر ماہ مدیر کے قلم سے مختلف النوع وقتی امور و مسائل پر تبصرہ ہوتا ہے۔ معارف کے شذراتِ سلیمانی خاص طور پر خاصے کی چیز ہیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان کی خصوصیات کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں :-

> "سید صاحب کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے۔ عموماً مختلف النوع، وقتی رموز و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہارِ خیال کرتے تھے، اس لئے ان کے شذرات مباحث و مسائل کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملّی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات کی تاریخ مقرر کی جاسکتی ہے اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کے شاہکار ہیں"۔[1]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی اپنے مخصوص طرزِ تحریر اور منفرد اندازِ بیان میں

---

[1] شاہ معین الدین ندوی: "سید صاحب کی دینی و علمی خدمات" (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۰۸۔

شذرات سلیمانی کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی و امتیازی شان نگارش رکھتی ہے۔ بے لاگ لیکن نہ درشت نہ کرخت، عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق۔ رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل۔ سلیس لیکن سطحی نہ عامیانہ۔ شگفتہ لیکن نہ ناولانہ نہ خطیبانہ۔ جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پرخروش۔ صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ۔ سلیمانی ادب و انشاء کا اردو کی تاریخ ادب و انشاء میں جو ایک خاص مقام ہے...... اس کی اصل بنیاد وہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔"[1]

سید صاحب ایک بیدار ذہن کے ساتھ دردمند دل بھی رکھتے تھے، اس لئے دنیا کے کسی بھی حصہ میں جب مسلمانوں کو تکلیف پہونچتی تو وہ بے چین و مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ شذرات میں کہیں وہ مسلمانوں کی غفلت پر گریہ کناں ہیں۔ کبھی نوجوانوں کی کج روی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں کبھی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہیں، اور کبھی ان کی ذہنی پسماندگی پر متنبہ کرتے ہیں۔ اور ایک ضرب کلیمی لگاکر ان میں خود شناسی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ کبھی لسانی تعصب و تنگ نظری پر حکومتِ وقت کے سامنے سینہ سپر نظر آتے ہیں، اور کبھی کسی عزیز دوست، ہمدم دیرینہ یا بزرگ قوم کی موت پر خون کے آنسو بہاتے اور دوسروں کو رُلاتے ہیں۔

سید صاحب نے شذرات میں ہر قسم کے اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ شذرات جو مسلمانوں کی مذہبی و ملی زندگی کے اجزاء و عناصر پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں ان کی ترقی و انحطاط اور بقا و استحکام کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ یہ شذرات صرف وقتی و عارضی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کی حیثیت مستقل درس کی ہے۔ جن سے ہر زمانے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب و انشاء کے طالب علم اور صحافت و سیاست کے نووارد ان شذرات سے حسن بیان، متانت تحریر، اور اصابت رائے کا سبق لیں۔ ذیل میں سید صاحب کے شذرات کی چند

---

[1] عبدالماجد دریابادی: "سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے" (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء ص ۴.

جھلکیاں بطورِ مشتے نمونہ از خروارے پیش کی جاتی ہیں :

ہندی اور اردو کے نزاع پر سید صاحب نے معارف کے ادارتی کالموں میں مستقل اور مسلسل لکھا ہے۔ انھوں نے نہایت مدلّل طور پر اردو کے کیس کو اعیان قوم، ارباب قیادت اور اہل نظر کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہندی والوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اور ملک کے اہل دول بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔ لیکن اردو کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ سید صاحب مئی جون ۱۹۳۵ء کے شذرات میں بڑی تکلیف کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

> "...... اس کے مقابل اردو کے لئے اس کے حامی کچھ نہیں کر رہے ہیں نہ اس کی تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس کی اشاعت کے لئے صوبہ میں شاخیں ہیں، نہ اس مقصد کے لئے صوبہ میں ایک پیسہ کوئی خرچ کر رہا ہے ..... تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہونے کے سبب سے ہندوستان کے ہر صوبہ میں بلکہ ہندوستان سے باہر ہر جگہ پھیلتی جا رہی ہے جو اس کی زندگی کی ضامن اور اس کی یقینی کامیابی کی کفیل ہے۔"
>
> "ملک میں دو مختلف زبانیں پیدا کر کے آئندہ کے لئے ہندوستان میں دو قومیں بنائی جا رہی ہیں۔ جن میں باہم ملنے جلنے، سمجھنے بوجھنے اور بولنے چالنے کا بھی وہ موقع باقی نہ رہے گا جو آج اسوقت بھی باقی ہے۔ اور اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں جو بیج بویا گیا تھا وہ اب پورا تناور درخت بن جانے والا ہے۔" [1]

اگست ۱۹۳۵ء میں اردو زبان کے مسئلہ پر پھر لکھتے ہیں :۔

> "ہندوستان کی اس عالم گیر اور وسیع زبان کا غلط نام ایسا مشہور ہو گیا ہے کہ لوگ مذہبی اصطلاح کی طرح اس کو پکڑے ہوتے ہیں، حالانکہ اس لفظ کے اندر اس زبان کی پیدائش کی بالکل تاریخ پوشیدہ ہے۔ عموماً ہر زبان کا نام اس زبان کے ملک یا قوم کی ہمنامی سے پیدا

---

[1] سید سلیمان ندوی : شذرات، معارف مئی جون ۱۹۳۵ء۔

ہوتا ہے، اس لئے ہندوستان کی اس عام مشترک زبان کا صحیح نام ہندوستانی ہو سکتا ہے۔ اور یہ وہ نام ہے جو کم از کم تین چار سو برس سے اس زبان کا رکھا گیا ہے۔ اس زبان کا ابتدائی نام ہندی یا ہندوستانی تھا۔ ہمارے ہم وطنوں نے ہندی کو ایک خاص زبان اور رسم خط کے معنوں میں لیکر ایسا مشہور کر دیا کہ یہ نام اس کے لئے خاص ہو گیا۔ اور اب دوسرا نام ہندوستانی باقی ہے۔ اگر اردو کو چھوڑ کر اس کے اصلی اور قدیم نام کو زبان زد اور عام نہ کیا گیا تو ؎

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے"۔[1]

شذرات ہی کے صفحات میں سید صاحب نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور اکابر اہل علم و قلم کا ماتم قلب وروح کی تڑپ اور شدت تاثیر کے ساتھ کیا ہے۔ ان وفیات کا مجموعہ "یادِ رفتگاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ادبی کتابوں پر تبصرے کے باب میں، ہم اس کا تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معارف کے شذرات اردو لٹریچر میں ایجاز و بلاغت اور حسن انشاء کا بہترین نمونہ ہیں۔ خصوصاً طنزیہ شذرات ادبی نشتر کا حکم رکھتے ہیں۔ ماجد صاحب نے درست لکھا ہے کہ "معارف کے شذرات نے بہتوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی"۔[2]

(۶)

سید صاحب نے جون ۱۹۴۳ء کے شذرات میں لکھا تھا:۔

"رسائل کی دنیا میں معارف کے بہت سے اولیات ہیں، جن میں سے ایک رسالہ کے مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرتا ہے"۔

مختلف ادوار میں مقتضائے وقت کے مطابق اس کے مستقل عنوانات یا بالفاظ سید صاحب

---

[1] معارف اگست ۳۵ء۔

[2] عبد الماجد: سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۹؍ جنوری ۵۴ء ص ۴۔

"مختلف ابواب" میں برابر تغیر ہوتا رہا۔ عموماً جو عنوانات شروع سے آج تک قائم ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

۱- باب التقریظ والانتقاد
۲- تلخیص وتبصرہ
۳- اخبار علمیہ
۴- آثار علمیہ وادبیہ
۵- ادبیات
۶- مطبوعات جدیدہ

ان میں پہلے عنوان کے تحت کسی اہم کتاب پر تفصیلی نقد وتبصرہ ہوتا ہے۔ ان تبصروں میں بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تنقیص وتعریض سے دور رہ کر خالص سنجیدہ اسلوب اور علمی انداز میں زیر تبصرہ کتاب کے محاسن وفروگذاشتوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ دوسرے عنوان "تلخیص وتبصرہ" کے ذیل میں عربی، فارسی یا انگریزی کے کسی ممتاز اہل قلم کے مضمون کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی اس پر مختصر مگر جامع تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ ان مضامین کا موضوع زیادہ تر عالم اسلام سے متعلق ہوتا ہے۔ دنیا میں اسلام کی نشر واشاعت اور مسلمانوں کے سماجی وتمدنی حالات پر خاص طور سے بڑے مفید اور معلومات افزا مضامین کی تلخیص معارف میں پیش کی گئی ہے۔ ان مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ "دنیا میں اسلام" کے نام سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔

"اخبار علمیہ" کا عنوان شروع میں کافی معلومات آفریں تھا۔ لیکن ؁۴۷ء کے بعد نہ معلوم کن اسباب کے باعث اس کو ختم کر دیا گیا۔ اس سرخی کے ذیل میں دنیا میں وقوع پذیر اہم خبروں پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ یا علمی وسائنسی خبریں درج کی جاتی تھیں۔ "آثار علمیہ وادبیہ" کے تحت مشاہیر علم وادب کے وہ خطوط شائع کئے جاتے ہیں۔ جو مدیر معارف کو علمی، دینی، اور ادبی مسائل سے متعلق وقتاً فوقتاً لکھے جاتے تھے۔ ان خطوط سے ایک طرف ان اہل علم کے طرز انشا کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف سید صاحب کی جامعیت، ہمہ گیری، وسعت فکر ونظر اور عظمت وشہرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اسی عنوان کے ذیل میں اکابر فضلاء عصر کی بعض

نادر و نایاب تحریریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ معارف کے سفینہ میں جن مشاہیر کے خطوط محفوظ ہو گئے ہیں ان میں ڈاکٹر اقبال، علامہ شبلی، مولانا آزاد، حالی، اکبر، مناظر احسن گیلانی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، اور خود سید صاحب کے نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہیں۔

معارف کا ایک مستقل عنوان جس سے اس کی طویل تاریخ کا شاید ہی کوئی شمارہ خالی ہو۔ ادبیات ہے۔ اس کے تحت شعراء کی شعری تخلیقات نظم ہو یا غزل پیش کی جاتی ہیں۔ صرف یہی ایک عنوان معارف کو اردو ادب میں نمایاں مقام دلانے کے لئے کافی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے شعراء کا کلام شائع ہوا جو بعد میں ملک کے چوٹی کے شاعر تسلیم کئے گئے۔ سید صاحب کا ذوق شعر و سخن چونکہ خود نہایت معیاری تھا اور وہ فن عروض پر دسترس کامل رکھتے تھے۔ اس لئے اشاعت کے لئے موصول ہونے والے کلام پر وہ ہر پہلو سے تنقیدی نظر ڈال کر شائع کرتے تھے۔ اسی لئے معارف میں شائع شدہ کلام کبھی مبتذل یا غیر معیاری نہیں مل سکتا، جن شعراء کو سید صاحب کی سند اعتبار اور معارف کا اعتماد حاصل کرنے کا فخر نصیب ہوا، ان میں سے کچھ اہم نام یہ ہیں:-

فراؔق گورکھپوری، نشوؔر واحدی، شاؔد عظیم آبادی، امجؔد حیدرآبادی، اثؔر صہباقؔی، جگؔر مرادآبادی، احسان دانشؔ، یحییٰؔ اعظمی، حفیظؔ ہوشیارپوری، روؔشن صدیقی، حسرؔت موہانی، اقبال سہیؔل، آثؔر لکھنوی، ثاقؔب کانپوری، حمیؔد صدیقی، شفیؔق جونپوری، فضا ابن فیضی، چندر پرکاش جوہؔر، جگن ناتھ آزادؔ۔

اسی طرح معارف میں اس مستقل عنوان کے تحت بہت سے ایسے شعراء کا کلام بھی ملتا ہے۔ جن کے علم و فضل نے ان کی شاعری کے ملکہ پر تسلط قائم رکھا اور وہ بحیثیت شاعر مشہور و متعارف نہ ہو سکے۔ مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، حسرؔت، عبد السلام ندوی شمیؔم، نواب علی حسن خاں طاہؔر، عبد الماجد دریابادی، ضیاء احمد بدایونی، آل احمد سرور، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، نواب مزمل اللہ خاں مزمؔل اور اختر علی تلہری۔ معارف میں شائع شدہ ان لوگوں کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن شاعری کی باریکیوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔

ادبیات میں شائع ہونے والے کلام کی تاریخی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اُردو شاعری پر

کام کرنے والے محقق کو بہت سے نامور شعراء کے کلام میں ترتیب زمانی قائم کرنے اور ان کے فکری ارتقاء کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔

"مطبوعات جدیدۃ" کے تحت عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں شائع ہونے والی نئی کتابوں پر مختصر مگر جامع تبصرے کئے جاتے ہیں۔ معارف کے تبصرے اپنے توازن اور علمی انداز کے لئے ممتاز ہیں۔ یہ مستقل عنوان معارف کے اجراء سے برابر جاری ہے۔ ابتداء میں خود سید صاحب کتابوں پر تبصرے لکھتے تھے۔ پھر دوسرے رفقائے دار المصنفین نے اس فرض کو انجام دیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معارف کا آغاز کچھ ایسے حسن اخلاص و نیت کے ساتھ اور ایسے مبارک مہینہ (رمضان المبارک) میں ہوا کہ اس کی روشنی سے دنیائے علم آج تک منوّر ہے سید صاحب نے اس رسالہ کے ذریعہ دین و مذہب، علم و فن، ملک و ملّت اور اردو زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں۔ کم از کم ہندوستان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی اس رائے سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ:۔

> "آئندہ مورّخ کا قلم جب ہندوستان کی علمی و دینی صحافت کی تاریخ لکھے گا تو اسے معارف کو چار و ناچار ایک بلند و ممتاز مرتبہ اور ایک سنگ میل کا امتیاز دینا ہوگا اور بتانا ہوگا کہ اس شمع نے ملّت کے کتنے اندھیرے گھروں میں اُجالا پھیلایا۔ اور پھر اس ایک چراغ سے کتنے اور چراغ جلائے گئے۔"[1]

---

[1] عبدالماجد دریابادی: سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے (مضمون) صدق جدید لکھنؤ ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء ص ۴

باب ہشتم

اُسلوب

علامہ سید سلیمان ندوی نے اردو اسالیب بیان کی جن روایات اور ورثہ کی بنیاد پر اپنے انفرادی اسلوب کا محل تعمیر کیا اس کا باقاعدہ اور منظم آغاز تو سر سید کی ادبی تحریک سے ہوتا ہے۔ لیکن خود سر سید کے ادبی اجتہادات بھی بذات خود جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز نہیں بلکہ اس تدریجی عمل ارتقاء کا ایک اہم سنگ میل یا انقلاب آفریں موڑ تھے۔ جن کا سلسلہ اجتماعی یا انفرادی طور پر انیسویں صدی کے نصف اول میں برابر جاری رہا۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی ادبی خدمات ہوں یا اس کے باہر سید انشاء، ماسٹر رام چندر اور مرزا غالب کی اردو زبان کو سلیس اور عام فہم بنانے کی مساعی مشکورہ۔ اس سے قبل ظہوری و بیدل کے طرز نگارش کی تقلید یا بقول غالب "محمد شاہی روش" کی پیروی کو کمال انشاء کا معیار خیال کیا جاتا تھا، شاعرانہ التزامات، سجع و قوافی کی پابندی، مرصع کاری، عبارت آرائی اور ادق فارسی و عربی الفاظ و تراکیب کا امتزاج اردو نثر ان تمام زیورات کے بغیر اپنے حسن کی نمائش نہیں کر سکتی تھی۔ ملک کا مقبول عام رجحان یہی تھا

یہ صحیح ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریزی سیاست کا ایک حربہ تھا اور اس کی ادبی خدمات کی پشت پر کوئی جذبۂ خلوص کارفرما نہیں تھا۔ بایں ہمہ شر میں خیر کے اس پہلو سے صرف نظر ممکن نہیں کہ مصنفین کالج کے اس اجتہاد اور "جرأت اندیشہ" سے اردو نثر ایک ایسے عہد میں نئے موڑ سے روشناس ہوئی جب روایت سے بغاوت بڑے دل گردے کی بات تھی۔[1] آگے چل کر ادبائے فورٹ ولیم کالج کے اسلوب نے علمی تحریروں کے لئے

---

[1] یہی سبب ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے تمام مصنفین (باستثنا میر امن) باحسن وجوہ سلیس نگاری کے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے کہ اس عہد کا تمام ماحول سر تا پا فارسی آمیز پر تصنع اردو کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

راہ ہموار کی، اور جب اردو ادب میں مقصدیت، سماجی رجحانات، اور وقت کی دھڑکنوں کو سمونے کا میلان نمایاں ہوا تو نثر کی یہ سلاست اور فطری انداز بہت کام آیا۔[۱]

ماسٹر رام چندر (متوفی نامعلوم سنہ) دلی کالج کے پروردہ ایک عبوری عہد کے ادیب تھے انھوں نے اپنے رسائل فوائد الناظرین اور محب ہند کے ذریعہ سادہ اور آسان زبان لکھنے کا علمی لوگوں کی توجہ مبذول کرائی اور خود بھی عام فہم وسلیس اردو میں مضامین لکھ کر اس کا علمی نمونہ پیش کیا۔ ان کی نثر نگاری کا دائرہ فلسفہ، جغرافیہ، سائنس اور تاریخ کے مباحث تک وسیع تھا۔ اس کے باوجود کہ ماسٹر رام چندر کے اسلوب میں نئی زندگی کی آہٹیں صاف سنائی دیتی ہیں ان کا طرز انشاء، قدیم انداز نثر سے کلی طور پر اپنا دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔ تاہم ان کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے نثر کے ایک نئے اور عمومی معیار کا تعین اور اسے تسلیم کرانے میں سب سے اہم حصہ لیا ہے۔[۲]

اسی عہد میں مرزا غالب (متوفی ۱۸۶۹ء) مطلع ادب پر طلوع ہوئے اور اپنے اردو خطوط کے ذریعہ زبان کی سادگی اور صفائی کا ایک نادر نمونہ پیش کیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ غالبؔ بھی رجحان زمانہ کے باعث طرز بیدلؔ ہی کے اسیر تھے، اور اسی لئے اپنے فارسی ذخیرہ نظم ونثر کو "نقش ہائے رنگا رنگ" سمجھتے تھے پھر جب عہد پیری میں اضمحلال ذہنی اور دماغی سہل انگاری کے باعث بدرجہ مجبوری اردو میں خطوط نگاری شروع کی تو اسے نہایت حقارت سے "مجموعۂ بے رنگ" کہا کرتے تھے۔ لیکن یہی خطوط جدید اردو نثر کی تاریخ میں منارۂ نور بن گئے اور اور پھر اس سے کسب ضیاء کر کے "تہذیب الاخلاق" کی تحریریں سورج کی روشنی کی طرح پھیل گئیں۔[۳]

خطوط غالب کے منصۂ شہود پر آتے ہی سر سید کو ایک نئی زمین اور نئے آسمان کا

---

[۱] سید جعفر: ماسٹر رام چند اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا حصہ ص ۹۴ (بار اول ۱۹۶۰ء)۔

[۲] صدیق الرحمٰن قدوائی: ماسٹر رام چندر ص ۱۴۳ (ادبی پریس بمبئی۔ اشاعت بار اول ۱۹۶۱ء)۔

[۳] ڈاکٹر عبدالقیوم: حالی کی اردو نثر نگاری ص ۲۴۹ (مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۳ء)۔

احساس ہوا[1] اور غالب نے اردو نثر میں جو روش بجبر ڈگراہ اختیار کی تھی[2] سرسید نے اس کو ایک منظم ادبی تحریک کا رخ عطا کیا۔ اس سے قبل وہ بھی تقلید گذشتگاں میں مرصع سازی کی دکان آراستہ کئے ہوئے بندش الفاظ و تراکیب کے نگینے جڑا کرتے تھے۔ جس پر آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن (۱۸۴۷ء) شاہد ہے[3] لیکن پھر وقت کے تقاضوں، مغربی اثرات اور نثر غالب کے زیر اثر سرسید اس "روایتی تنگنائے اسلوب" سے نکل آئے۔ اور سادہ، سلیس اور مدلل اسلوب بیان اپنا کر جدید اردو نثر کی داغ بیل ڈالی۔

سرسید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) کو اردو نثر کے ارتقا میں بڑی اہم اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر زور "اس رسالہ کا اجرا اردو اسالیب بیان کی ترقی کے لئے ایک تازیانہ تھا"،[4] سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں قدیم اسلوب کے نقائص سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "علم و ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوتی ہیں ـــــ پس اس طرز تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے۔ اور ہم کو جھوٹی و بناوٹی تحریر کا عادی بنا دیا ہے۔[5]"

---

[1] غالب کی اردو نثر دراصل اپنی جگہ ایک عظیم تجربہ تھا مدعا نگاری، ذاتی تجربات کی روح، شوخی و بانکپن، طبیعت کی ندرت پسندی، شاعرانہ فکر و تخیل کی رنگ آمیزی اور شخصیت کے پرتو نے ان کی نثر کو عدیم المثال ادبی حسن عطا کیا ہے۔ [2] ڈاکٹر محی الدین قادری زور: اردو کے اسالیب بیان ص ۵۶ (مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد ۳۴ھ)۔

[3] کہا جاتا ہے کہ آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن سرسید نے اپنے قلم سے نہیں لکھا تھا بلکہ مواد یکجا کر کے اس عہد کے مشہور فارسی داں امام بخش صہبائی سے لکھوایا تھا۔ لیکن پھر دوسرا اڈیشن خود سادہ و سلیس زبان میں لکھا ہے۔

[4] محی الدین قادری زور: اردو کے اسالیب بیان ص ۶۲۔

[5] مقالات سرسید مرتبہ عبد اللہ خویشگی ص ۴۵ (نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ)۔

سرسید کے یہ خیالات کاریگرانِ نثر کی مرصع نگاری کی تنقید بھی ہیں اور جدید اسلوبِ بیان کے لئے دستور العمل بھی۔ وہ ایک دوسرے مضمون میں اپنے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ”جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (یعنی تہذیب الاخلاق) کے ذریعہ کوشش کی، مضمون کی ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے (جو تشبیہات و استعارات سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا) پرہیز کیا۔ تُک بندی سے جو زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔ تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے[1]،،

اقتباساتِ بالا سے سرسید کے تصورِ اسلوب کے ساتھ ان کے منفرد اسلوبِ بیان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک سرسید کی نثر تین اہم خصوصیات کی حامل ہے۔ سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی، اور مدعا نویسی۔ ان ہی محاسن کو حالی نے ”نیچرل طرزِ بیان،، سے تعبیر کیا ہے[2] ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ ”مدعا نگاری میں انہماک نے سرسید کے اسلوب میں بعض جگہ بدویت اور کھردرا پن پیدا کر دیا ہے۔ تاہم ان کے بیان کی تاثیر و دلکشی اور شدتِ اخلاص سے انکار نہیں کیا جا سکتا[3]،،

---

[1] مقالاتِ سرسید مرتبہ عبداللہ خویشگی ص ۲۲۷۔

[2] مولانا حالی: حیاتِ جاوید ج ۲ ص ۳۹۸ (نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء)۔

[3] سید عبداللہ: اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۱۱۹ (لاہور ۶۸ء)۔

اردو ادب میں سرسید اور تہذیب الاخلاق کے کارنامے اتنے اہم اور دور رس اثرات رکھتے ہیں کہ ان سے ادب کا ایک مستقل دبستان وجود میں آگیا۔ جس کے خصائص میں مقصدیت، مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اسلوب میں سادگی، بیساختگی اور مطلب نگاری اس دبستان نثر کا ایک بنیادی وصف ہے۔ جس کا عکس حالی، نذیر احمد، ذکاءاللہ چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک اور شبلی کے یہاں نمایاں ملتا ہے۔

نذیر احمد (متوفی ۱۹۱۲ء) خالص دہلی کی زبان اور روزمرہ و محاورے کے بادشاہ تھے۔ ان کے طرز بیان میں صفائی، وضاحت، روانی اور بے ساختگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ مگر یکسانیت اور ہمواری مفقود ہے۔ ایک ہی تحریر میں کہیں مغلق و پیچیدہ عربی الفاظ و تراکیب لکھتے ہیں اور دوسری جگہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ لکھدیتے ہیں[1] وہ رہنے والے تو بجنور کے تھے لیکن ان کی طباع و ہمہ گیر شخصیت نے دہلی کے گھریلو روزمرہ، زنانہ انداز بیان اور ظریفانہ زبان میں بڑی پختگی حاصل کرلی تھی۔ اور یہ خصوصیات ان کے اسلوب میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ رفتہ رفتہ ان کو یہ احساس ہی نہیں رہا کہ یہ طرز تحریر ہر موضوع کے لئے موزوں نہیں ہے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے جب اپنے اسی منفرد اسلوب میں قرآن کا ترجمہ کیا اور دوسری مذہبی کتابیں لکھیں تو ناخوشگواری اور غیر موزونیت پیدا ہوگئی۔ مثلاً ان کی مذہبی تصنیف "الحقوق وَالفرائض" میں جس کا موضوع نہایت متانت اور سنجیدگی کا طالب تھا یہ جملہ:

> "کسی نے کیا اچھی تلی ہوئی باون تولے پاؤرتی کی بات کہی ہے کہ
>
> من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"

نہایت مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ اسی باعث نقادوں نے نذیر احمد کے اس طرز کو ابتذال و سوقیت کا نام دیا ہے[2]

مولانا حالی (متوفی ۱۹۱۴ء) کا اسلوب تحریر سرسید کے طرز سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن سرسید کی تحریروں میں جس کرختگی، بے رنگی اور بدویّت کا احساس ہوتا ہے، حالی کی نگارشات

---

[1] حامد حسن قادری: داستان تاریخ زبان اردو ص ۴۰۵ (اشاعت دوم آگرہ ۵۴ء)۔

[2] سعید احمد انصاری: اردو کا بہترین انشاپرداز ص ۷ (الناظر پریس لکھنؤ ۳۴ء)۔

اس سے پاک ہیں۔ حالی طبعاً نہایت متین و سنجیدہ اور بقول مہدی افادی "خوش صفات" انسان تھے، شرافت النیت، نفاست، محبت سادگی اور سلامت روی ان کی شخصیت کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ اور ان صفات کا عکس ان کے اسلوب میں واضح طور پر نظر آتا ہے وہ ایک بہت بڑے مدّعا نگار تھے۔ حالی کی ادبی سوانح عمریوں (حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب) کی ایک ایک سطر ان کی مذکورہ بالا صفات عالیہ کے آبدار موتیوں سے جھل جھل کرتی ہے۔

بعض لوگوں کو حالی کی نثر روکھی پھیکی، بے مزہ اور اکتا دینے والی معلوم ہوتی ہے[1] کیونکہ ان کے یہاں جوش و خروش کے مواقع بہت کم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نذیر احمد کی طرح ان کی تحریر سیلابی اور سیلانی نہیں۔ آزاد کی طرح حسین و رنگین نہیں اور نہ شبلی کی طرح رعنائی، دلکشی اور دل آویزی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ حالی کی سادگی میں جو پرکاری و نفاست اور سلامت میں لطافت ہے۔ ان کا ان کے معاصرین میں فقدان ہے[2] وہ بلاشبہ استعارات و تشبیہات سے مرعوب نہیں کرتے۔ خطابت کی گرمی اور زبان کی چاشنی پیدا نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں الفاظ کی بازی گری کے بغیر کہتے ہیں۔ جو طبیعتیں آزاد کی صناعی نذیر احمد کے روزمرہ اور شبلی کی رنگینی کی خوگر ہیں انھیں یقیناً حالی کے اسلوب میں خشکی کا احساس ہوگا[3] مگر حالی نے اپنے اسلوب کے اس خلا کو اپنے بے پناہ اخلاص سے پر کر دیا ہے۔

منشی ذکاء اللہ (متوفی ۱۹۱۰ء) کو ادبی حیثیت سے تو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی لیکن اردو اسالیب نثر کے ارتقا میں صفائی اور تفصیل و تجزیہ کے عناصر پیدا کرنے میں ان کی مختلف الموضوعات تصنیفات و تراجم کا بڑا حصہ ہے۔ وہ غور و فکر اور تلاش و تحقیق کے شائق تھے۔ اس لئے ان کے اسلوب میں جوش اور پرواز تخیل کا دور دور نشان نہیں ملتا۔ مولوی چراغ علی (م ۱۲ء) سرسید کی ادبی تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ انھوں نے اسلامی، تاریخی اور اقتصادی مسائل پر بڑی ضخیم و کثیر کتابیں اور رسائل تالیف کئے ہیں۔ ان کا طرز تحریر سرسید سے زیادہ صاف

---

[1] سعید احمد انصاری: اردو کا بہترین انشا پرداز ص ۷ (الناظر پریس لکھنؤ ۳۲ء)۔

[2] حامد حسن قادری: داستان تاریخ زبان اردو ص ۵۵۱۔

[3] صالحہ عابد حسین: یادگار حالی ص ۲۰۷ (جید پریس دہلی)۔

رواں اور بامحاورہ ہے[1] نواب محسن الملک (متوفی ۱۹۰۷ء) نے ادیب کی حیثیت سے زیادہ شہرت نہیں پائی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ دلکش اور برجستہ انداز نگارش پر قادر تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ چند مذہبی کتابوں کے علاوہ ان کی ادبی یادگار تہذیب الاخلاق کے مضامین اور خطوط ہیں۔ ان میں ایک خاص شان ادب پائی جاتی ہے۔ جوش و خلوص ان کی تحریر کے نمایاں عنصر ہیں، اسلوب نہایت سادہ، صاف، سنجیدہ، مدلل اور مؤثر ہے[2] نواب وقار الملک (متوفی ۱۹۱۷ء) بھی اچھے ادیب تھے، بے خوفی، ملی جوش، عالمانہ وقار اور عربیت ان کے طرز کے امتیازی خصائص تھے۔ انھوں نے کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی مگر تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی موضوعات پر مضامین لکھے۔

حلقہ سرسید سے باہر کے نثر نگاروں میں محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب اور جادو نگار انشا پرداز تھے۔ انھیں صوتی آہنگ سے اپنی نثر کو حسن عطا کرنے اور شاعرانہ فقروں و استعاروں سے اسے زرنگار بنانے پر خاص دسترس حاصل تھی۔ اس منفرد اور سحر آفریں اسلوب میں وہ بقول شبلی "گپیں بھی ہانک دیتے ہیں تو وحی معلوم ہونے لگتی ہیں"۔ آزاد کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات تخئیل آرائی، نازک خیالی، شوخی و رعنائی، تکلف و تصنع، کثرت تشبیہہ و استعارہ اور محاکات پسندی ہیں[3] لیکن اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ افسانوی رنگ ہر موضوع کی مخصوص فضا کے لئے سازگار اور موزوں نہیں معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود آزاد کا مؤرخانہ پایہ ان کے اسی رنگین و شاعرانہ اسلوب کے باعث مجروح ہوگیا ہے۔ نیرنگ خیال اور قصص ہند کے خیالی رنگ کے اسلوب کو دربار اکبری اور آب حیات میں استعمال کرنے سے ان کی تاریخی تحقیقی واقعیت و اصلیت پر شکوک و شبہات کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر سخندان فارس میں فارسی زبان کے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی

---

[1] حامد حسن قادری: داستان تاریخ زبان اردو ص ۳۷۷۔

[2] محی الدین قادری: اردو کے اسالیب بیان ص ۸۴۔

[3] حامد حسن: داستان تاریخ زبان اردو ص ۳۹۸۔

> بھی امیدوار آئی ۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا۔ بلکہ ذوق وشوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیئے ۔“

محمد حسین آزاد کے مخصوص طرز تحریر کا مذکورہ بالا اقتباس یہاں نمونے کے طور پر اس لئے نقل کیا گیا کہ علامہ سید سلیمان ندوی اپنے اسلوبی تشکیل کے عہد آغاز میں سخندان فارس کے مطالعہ کے بعد اس کے اسلوب کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ خود ہی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ :

> ”۱۹۰۷ء میں شمس العلماء آزاد دہلوی کی سخندان فارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا۔ ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے[1]“

مگر اس طرز کا نباہنا اختلاف مزاج وشخصیت کے باعث ان کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے پھر شبلی کے طرز کی طرف مائل ہو گئے۔

مولانا عبدالحلیم شرر (متوفی ۱۹۲۶ء) پہلے انشاپرداز ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر اردو زبان میں ناول نگاری کا آغاز کیا۔ یوں تو انھوں نے دوسرے تاریخی و ادبی موضوعات پر بھی جولانی قلم صرف کی ہے۔ لیکن اختصاصی حیثیت ان کی ناول نگاری کو ہی حاصل ہوئی۔ انھوں نے بڑی کثرت سے تاریخی ومعاشرتی ناول لکھے ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے انھیں اردو کا رچرڈسن قرار دیا ہے[2] شرر کا اسلوب بیان شگفتہ ودلکش ہے۔ ان کے ہاں جوش وجذبہ کی نمود بھی ملتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ناولوں میں اکثر کوئی قصہ بیان کرتے کرتے ضمناً انسان اور فطرت کے متعلق اس جوش وادبیت کے ساتھ خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے جملے تیر کی طرح دل میں اترنے لگتے ہیں[3] غالباً اسی باعث سید سلیمان ندوی نے جب پندرہ سال کی عمر میں

---

[1] سید سلیمان ندوی : میں جن سے متاثر ہوا۔ (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۲

[2] محی الدین قادری زورؔ: اردو کے اسالیب بیان ص ۸۶

[3] محی الدین قادری زورؔ: اردو کے اسالیب بیان ص ۸۶

شرر کا ناول منصور موہنا پڑھا تو اسے ختم کرتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دئے[1]

اسی لئے علامہ سید صاحب کے ذوق ادب نے جب قلم چلانا شروع کیا تو اس پر سب سے پہلا نقش شرر کے طرز تحریر کا قائم ہوا۔ خود لکھتے ہیں:

> ”اردو ادب کی پہلی کتاب منصور موہنا میرے ہاتھ آئی۔ اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا[2]“

سید صاحب نے ۱۹۰۴ء میں رسالہ الندوہ کے لئے اسی رنگ تحریر میں علم حدیث اور منطق پر دو مضمون لکھے۔ اور جب مضامین چھپنے سے پہلے مولانا شبلی کی نظر سے گذرے تو بقول سید صاحب:

> ”پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دے کر باقی رکھا اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی، نکال ڈالا[3]“

(۲)

علامہ سید سلیمان ندوی کی نثر و انشا اپنا انفرادی رنگ اختیار کرنے سے پہلے تشکیل و نشو و نما کے مختلف مراحل سے گذری ہے۔ سید صاحب کبھی عبدالحلیم شرر کے جذبات انگیز اسلوب سے متاثر ہوئے اور کبھی محمد حسین آزاد کی رعنائی بیان سے مسحور۔ کبھی اپنے مربی و استاد علامہ شبلی کے در پر جبہ سائی کی اور کبھی ابوالکلام آزاد کے خطیبات اور پر جوش طرز تحریر کے اسیر ہو کر اس رنگ کو اتنی حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ نباہا کہ لوگوں کو سید صاحب کی بعض تحریروں پر ابوالکلام کا شبہ ہی نہیں یقین تک ہونے لگا۔ مذکورہ اسالیب بیان میں سے اول الذکر دو تو محض وقتی و عارضی اُبال کا نتیجہ تھے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا۔ لیکن مؤخر الذکر دو (شبلی و ابوالکلام) اسالیب کے اتنے گہرے نقوش سید صاحب کے طرز تحریر پر مرتسم ہوئے کہ آخر تک ان سے دامن چھڑاتے چھڑاتے بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی رہ گیا ہے۔

---

[1] سید سلیمان ندوی: میں جن سے متاثر ہوا (مضمون) معارف جولائی ۵۰ء۔

[2] ایضاً 〃 〃

[3] ایضاً 〃 〃

علامہ شبلی کے دلکش اسلوب نگارش کا رنگ سید صاحب کے ہاں اس لئے بھی چھایا ہوا ہے کہ ان کی علمی و ادبی نشو و نما تمام تر شبلی ہی کے سایۂ تربیت میں ہوئی تھی۔ ایک مضمون میں سید صاحب نے اپنے اسلوب کے ارتقاء پر خود ہی روشنی ڈالی ہے۔ شرر اور آزاد کے طرز تحریر سے وقتی طور پر متاثر ہونے کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں :

> "....... ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آنا پڑا کیوں کہ علمی مضامین کے لئے ان کے طرز تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرز کار آمد نہیں۔ اس لئے بار بار ان سے اصلاحیں لیں۔ ان کی ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی تو علمی زندگی کا ایک نہج، تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا...."
>
> "جب ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام نے اپنا اخبار الہلال نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا۔ اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے .... لیکن معارف میں آکر الہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا ہے۔"
>
> "لیکن بہرحال چند روز ادھر اُدھر بہک کر پھر اسی راستے پر آ گیا جس پر استاذ مرحوم نے لا کر مجھے کھڑا کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی میں اپنے جانتے ان کے طرز کو نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔"[1]

---

[1] سید سلیمان ندوی : میں جن سے متاثر ہوا (مضمون) مشمولہ رسالہ معارف جولائی سنہ ۵۰ء ص ۶ ...

ذیل میں شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد کے منفرد اسلوب نگارش کی بنیادی خصوصیات کے اجمالی ذکر کے بعد سید صاحب کی نثر پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی جائے گی اس کے بعد پھر سید سلیمان ندوی کے انفرادی رنگ کو نمایاں کیا جائے گا۔

علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے علمی و ادبی اکتسابات کا دائرہ مذہب و تاریخ، تذکرہ و سوانح، کلام و عقائد، ادب و تنقید شعر و سخن اور سیاست و معاشرت جیسے متنوع موضوعات تک وسیع تھا، لیکن ان کا کمال یہ ہیکہ ہر موضوع پر خامہ فرسائی کرتے وقت ادبیت کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ وہ نثر اردو کے فلک رفعت ایوان کے ایک اہم ستون تھے۔ سرسید نے معدن ادب سے جدید اردو نثر کا جو خام ہیرا برآمد کیا تھا آزاد، حالی اور نذیر احمد نے اسے جلا اور تابناکی عطا کرنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن اس ہیرے کو جس نے کوہ نور بنا دیا وہ بلاشبہ شبلی ہیں۔ ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو اسالیب نثر کی ایک طویل روایت اور سلسلہ کا عطر اپنے منفرد اسلوب میں سمولیا ہے۔ اسی باعث خود جدید اردو نثر کے ابوالآبا سرسید کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

> "ایسی صاف شستہ اور برجستہ زبان پر دلی والوں کو بھی رشک آتا ہوگا[1]"

یوں تو شبلی کی نثر میں دبستان سرسید کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سادگی، برجستگی، بے ساختہ پن، استدلال اور منطقیت وغیرہ، مگر انشائے شبلی کی اہمیت اس کے چند انفرادی محاسن کے سبب ہے۔ اس منفرد اسلوب کے بنیادی عناصر ترکیبی یہ ہیں۔ وثوق و اعتماد، احساس عظمت، شعریت، ایجاز و جامعیت، قوت و جوشِ بیان، وقار و متانت، شستگی و برجستگی، لطیف استعارات، طنز۔

شبلی کی تحریروں میں جو وثوق و یقین، قوت اور جوشِ بیان پایا جاتا ہے۔ اس کا سرچشمہ دراصل ان کے نسلی اثرات سے پھوٹتا ہے۔ وہ نسلاً راجپوت تھے۔ اس لئے راجپوتوں

---

[1] سرسید: دیباچہ المامون مصنفہ شبلی ص ۳ (افضل المطابع دہلی)۔

کی زود حسی، غیرت و حمیت، احساس عظمت و کمال اور جذبات فخر و برتری وغیرہ کی شخصیتی خصوصیات کا عکس ان کے اسلوب میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ جس کے باعث ان کی نثر میں بڑی توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ احساس فخر و کمال کا جلوہ شبلی کے طریقہ ہائے خطاب میں بہت واضح ہے مثلاً "تم جانتے ہو"، "تم قیاس کرو"، "تم نے دیکھ لیا" وغیرہ کا طرز تخاطب ان کی تصانیف میں کثرت سے ملتا ہے۔

وہ مؤثر سے مؤثر واقعات اور وسیع سے وسیع مفہوم کو نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اور اس اختصار و جامعیت کے باعث زور و اثر پورا قائم رہتا ہے۔ مثلاً ہجرت کی داستان کتنی پُر اثر اور دل آویز ہے۔ لیکن اس کو چند جملوں میں اس طرح بیان کر دیا ہے۔

> "آفتاب کی روشنی دور پہونچ کر تیز ہوتی ہے۔ شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔ آفتاب اسلام طلوع مکہ سے ہوا۔ لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں[1]۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ شبلی کے حیرت انگیز ایجاز کی کامیابی کا راز لطیف استعارہ، برجستہ محاورہ بندی اور پُرجوش مبالغہ میں مضمر ہے[2]۔

شبلی کے مزاج میں شاعری کا رنگ رچا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنی نثر میں بھی شاعرانہ فضا قائم کر دیتے ہیں۔ لیکن انشائے شبلی کی شعریت و رنگینی محمد حسین آزاد سے بہت مختلف ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں غزل کی ایمائیت، فارسی کے شیریں و دلکش الفاظ و ترکیبیں اور ایک خاص قسم کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ ان کی فارسی تراکیب میں شباب، شراب، بہار، موسم گل، مستی، بے خودی اور رنگینی و رعنائی کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں[3]۔ وہ شگفتہ، جذبات انگیز اور حسین الفاظ اپنی نثر میں بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اور مثنی حروف اور الفاظ کی تکرار سے ایک خاص قسم کی صوتی فضا، لَے اور موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں۔

شبلی کی نثر وقار و متانت کی اعلیٰ مثال ہے۔ بقول ڈاکٹر عبداللہ "اس علمی وقار اور

---

[1] شبلی: سیرت النبی جلد اول ص ۲۴۰ (طبع سوم)۔

[2] سید عبداللہ: شبلی کا اسلوب بیان (مضمون) مشمولہ ادیب شبلی نمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۳۶۔

[3] ایضاً وبحث ونظر ص ۱۳۵۔

فاضلانہ رعب داب سے قاری پر بڑا اثر پڑتا ہے [1]" ، صفائی ، شستگی ، اور بے ساختگی کے اوصاف اگرچہ دبستان سرسید کی نثر کے مشترک امتیازات ہیں ۔ لیکن شبلی کے یہاں بے ساختگی کے ساتھ چستی اور صفائی و شستگی کے ساتھ بھرپور ادبی چاشنی کا امتزاج ہے ۔ عربی کے فاضل اور فارسی شعر و ادب کے ماہر ہونے کا باوصف وہ اپنے اسلوب میں ثقیل و نامانوس الفاظ کے روڑے نہیں اٹکاتے بلکہ ان کی عبارتیں حسین سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔

ان تمام ادبی محاسن کے ساتھ شبلی کے طرز بیان میں طنز و تعریض کا ایک لطف انگیز انداز پایا جاتا ہے ۔ جس کی بے پناہ نشتر زنی عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہے ۔ اس میں شوخی ، برجستگی اور جذبات انگیزی کے عناصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں ۔ طنز کے اس فن میں وہ بالکل منفرد ہیں ان کے طنز کا سب سے زیادہ مؤثر اور کامیاب رُخ "یورپ کے بے درد مؤرخین اسلام" کے خلاف ہے ۔ اور اس کا دوسرا نشانہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے ۔ طنز کے اس امتیاز خاص میں رفقائے سرسید میں سے کوئی ان کا مثیل نہیں ہے ۔ البتہ شبلی کے تلامذہ مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ پر اس کا خاص اثر پڑا ہے ۔

انشائے شبلی کے مذکورۃ الصدر محاسن کی حسین توس قزح سیرۃ النعمان سے لیکر سیرۃ النبی تک ہر تحریر میں یکساں جلوہ آرا ہے ۔ مثال کے طور پر سیرۃ النبی میں "ظہور قدسی" کے عنوان سے ولادت نبوی کا جو بیان لکھا ہے وہ جوش و ولولہ ، جذبات انگیزی ، زور بیان ، شعریت ، ایجاز اور کمال انشا کی معراج ہے ۔ اس ادبی شہ پارے میں چمنستان دہر ، نادرۂ کار ، پیر کہن سال دہر ، صبح جاں نواز دور فرخ فال ، قصرہائے فلک بوس ، اوراق خزاں دیدہ وغیرہ کی دل آویز اور خوشگوار فارسی ترکیبوں سے قاری پر ادبی مسرت و اہتزاز کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ خلاصہ یہ کہ شبلی کو ادب میں جو مقام حاصل ہوا اس کی بنیاد علمی بھی ہے اور ادبی بھی ۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی انشاء اور حسین اسلوب ہے ۔ اور پھر اسلوب میں بھی ان کے زہریلے اور چبھتے ہوئے طنز ان کی نثر کے وہ شاہکار ہیں جن کی زندگی زبان اردو کے دامن حیات کے ساتھ وابستہ ہے ۔

---

[1] سید عبداللہ : اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱۱ ص ۶۵۴ (لاہور ۶۹ء) ۔

مولانا ابو الکلام آزاد (المتوفی ۱۹۵۸ء) نے غالب کی طرح نہ صرف زندگی کے ہر شعبہ میں تقلید اور روشِ عام سے گریز کیا بلکہ تحریر کے میدان میں بھی عام ڈگر سے الگ ہٹکر اپنی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ وہ ایک شعلہ بیاں خطیب اور آتش نوا سیاسی لیڈر تھے، اس لئے ان کے انداز نگارش میں بھی جذبات کی تندی و تیزی کا خطیبانہ انداز عنصر غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو ان کا انداز تحریر الہلال سے غبار خاطر تک ارتقا کی مختلف منزلوں سے گذرا ہے۔ لیکن ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق صرف الہلالی اسلوب کو ہے۔ کیوں کہ ایک زمانے میں علامہ سید سلیمان ندوی کا اسلوب اسی کے طرز انشاء سے متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا آزاد کے منفرد اسلوب کا نہایت کامیاب تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس مخصوص طرز تحریر میں مولانا کی رومانی تخیل کے علاوہ افغانی اور عبدہٗ کا صحافتی انداز، شبلی کے جمالیاتی ذوق، سرسید کی اصلاحی تحریک اور محمد حسین آزاد کے استعارات وتشبیہات کی کارفرمائی کے ساتھ قرآن اور انجیل کے لب ولہجہ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے مختلف کیاریوں سے پھول توڑے ہیں۔ مگر سب کو ملا کر ایک ایسا حسین اور خوبصورت گلدستہ تیار کیا ہے۔ جس پر ان کی انفرادیت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس گلدستہ کے پھولوں کو اگر الگ الگ کر دیا جاتا تو اس کے اندر شاید وہ تاثر نہ پیدا ہوتا جو مولانا نے سب کو یکجا کر کے پیدا کیا تھا۔ العروۃ الوثقیٰ کے جذباتی اتار چڑھاؤ سے پُر خالص خطیبانہ اور مرعوب کن لب ولہجہ، شبلی کے فارسی وعربی مذاق کے ساتھ آرٹ موسیقی اور جمالیات سے وابستگی محمد حسین آزاد کی آب حیات اور نیرنگ خیال کی گونج کیساتھ ساتھ قرآن کا خداوندی لب ولہجہ۔ ان سب کا اتنا حسین اور متوازن امتزاج مولانا کے طرز تحریر میں نمودار ہوا تھا جو ان کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکا[1]"

---

[1] ملک زادہ منظور احمد: ابوالکلام، فکر وفن ص ۱۹۶ (نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۹ء)۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں مسلمانوں کے لیے جہادِ زندگانی میں یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت فاتحِ عالم کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی ہیں۔ ان کے ہر ہر لفظ سے خلوص و صداقت کا چشمہ ابلتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں جذبات و خیالات کا جو سیلاب امڈا ہے اسے متناسب الفاظ کے ذریعہ ایک زبردست طوفان بنا دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں اسی طوفان جذبات کے باعث وہ فوق فطری زور پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی انشاء محض انشاء یعنی لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار ہے۔ ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک اٹھتا ہوا طوفان، اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے۔ یہ ایک عصائے موسوی ہے جو افعی بن کر ہر شئے کو نگل جاتا ہے۔" [1]

الہلال میں مولانا آزاد کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نہ معلوم ان کے دماغ میں پرزور، پرہیبت اور پررعب الفاظ کے کتنے خزانے پوشیدہ تھے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ وہ متوازن فقروں کی تکرار اور ہم قافیہ الفاظ کی فراوانی سے اپنی تحریروں میں ایک طلسم پیدا کر دیتے ہیں۔ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ اور بھاری بھرکم تراکیب سے گرانبار ہونے کے باوجود نہ تو ان کے اسلوب کی روانی میں کمی آتی اور نہ اس کی شگفتگی و دلکشی ہی میں۔ [2]

(۳)

سید سلیمان ندوی کی نثر و انشا پر سب سے گہرے اور دیرپا اثرات علامہ شبلی کے طرز کے پڑے تھے۔ اس کا سبب سطور بالا میں خود سید صاحب کی ایک دستاویزی تحریر کی روشنی میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سید صاحب کے قلم نے شبلی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اور کامل آٹھ سال تک اس کی رہنمائی میں سبک خرام رہا۔ مزید برآں انھوں نے بقول خود "شبلی کی ایک ایک

---

[1] کلیم الدین احمد: سخنہائے گفتنی ص ۱۲۰ (ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ء)۔

[2] مالک رام: ابوالکلام کی صحافت (مضمون) مشمولہ ابوالکلام آزاد، احوال و آثار مرتبہ مسعود الحسن عثمانی ص ۸۴ (نامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء)۔

تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی تھی"۔ اس لئے شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر انشائے شبلی کے امتیازات ان کے اسلوب میں رچ بس گئے ہیں، سیرت النبی، نقوش سلیمانی، کے بعض خطبات اور حیات شبلی میں شبلی کے اسلوب کے اثرات بطور خاص نمایاں ہیں۔

شبلی اپنی عبارتوں میں الفاظ کی تکرار سے ایک خاص قسم کی صوتی فضا قائم کرتے تھے مثلاً گھر گھر، رفتہ رفتہ، ایک ایک، ٹولیاں ٹولیاں، آہستہ آہستہ وغیرہ۔ اسی طرح تکرار کے علاوہ "تعجب ہے"، "یہ عجیب بات ہے" کے فقرے بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ سید صاحب بھی اسی طرز کی اتباع میں سیرت النبی میں رقمطراز ہیں:۔

> "یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے لئے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ملی، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ سمجھتے ہیں۔"[1]

اسی جلد کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔

> "آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا۔ اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی آخری ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کے سامنے آگیا۔"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> "مستدرک حاکم اس وقت ناپید تھی۔ اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی ہے۔"[3]

شبلی کے نقوش پا ذیل کے اقتباس میں کتنی شدت اور وضاحت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ وہی فارسی کی دلکش تراکیب، وہی جوش وقوت اور زور بیان، وہی "ظہور قدسی" والا انداز۔ بلاحظہ فرمائیں:۔

> "جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا، اور

---

[1] سید سلیمان ندوی: سیرت النبی جلد ششم ص ۲۶ (طبع ہفتم ۱۹۷۵ء)

[2] " " " " ص ۸۷۱

[3] " " " جلد سوم ص ۴۰۶

> ہجرت کے بعد سے اطمینان وسکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے کو تھا تو وہ شب مبارک آئی اور اس شب مبارک میں وہ ساعت ہمایوں آئی جو دیوان قضا میں سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیر ملکوت کے لئے مقرر تھی۔ اور جس میں پیش گاہ ربانی سے احکام خاص کا اجرا، اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا۔ رضوان جنت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے کہ شاہد عالم آج یہاں مہمان بن کر آئے گا۔ روح الامین کو حکم پہونچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے، اور جو خطہ لاہوت کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے۔ حرم ابراہیم میں لے کر حاضر ہو۔ کارکنان عناصر کو حکم ہوا کہ مملکت آب و خاک کے تمام مادی احکام وقوانین تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیئے جائیں، اور زمان ومکان اور سفر واقامت، روایت وسماعت، تخاطب کلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔“ [1]

سیرت کے علاوہ شبلی کے بعض اسلوبی رجحانات سید صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ شبلی کی طرح وہ بھی کسی بات پر زور دینے اور اس کی اہمیت وعظمت جاگزیں کرنے کے لئے شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ حیات شبلی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:۔

> ”سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا اور غزنی سے لے کر پنجاب تک یک لخت اسلام کی حکومت قائم کر دی۔“ [2]

علامہ شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ”لیکن اس کی (سرزمین ہند کی) آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ

---

[1] سید سلیمان ندوی: سیرت النبی جلد سوم ص ۴۰۶۔

[2] دیباچہ حیات شبلی ص ۵۲ (طبع اول ۴۳ء)۔

> تھا جو شیخ عبدالحق بھی تھا اور شاہ ولی اللہ بھی۔ ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی۔ ملا محب اللہ بھی تھا اور آزاد بلگرامی بھی۔ اور کم از کم وہ یگانہ انفراداً ان میں سے اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا۔“[1]

”نظر بندان اسلام“ کے تحت ایک سلسلہ مضمون میں مولانا ابو الکلام کی نسبت مبالغہ بلکہ اغراق سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> ”ان سطروں کے لکھتے وقت ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسیؒ امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔“[2]

اسی طرح سید صاحب کے اسلوب میں وثوق واعتماد اور احساس عظمت وکمال سے پُر عبارتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہاں بھی طرز شبلی کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ درج ذیل مثال ملاحظہ فرمائیں :-

> ”تم جانتے ہو کہ بابر کون ہے؟ وہ جس نے کابل اور ترکستان کی پہاڑیوں کو اپنے زور و قوت سے الٹ پلٹ دیا۔ ہندوستان کے ایک لاکھ ٹڈی دل کو بارہ ہزار سپاہیوں نے کاٹ کر ڈال دیا۔ لیکن اس شہزور کی تلوار صرف ایک بوریا نشیں درویش کے سجادہ سے شکست کھا گئی۔ اسلام کو اپنے ان بندہ نما بادشاہوں پر ناز ہے۔“[3]

شبلی کی طرح سید صاحب کے ہاں بھی فارسی کی شگفتہ تراکیب کا استعمال خاصا ہے لیکن عربیت کی طرف میلان ومہارت خاص کے باعث ان کی تحریر کا عام رنگ شبلی سے کچھ مختلف ہو گیا ہے۔ تاہم شبلی کی محبوب ترکیبوں اور پسندیدہ الفاظ کی بہار ان کے یہاں بھی ملتی ہے،

---

[1] سید سلیمان ندوی : حجۃ الاسلام علامہ شبلی (مضمون) مشمولہ رسالہ معارف دسمبر ۱۹۱۶ء ص ۳۰۵۔

[2] ” ” ” : نظر بندان اسلام (مضمون) معارف مارچ ۱۹۱۹ء ص ۱۸۰۔

[3] ” ” ” ” رسالہ معارف اپریل ۱۹۱۶ء ص ۲۴۵۔

سید سلیمان ندوی اپنے استاد کی تحریر کے ایک اور پہلو سے بھی کافی متاثر ہوئے ہیں اور وہ طنز ہے۔ گو یہ چیز ان کے مزاج اور طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اور اسی باعث سید صاحب کی عام کتابوں میں اس کی مثالیں بھی شاذ ہیں۔ لیکن معارف کے شذرات (اداریہ) اور بعض جوابی تحریروں میں یہ رنگ کافی ظاہر ہوا ہے۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

> "علی گڑھ کی سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر نشیں کی نشست گاہ کے اوپر کسی خوش مذاق شاعر کا جلی حرفوں میں کپڑے پر لکھ کر یہ شعر آویزاں کیا گیا تھا۔
>
> وفا شعاری وحب الوطنی و دیں پرستی کی علامت
> کہ اپنے قومی نشاں میں تاج اور کھجور اور ہلال بھی ہے
>
> یہ فصیح و صحیح شعر جس کے موزوں پڑھنے میں متعدد باکمال شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی پڑی۔ دراصل علی گڑھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی۔ جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی۔ منتظمین کو داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے علی گڑھ کا دل نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔"[1]

جوابی تحریروں میں اکثر لطیف طنز ہوتا ہے۔ مثلاً پروفیسر مارگولیتھ نے واقدی کے حوالہ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر چند ناگوار اعتراض کئے تھے۔ سید صاحب نے واقدی کے ضعف اور اس کی صحیح حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے جوابی مضمون میں ایک جگہ تحریر کیا:۔

> "ناظرین غور فرمائیں۔ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے، دلہاؤسن اس کا ترجمہ غشی کرتے ہیں، مارگولیتھ ڈر سے غش کھا کر گر جانا اس سے مطلب نکالتے ہیں۔ کیا مستشرقین

---

[1] سید سلیمان ندوی: شذرات معارف جنوری سنہ ۲۷ء ص ۳۔

تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے"۔ [1]

اسی طرح خیام میں مستشرقین یورپ پر جا بجا طنز کے تیر چھوڑے گئے ہیں۔ اگست ۲۳ء کے معارف میں عنایت اللہ مشرقی کے تذکرہ اور اس کے خاص فکری پہلوؤں پر بھرپور طنز کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ان کی تحریر کا یہ وصف شبلی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، ان میں شبلی کی تندی، تیزی اور بے ساختہ پن نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے طرز تحریر کو نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن ایسا محض خارجی اور اختیاری وصف کے طور پر ہوا ہے۔ ورنہ داخلی طور پر وہ طبعاً شبلی سے مختلف تھے۔ ان کے مزاج میں جوش و خروش کے بجائے متانت و سکینت تھی۔ اور اس کی جھلک ان کے اسلوب میں بھی نمایاں ہے۔

مئی ۱۳ء سے اکتوبر ۱۳ء تک سید سلیمان ندوی الہلال کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ اس زمانہ کی تحریروں میں انھوں نے مولانا آزاد کے طرز تحریر کو اس حد تک اپنا لیا تھا کہ بعد میں ان کی بعض نگارشات اہل نقد و بصیرت کے درمیان مابہ النزاع بن گئیں اور یہ فیصلہ دشوار ہو گیا کہ یہ سید صاحب اور مولانا ابو الکلام میں سے کس کے موقلم کا کرشمہ ہیں۔ اس کی بہترین مثال شہادت مسجد کانپور کے المیہ پر سید صاحب کا الہلال میں لکھا ہوا اداریہ بعنوان "مشہد اکبر" ہے۔ باب ہفتم میں ہم اس کے اقتباسات نقل کر کے اس کی ملکیت اور اسلوب پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ سید صاحب بعد میں الہلالی اثر سے بچنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا، بلکہ معارف کے ابتدائی چند سالوں کے شذرات، ارض القرآن جلد اول اور بعض متفرق مقالات میں تو یہ اسلوب غالب نظر آتا ہے۔ حیات شبلی میں بھی اس کا معمولی سا اثر ظاہر ہے۔ الہلالی رنگ کی بہار دیکھنے کے لئے ایک مضمون "محبت الٰہی اور اسلام" کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:۔

" ربانی خمخانہ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاودان کا آخری نغمہ خوان عندلیب، نظارۂ جمال حقیقت کا پہلا

---

[1] سید سلیمان ندوی: محمد بن عمر الواقدی (مضمون) مشمولہ مقالات سلیمان۔

> مشتاق، مستور ازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بند کشا زندگی کی آخری گھڑیوں میں ہے۔ مرض کی شدت سے بدن بخار سے جل رہا ہے اٹھکر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے۔"[1]

سید صاحب "معارف" کے ابتدائی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطیبانہ اور پر جوش انداز تحریر سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس زمانہ کے شذرات میں اس رنگ کا نمایاں اثر ملتا ہے۔ مثلاً:۔

> "مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی دونوں کا ایک ہی سبب ہے، اور وہ ہے ان کا وقتی اور فوری جوش۔ وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ لیکن کوہکن کی طرح ایک ایک پتھر کو جدا کرکے راستہ صاف نہیں کر سکتے۔ وہ بجلی کے مثل ایک آن میں خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر سکتے ہیں۔ لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے۔ وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں۔ لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لئے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے..... ہماری ناکامی کا اصل سبب کیا ہے؟ یہ ہے کہ ہم آندھی کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح گذر جاتے ہیں۔ ہم کو دریا کے اس پانی کے مانند ہونا چاہیئے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اور سالہا سال میں کناروں کو کاٹ کر اپنا دہانہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ کامیابی صرف مسلسل اور پائدار کوشش میں ہے۔"[2]

اس طویل اقتباس کا حاصل صرف آخری جملہ ہے۔ یعنی" کامیابی صرف مسلسل اور پائدار

---

[1] سید سلیمان ندوی: محبت الٰہی اور اسلام (مضمون) مشمولہ معارف جولائی سنہ ۱۹۲۳ء ص ۵۔

[2] " " " : شذرات اکتوبر ۱۷ء (معارف) ص ۳۔

کوشش میں ہے۔" لیکن خطیبانہ انداز، تشبیہ و استعارہ اور زورِ بیان سے ابوالکلامی اسلوب اپنانے کی کوشش میں عبارت اتنی طویل ہو گئی ہے۔ ۳۵ء تک سید صاحب الہلال کے جادو سے مسحور نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کے اثر سے آزاد ہو گئے تھے۔ اگرچہ پرچھائیوں کے نشان حیات شبلی میں بھی باقی رہ گئے ہیں۔

(۴)

ہر تحریر اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ بفن (Buffon) کا بہت مشہور قول ہے کہ "Style is the man"۔ کوئی ادیب و انشا پرداز دوسرے صاحب طرز اہل قلم کے اسالیب سے ہم رنگ ہونے کی خارجی طور پر کتنی ہی کوشش کرے لیکن بقول ڈوبرٹے "ہر مصنف کی ذاتی آواز کا لہجہ سنائی دے ہی جاتا ہے"[1]۔ تمام مصنوعی نقابوں میں سے لکھنے والے کی شخصیت کا عکس نمایاں ہو کر رہتا ہے۔

اسی طرح سید سلیمان ندوی کا اسلوب نگارش مختلف خارجی مؤثرات سے متاثر ہونے کے باوجود ایک انفرادی شان بھی رکھتا ہے اور اس منفرد طرز میں ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ ان کے مزاج کا سکون و وقار اور متانت و سنجیدگی ان کے اسلوب کا آہنگ بناتے ہیں۔ وہ جب اپنی کوئی تحریر لکھتے ہیں تو اس کا آغاز ایک ایسے دلکش اور حسین انداز میں کرتے ہیں کہ قاری فوراً ہمہ تن توجہ بن جاتا ہے۔ مثلاً ارض القرآن کو اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

> "آج مسلمانوں کا وطن ساری دنیا ہے تاہم مولد اسلام، موطن رسالت، مہبط قرآن دنیا کا ایک ہی گوشہ ہے۔ یعنی عرب جس کو مادی زرخیزی کی محرومی نے گو بن کھیتی کی زمین (وادی غیر ذی زرع) کا خطاب دیا ہے لیکن جہاں روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے اسی کشت زار الٰہی کے آخری

---

[1] The Modern Prose Style By Dobree

کسان کی تخم ریزی و آب سیری کا نتیجہ ہے"۔ [1]

سیرت النبیؐ جلد سوم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :۔

> " سیرت نبوی کا یہ حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے۔ جن کا تعلق ماورائے عالم مادی اور قوانین مادی سے ہے۔ جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام پر چل رہی ہے۔ مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے۔ خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے۔ گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں۔ پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں۔ ستارے اپنے معین اوقات میں ڈوبتے اور نکلتے ہیں۔ اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا خاص نظام رکھتا ہے اور اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے۔ وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔" [2]

سید سلیمان ندوی نے اپنی تحریروں سے علم وفن کی مختلف النوع شاخوں کو گرانبار کیا ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ خشک سے خشک موضوعات کو بھی اپنے قلم کی شگفتگی سے باغ و بہار بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایسی بنجر زمینوں میں حسن انشاء کے گلستان کھلائے ہیں جہاں طاہر خیال پرواز کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ارض القرآن کے خالص تحقیقی مباحث ہوں یا سیرت عائشہ کا مقدس و پاکیزہ موضوع۔ اور سیرت النبی کے عالمانہ و فلسفیانہ خشک حصے، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، اور حیات شبلی ہر ایک میں ادب و انشاء کی شگفتگی موجود ہے۔ ان میں ایک "زاہد خشک" کی روکھی پھیکی عبارتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک پختہ مشق صاحب فن کی صناعی ملتی ہے۔ سید صاحب کا پروقار اور متین لب و لہجہ ان کے منفرد اسلوب کی جان ہے۔ کہیں کوئی سخیف فقرہ، مبتذل

---

[1] سید سلیمان ندوی : ارض القرآن جلد اول دیباچہ ص ا (شاہی پریس لکھنؤ)

[2] " " " : سیرت النبیؐ جلد سوم ص ا (طبع نہم ۷۶ء)۔

محاورہ اور سطحی لفظان کی بارگاہ ادب میں بار نہیں پا سکا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ خود ہی لکھتے ہیں :۔

> "مولانا شبلی کی ہدایت اور تاکید ہوتی تھی کہ معنی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرزِ ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عالمانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے۔ یہ ان کا طریقہ تھا اور اسی طریقے کی پابندی ہمارے دار المصنفین میں اب تک کی جاتی ہے۔"[1]

ادب لطیف میں انشا پردازی کے جوہر دکھانا بہت آسان کام ہے۔ لیکن علمی و تحقیقی تحریروں میں اس کا برتنا در اصل کوہکنی کر کے جوئے شیر نکالنے کے مرادف ہے، اور بلا شبہ سید صاحب اس جوئے شیر کے فرہاد کہلائے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

سیّد صاحب اپنی تصنیف کا خاتمہ بھی ایک عجیب قسم کے جوش اور لطف زبان کیساتھ کرتے ہیں۔ سیرت النبی جلد چہارم کا خاتمہ ملاحظہ فرمائیں :۔

> "کاغذ کے سات سو صفحات سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہونگی، اس لئے بہتر ہے کہ رہروِ قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں۔ ہر چند کہ :۔
>
> ؎ رہ رواں را خستگی راہ نیست
> عشق ہم راہ است وہم خود منزل است"[2]

سید صاحب کی تحریر کا ایک امتیازی وصف فصاحت ہے۔ وہ اپنے قاری کی ذہنی سطح اور اس کے ذوق کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ عالمانہ مباحث میں ان کے مخاطب اہل علم ہوتے ہیں، اس لئے ان میں ان کا لب ولہجہ اور زبان وبیان بھی بدل جاتا ہے۔ تحقیقی اور علمی مباحث میں

---

[1] مضمون "میں جن سے متاثر ہوا" معارف جولائی سنہ ۶۵ء ص ۸۔

[2] سید سلیمان ندوی : سیرت النبی جلد چہارم ص ۸۰۸ (طبع نہم سنہ ۷۶ء)۔

شبلی کا تخیل بلند پرواز ہوجاتا ہے۔ ابوالکلام جوشِ بیان اور خطابت کا سہارا لیتے ہیں محمد حسین آزاد "لفظوں کے خیالی طوطا مینا" اڑانے لگتے ہیں۔ حالی کے یہاں سپاٹ پن اور بے کیفی پیدا ہوجاتی ہے۔ نذیر احمد عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کے پہاڑ کھڑے کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سید سلیمان ندوی ایسے مواقع پر بھی سنجیدگی و توازن اور شگفتگی و دلکشی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ خیام جو ان کی تحقیقی کتابوں میں سب سے اہم درجہ رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے ممتاز ہے، اس کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں :۔

> "خیام کچھ بھی تھا اور کچھ بھی ہو مگر آج اس کی شہرت صرف اس کی فارسی رباعیات کی بدولت قائم ہے۔ خصوصاً آج لوگوں کو جو اس سے دلچسپی ہے۔ وہ صرف اس لئے ہے کہ یورپ فٹزجیرلڈ کے انگریزی ترجمہ کی بدولت اس سے دلچسپی لے رہا ہے، ورنہ تنہا ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اس نے کوئی بڑا درجہ نہیں پایا۔"[1]

> "لوگوں کو اس کی رباعیوں میں رندی و میخواری کا ایک اور پہلو نظر آتا ہے، جس میں وہ شراب و نور، ماہ و صراحی، پیالہ اور گل کوزہ اور ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان سے پینے کا نہیں بلکہ دیکھنے کا کام لیتا ہے۔ یعنی ان کے ذریعہ سے وہ زوال دفنا اور تغیر کی تشبیہوں اور استعاروں کو ادا کرتا ہے۔ ان رباعیوں کو مستی و سرشاری سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے آج ہم صیاد و باغباں اور بہار و خزاں سے کام لیتے ہیں۔"[2]

خطبات مدراس میں سید صاحب نے اپنا پورا انشا پردازانہ زورِ قلم صرف کردیا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ عربوں کے خطبات میں تمام شاعرانہ محاسن موجود ہوتے تھے۔ سید صاحب

---

[1] سید سلیمان ندوی: خیام ص ۲۱۹۔ (طبع اوّل ؁۳۳ء)۔

[2] " " " : " ص ۳۵۴۔

کے پیشِ نظر خطبات بھی وزن و قافیہ سے عاری شعرِ منثور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حسب ذیل اقتباس میں تمام انبیائے کرام کو ان کے امتیازی اوصاف جلیلہ کے ساتھ ہمارے سامنے اس طرح لا کھڑا کرتے ہیں:۔

> "نوح کا جوش تبلیغ، ابراہیم کا ولولہ توحید، ہارون کی رفاقت حق، اسحاق کی وراثت پدری، اسماعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، یعقوب کی تسلیم، داؤد کا غربت حق پر ماتم، سلیمان کا سرود حکمت، زکریا کی عبادت، یحییٰ کی عفت، عیسیٰ کا زہد، یونس کا اعتراف قصور، لوط کی جانفشانی، ایوب کا صبر، یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے۔ اور جہاں کہیں ان صفات عالیہ کا وجود ہے وہ ان ہی بزرگوں کی مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے۔" [1]

خطبات مدراس میں سید صاحب کی پاک دلی، پاک صفتی اور پاکبازی کا عکس نمایاں ہے اس میں جب ان کا قلم رواں ہوتا ہے تو پھر پاکیزہ ادبی تحریروں کا سیلاب بہتا نظر آتا ہے۔ تاریخ و سوانح، وزن و وقار اور خطابت و انشا کے اتنے گوناگوں جلوے سید صاحب کی کسی اور تصنیف میں یکجا نہیں ملتے۔ سید صاحب کے تمام خطبات کی زبان انکے مقدمات و مقالات سے قدرے مختلف ہے۔ چونکہ یہ خطبے مقالہ کے طور پر پڑھنے کے لئے لکھے گئے تھے۔ اس لئے ان میں عبارت آرائی کا تھوڑا سا لحاظ ہے۔ اور اس میں الفاظ کی شوکت، فقروں کی برجستگی، ترکیبوں کی چستی، اور بیان کی دلکشی کا اہتمام نظر آتا ہے۔ اردو مجالس و کانفرنسوں میں پڑھے گئے صدارتی خطبوں میں خطابت کا رنگ نسبتہً ہلکا اور لب و لہجہ نرم ہے۔ یہاں کڑک، گرج اور تخئیل کی بے راہ روی نہیں ہے سید صاحب نے خطابت کو شائستگی، خوشگوار لب و لہجہ اور ادبی رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔

اسی طرح سیرت عائشہؓ کا موضوع پل صراط کے مانند تھا۔ جس میں ذرا سی

---

[1] سید سلیمان ندوی: خطبات مدراس ص ۱۸ (طبع جدید معارف پریس اعظم گڈھ)۔

بے احتیاطی سے مذہبی اور اخلاقی تقدس کے شیشے مجروح ہونے کا قوی اندیشہ تھا۔ مگر سید صاحب اس سے بھی اسی شگفتگی کے ساتھ بخیر گذر گئے ہیں۔ حسن اسلوب کے ساتھ کہیں سخافت، اور ابتذال پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ واقعۂ افک کی بدنمائی کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

> "ہندوؤں میں سیتا پر اور بنو اسرائیل میں مریم پر جو کچھ گذری اسلام میں اسی کا اعادہ ہوا۔" [1]

اسی کتاب کے درج ذیل اقتباس میں صنائع و بدائع کی جھلک ملاحظہ فرمائیں:۔

> "لیکن مخدرات اسلام کے کارہائے نمایاں اب تک پردۂ خفا میں مستور ہیں۔ سیرت عائشہؓ پہلی کوشش ہے۔ جس کے ذریعہ اس صنف کے کارناموں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔" [2]

خط کشیدہ الفاظ میں رعایت لفظی کی مناسبت ظاہر ہے۔

سیّد صاحب جب خالص ادبی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر طاؤس بن کر رقص کرتا ہے۔ اس وقت سید صاحب اردوئے معلیٰ کی شستہ، شیریں اور دلآویز زبان کی موجیں بہاتے ہیں۔ عبارت میں تشبیہ، ترکیب لفظی، مناسباتِ معنوی اور رعایت تجنیس کے حسن سے رنگ آمیزی کے عناصر سمو دیتے ہیں۔ جس سے غرض یا تو کسی مسئلہ کی تفہیم ہوتی ہے۔ یا حسن ادا کا بانکپن یا ایجاز و اختصار کے ساتھ ایک وسیع مبحث کو دلنشیں پیرائے میں ادا کرنے کا خیال۔ لیکن بایں ہمہ یہ امر خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ سید صاحب کے مزاج کا بنیادی وصف اعتدال و توازن حسن انشاء کی قربان گاہ پر کبھی بھینٹ نہیں چڑھ سکا ہے، ان کے اشہب قلم کے قدم کبھی جادۂ اعتدال سے لغزش نہیں کر سکے ہیں۔

تجنیس لفظی اور مناسبت معنوی کے ذریعہ لطیف ظرافت پیدا کرنے کی مثالیں:۔

ا۔ "لیکن کے معنی ہیں "پرنتو" ایک ہندی لفظ ہے۔ جو اُردو میں

---

[1] [2] سید سلمان ندوی: سیرت عائشہ ص ۹۵، ۴۔

کٹ چھنٹ کر "پر" ہو گیا۔ اب اس کی جگہ "پرنتو" بول کر بے پر کی اڑانا کہاں تک درست ہے"۔ [1]

ب۔ "پانی ہندی لفظ ہے اور فارسی والے بھی پرانے زمانے سے اس سے مانوس ہیں مگر اب لفظی چھوت کے ڈر سے آپ "جل" پینے لگیں تو یہ کتنی بے گانگی ہے"۔ [2]

ج۔ "اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجئے"۔ [3]

د۔ "اور وہیں سے ان (اصغر گونڈوی) کا نشاط روح مطبوع ہو کر نشاط دو عالم کا باعث ہوا"۔ [4]

ایجاز و جامعیت کے نمونے:

منشی پریم چند کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ دیہاتیوں کے آلام و مصائب کی نہایت کامیاب مرقع کشی کرتے تھے۔ ان کے اس امتیاز خاص کو سید صاحب نے صرف ایک فقرے میں یوں ادا کر دیا ہے:۔

"وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے"۔ [5]

اس مفہوم کو کہ جب دلّی تباہ ہوئی تو وہاں کے اہل فن نے لکھنؤ میں آکر پناہ لی۔ کتنے بلیغ مختصر اور شاعرانہ الفاظ میں ادا کرتے ہیں:۔

"دلّی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا دور آیا،
اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑ کر
اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا"۔ [6]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی: خطبۂ صدارت ہندوستانی اکیڈمی، مشمولہ نقوش سلیمانی ص ۹۶، ۹۷۔
[3] 〃 〃 : پرانے لفظوں کی نئی تحقیق (مضمون) 〃 〃 〃 ص ۳۰۲۔
[4] [5] [6] 〃 〃 : نقوش سلمانی ص ۸، ۸۷، ۷۹۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں :۔

ا۔ "سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا"[1]

ب۔ "منشی نثار حسین کا پیام یار انیسویں صدی کے وصف میں حسن و عشق کا تنہا پیام بر تھا"[2]

ج۔ "خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"۔ پھر نامہ مبارک چاک کر ڈالا۔ لیکن چند ہی روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔"[3]

د۔ صحابہ کرامؓ وفات نبوی کے بعد جب ان ایام سعادت کو یاد کرتے تھے جب مدینہ کی گلیاں روح الامین کی گذرگاہ تھیں، اور مدینہ کے در و دیوار وحی کے مطلع انوار تھے تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں"[4]

استعارہ طرازی کے جلوے :

انشا پردازی میں تشبیہ و استعارہ سے بڑی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ محاورے زیادہ تر استعارات ہی سے بنتے ہیں، سید صاحب کی نثر میں اور خاص طور پر ادبی و تنقیدی مضامین میں استعارہ کی جدت و لطافت بڑا لطف پیدا کرتی ہے۔ مثلاً وہ اس مفہوم کو کہ انگریزوں کی سیاسی چالبازیوں سے اردو اور ہندی زبان میں جنگ شروع ہو گئی۔ اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

> "ابھی اٹھارہویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں کٹنے مرنے لگے"[5]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۸۰، ۸۹۔

[3] [4] " " : سیرت النبی جلد ۳، ص ۱۸۳، ۳۳۶۔

[5] " " : نقوش سلیمانی ص ۱۰۲۔

لطیف استعاروں کی چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں :۔

ا۔ "سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے۔ میر صاحب (اکبرالہ آبادی) اس بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں۔" [1]

ب۔ "ضلع جگت در حقیقت ایک بازاری چیز ہے۔ اس لئے سنجیدہ کلام اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی کے ذریعہ سے اس عالم میں اپنی پیغمبری کا لاکھ ثبوت دیا۔ لیکن اہل ہوش وخرد کے نزدیک مقبول نہ ہوئی۔" [2]

ج۔ "اردو میں غالب نے جب ادب کے گرم مجمر میں عود ہندی جلایا تو اردوئے معلّٰی کی محفل اس کی خوشبو سے بس گئی ہے۔" [3]

سید سلیمان ندوی جب شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیتے یا خالص ادبی موضوعات پر لکھتے ہیں تو ان کی تحریر "ادب پارہ" بن جاتی ہے۔ اور بعض اوقات وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں "شعر منثور" کہہ جاتے ہیں۔ جگر کے متعلق لکھتے ہیں :

"جگر کی شاعری میں نہ زلف وشانہ ہے نہ سرمہ وآئینہ، نہ ہوس بالائے بام نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانہ خیال میں چشمہائے بسمل کی آئینہ بندی، نہ اس کے محبوب کے ہاتھ میں قصاب کی چھری، اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شعراء کے دل وجگر کی گلکاری ہے۔ وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے۔" [4]

---

[1] [2] سید سلیمان ندوی : نقوش سلیمانی ص ۱۶۵، ۱۶۷۔

[3] " : " ص ۳۷۷۔

[4] " مقدمہ شعلہ طور، نقوش سلیمانی ص ۴۳۱۰۔

مہدی افادی کے مکاتیب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> "مہدی افادی مرحوم کے خطوط کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں مصوری کا کمال نہیں، تصویر فطرت کا جمال ہے۔ ان کا حسین خیال اپنے پیکر ظہور کے لئے اپنی پسند کا لباس پہن کر جلوہ افروز ہے۔ وہ آسمان اسٹیج کے ستاروں کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروش نہیں[۵]۔"

سطور بالا میں علامہ سید سلیمان ندوی کے اسلوب تحریر کے جو نمونے پیش کئے گئے ان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ "علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد" کا پایہ اردو زبان و ادب میں بھی کتنا بلند ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اعتدال پسندی، سلامت فکر، لطیف تشبیہات، پاکیزہ مناسبات، حسن تراکیب، وسعت معلومات اور اعلیٰ ادبی ذوق کی دلکش قوس قزح نے ان کے طرز تحریر میں جان ڈال دی ہے۔ اگر سید صاحب کی خالص ادیبانہ اور انشا پردازانہ عبارتوں کا انتخاب کیا جائے تو اس سے ادب العالیہ کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ درحقیقت ان کے علمی و ادبی اکتسابات پر تحقیق اور وسعت معلومات کا رنگ اس قدر غالب آگیا ہے کہ اس کے نیچے انشا پردازانہ محاسن دب کر رہ گئے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ سید صاحب نے اپنے اسلوبی ارتقا کی ایک منزل پر شبلی اور ابوالکلام کے اسالیب کی تقلید بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ لیکن باہمی طبائع کے اختلاف کے باعث اس نقل میں "مولوی مدن" والی بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے سید صاحب کے اسلوب کی جو کچھ اہمیت و عظمت ہے وہ ان کے شخصی و انفرادی اسلوب کے باعث ہے۔

اردو کے تمام ممتاز اہل علم اور ارباب نقد نے سید صاحب کے اسلوب نثر کو خراج تحسین و اعتراف پیش کیا ہے۔ ذیل میں چند اہم اُدباء اور ناقدین کے اعترافات ملاحظہ ہوں:

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں :

> "سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھائیے تو دیدہ و دل حیران

---

[۵] سید سلیمان ندوی : مقدمہ مکاتیب مہدی ، نقوش سلیمانی ص ۳۸۹۔

کہ شروع کہاں سے کیجئے اور خط تمت کہاں پہونچکر کھینچئے۔ سیرۃ النبی کی ضخیم مجلدات سے لے کر، خیام، خطبات مدراس اور رحمت عالم تک بڑی اور چھوٹی کتابوں تک کون سی ایسی ہے جہاں سلیمان ایک خشک مُلّانے معلوم ہوتے ہوں اور صحت زبان و سلاست بیان نمایاں نہ ہو۔ شستگی، متانت، شرافت یہ توان کے اسلوب کے جوہر اصلی ہیں اور اس میں شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتم سلیمانی میں نگیں[1]،،

۲- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر کرتے ہیں:

"سیرت النبی میں معجزات کی بحث پڑھئے یا ارض القرآن میں جغرافیائی و تاریخی تحقیقات۔ ہر جگہ آپ کا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا۔ اور آپ سے پڑھنے کی سفارش کرے گا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریریں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی و سلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں، اور ان کی خالص علمی تصانیف تک کے بعض ٹکڑے شہ پارے معلوم ہوتے ہیں خطبات مدراس کے بعض پیراگراف سیرۃ النبیؐ کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات وہ تحریریں ہیں جن پر ہمارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے۔ نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں[2]،،

۳- ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"آپ نثر لکھنے میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں۔ ان کی عبارت

---

[1] عبدالماجد دریابادی: "نقوش سلیمانی" (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲

[2] ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ ص ۵۷ (مکتبہ فردوس لکھنؤ)

میں ادبیت و پختگی کے علاوہ علمیت کا بھی ذخیرہ ملتا ہے۔ لیکن علمیت ایسی نہیں، جو کانوں کو گراں محسوس ہو۔ بلکہ عربی و فارسی کے ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کرنا اب ہمارے لئے ناگزیر ہوگیا ہے۔ جن کے بغیر ہم اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے۔ سید سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہیں بناتے۔ ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ اپنے خیالات و الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے[1]"

۴۔ پروفیسر ادیب (لاہور) اپنے ایک مضمون میں سید صاحب کے اسلوب بیان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے آخر میں رقم طراز ہیں:

"علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان اور اسلوب بیان میں بحیثیت مجموعی ان کے استاذ علامہ شبلی کی سلاست و روانی، تلاش و تجسس وسعت فکر و نظر اور استقصاء، مولوی محمد حسین آزاد کی شوخی و زندہ دلی اور وحید الدین سلیم کی متانت، سادگی اور ادبی کاوش جلوہ گر ہے[2]"

۵۔ سید ذوالفقار حسین بخاری نے بھی ایک مقالہ میں سید صاحب کی نثر دانشا کی خصوصیات کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ اوصاف تقلید سے نہیں خون جگر سے حاصل ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر پر بڑی محنت کی ہے۔ اور اسے اپنی شخصیت کا آئینہ بنانے میں پورے انہماک سے کام لیا ہے۔ اس لئے جو شخص اس طرز کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ محض خارجی اوصاف ہی کی تقلید کر سکتا ہے۔ ان کے مزاج کی ہمواری، نرمی اور

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین: مختصر تاریخ ادب اردو ص ۴۲۲

[2] پروفیسر ادیب (لاہور) "سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان" پر ایک (مضمون) معارف اپریل ۵۶ء ص ۲۶۰

اعتدال اس کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے ...... ان کا نام اپنی دلکش اور معتدل نثر کے لئے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا[1]۔ ''

---

[1] سید ذوالفقار حسین بخاری : " سید سلیمان کی نثر و انشا '' (مضمون) معارف اپریل ۶۴ء ص ۲۴۵

حرف آخر

گذشتہ اوراق میں علامہ سید سلیمان ندوی کی متنوع شخصیت اور ادبی اکتسابات کا بہت شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ سید صاحب صرف ”علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد“ فاضل محقق اور ایک سوانح نگار و مؤرخ ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک صاحب طرز ادیب، قادر الکلام شاعر، ماہر صحافی، بلند پایہ نقاد اور منفرد مکتوب نگار بھی تھے۔ انھوں نے لیلائے اردو کے گیسو سنوار کر اسے ایک علمی وقار عطا کیا ہے۔ سید صاحب کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق و تنقید کو باہم ہم آغوش کر دیا۔ اور ان دونوں کے سنگم سے اپنی ادبی فتوحات میں وزن اور وقار پیدا کیا۔

سید سلیمان ندوی کی نادر علمی تحقیقات اور ادبی نگارشات، جس عہد میں منصہ شہود پر آئیں وہ مختلف حیثیتوں سے ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم دور شمار ہوتا ہے۔ سر سید اور ان کے رفقاء کے منظم ادبی اجتہادات اور مساعی کے دور رس اثرات سے براہ راست یا بالواسطہ اُس زمانہ کا ہر اہلِ قلم متأثر ہو رہا تھا۔ دنیائے ادب میں جدید میلانات اور تغیر پذیر رجحانات برابر پروان چڑھ رہے تھے۔ شبلی علی گڑھ تحریک کے نتائج و ثمرات کا نقطۂ عروج تھے۔ انھوں نے اردو کو نہ صرف اسلوب کا ایک معیاری سانچہ دیا۔ بلکہ وہ تنقید کے ایک مستقل دبستان کے بانی و امام بھی قرار پائے۔ سید صاحب اردو ادب و تنقید کے اسی دبستان کے ایک گل سر سبد تھے انھوں نے اقتضائے عصر کے مطابق ہر تحریک و رجحان سے وقتی طور پر اثر ضرور قبول کیا۔ لیکن پھر گھوم پھر کر آستانۂ شبلی ہی کی جبہ سائی میں فخر محسوس کیا۔

سید صاحب نے اپنی تقریباً نصف صدی پر محیط تصنیفی زندگی میں اردو زبان و ادب کے متعلق کثرت سے بلند پایہ مضامین لکھے، اردو کانفرنسوں میں زبان و ادب کے مسائل پر معرکہ کے

خطبہ ہائے صدارت پیش کئے۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں پر گراں قدر مقدمات سپرد قلم کئے بلاشبہ سید صاحب کے خطبات، مقالات اور مقدمات کو ملک کے ادبی حلقوں میں قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ ان سے فکر و نظر کی نئی راہیں کھلیں اور قلب و ذہن کو روشنی کی دولت ملی۔ نقوش سلیمانی کے ادبی مضامین سے نہ صرف اردو زبان کے عہد بعہد ارتقا کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے بلکہ اردو کی ضرورت، بقا و تحفظ اور اس کی اہمیت کے دلائل پوری تشریح سے اس کتاب میں یکجا ہو گئے ہیں۔ زبان اردو کے مولد و منشا کی تعیین کے سلسلہ میں سید صاحب نے پہلی بار نہایت مدلل اور محققانہ طور پر سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی ہے۔ جس پر ان کو اپنے عہد میں کافی طنز و تعریض اور مخالفت کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ لیکن مرور وقت نے رفتہ رفتہ ممتاز اہل علم و دانش کو اس جدید نظریہ پر ٹھہر کر سنجیدگی سے غور و فکر پر مجبور کر دیا۔ "خیام" سید صاحب کا علمی، تحقیقی اور ادبی شاہکار ہے۔ اسمیں تحقیق و تنقید کا جو متوازن اور دلکش امتزاج ملتا ہے۔ وہی درحقیقت اس کتاب کی جان ہے۔ اسی طرح "حیات شبلی" اور "یاد رفتگاں" نے بھی اردو کے ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیات شبلی اردو کی ادبی سوانح عمریوں میں تاج محل کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس کا مبسوط مقدمہ تاریخ، تحقیق اور ادب کا حسین سنگم ہے۔ یاد رفتگاں نثری شہ پاروں کا گراں قدر خزینہ اور سید صاحب کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔

مکتوب نگاری میں بھی سید صاحب نے اپنی انفرادیت کے علم بلند کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں لطافت، تنوع و دلچسپی، بے تکلفی و برجستگی، ایجاز و اختصار، ہم کلامی اور اُنس و محبت کی فضا پیدا کر کے ان کو مکمل طور پر ادب کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے۔ سید صاحب کے مکاتیب کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جو نہ صرف مفید علمی و تاریخی معلومات کا کشکول ہیں بلکہ چہرۂ ادب کی مشاطگی میں بھی ان کو بلند مقام حاصل ہے۔

سید صاحب نے شاعری کے میدان میں بھی گلزار کھلائے ہیں، غزل، نظم، نعت شخصی، مراثی اور قطعات وغیرہ ہر صنف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ فنی حیثیت سے ان کا کلام فنی پختگی اور صحت عروض کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ خاص طور پر سید صاحب کا عارفانہ کلام ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس میں انھوں نے محض موزونی طبع اور قدرت بیان کی

کرشمہ سازی نہیں کی ہے بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت سے اس کا گہرا ربط ہے۔ کیونکہ وہ بادۂ تصوف کے ذائقہ شناس اور مئے عرفان سے سرشار تھے۔

تنقید نگاری میں سید صاحب شبلی کے دبستان تنقید کے ایک کامیاب رکن تھے۔ ان کے تنقیدی افکار اور عملی تنقیدوں میں مشرقیت کا رنگ گہرا اور نمایاں ہے۔ وہ بھی اپنے استاد شبلی کی طرح تنقید کی مشرقی اصطلاحات مثلاً فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، آمد و آورد اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کی اکثر تنقیدیں تاثراتی انداز سے قریب تر ہیں۔ وہ جدید تنقیدی میلانات سے واقف ضرور تھے اور بعض مقامات پر اقتضائے عصر سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور پر ان سے مشرقیت کا دامن چھوٹ بھی گیا ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ خیام اور نقوش سلیمانی میں شامل مقدمات سے ان کے اعلیٰ تنقیدی شعور، بلند پایہ سخن سنجی اور ادبی بصیرت کا پورا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

سید صاحب کی صحافت کا چراغ الندوہ کے صفحات پر اور علامہ شبلی کے سایۂ عاطفت و تربیت میں روشن ہوا۔ اور پھر الہلال اور معارف میں ان کی صحافت نگاری کے جوہر نمایاں و تاباں ہوئے۔ لیکن ان کی صحافت مبتذل و سطحی اخباری صحافت سے یکسر مختلف تھی۔ سید صاحب کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صحافت کو علمی وقار، ادبی پاکیزگی، اور اسلوبی متانت عطا کر کے اس کی سرحدوں کو تخلیقی ادب سے ملا دیا ہے۔ چنانچہ الہلال اور معارف کے اوراق میں سید صاحب نے ایسے بکثرت مقالے اور اداریئے لکھے جو ادب العالیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسجد کانپور کی شہادت کے المیہ پر" الہلال '' میں سید صاحب کے قلم سے نکلا ہوا اداریہ " مشہد اکبر" آج بھی عروق مردہ میں حیات تازہ پیدا کر دیتا ہے۔

سید صاحب کے اسلوب تحریر کا آغاز تقلید کے بندھنوں سے ہوا۔ شررؔ اور محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کی ذائقہ شناسی کے بعد وہ الہلالی اسلوب کی زلفوں کے کچھ عرصہ اسیر رہے۔ اور ان پر ابوالکلامی رنگ اس قدر غالب رہا کہ ان کی بعض تحریریں آج تک متنازعہ فیہ بنی ہوئی ہیں کہ وہ سید صاحب کے موقلم کی تراوش ہیں یا مولانا آزاد کے خامۂ عنبریں کے نقوش زریں۔ لیکن اسلوب میں سید صاحب کا غالب میلان اپنے مربی شبلی ہی کی طرف ہمیشہ رہا۔ انشائے شبلی کے جملہ امتیازات مثلاً قوت و اعتماد، جوش و خطابت، فارسی کی دلکش تراکیب، مبالغہ آفرینی اور موسیقیت وغیرہ ان کے

اسلوب میں رچ بس گئے ہیں۔ پھر یہ تمام متفرق خصوصیات ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہوکر ایک منفرد رنگ اختیار کر گئی ہیں۔ سید صاحب کی شخصیت کے اہم عناصر ترکیبی اعتدال مزاج، سنجیدگی اور وقار و متانت وغیرہ ان کے انفرادی اسلوب کا آہنگ بناتے ہیں۔ وہ اپنے مخاطب کے ذوق و استعداد اور موقع و محل کی مناسبت سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں۔ جہاں سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ان کا اسلوب عربی الفاظ سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ اور عالمانہ مباحث میں ان کا لب و لہجہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی سید صاحب کا اسلوب نگارش علمی و تحقیقی مباحث کے لئے موزوں ترین ہے۔

حاصل کلام یہ کہ علامہ سید سلیمان ندوی بنیادی طور پر تو علم و تحقیق کے شہباز تھے اور ان کے تخلیقی اکتسابات بیشتر تاریخ، سوانح اور اسلامیات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ لیکن ادب و تنقید کے گلستانوں کی آبیاری میں بھی ان کا حصہ خالص ادیبوں سے کم نہیں۔ صحافت، تنقید، شعر و ادب، مکتوب نگاری اور اسلوب و انشا، غرض ادب کی مختلف شاخیں ان کی قلمی جولانیوں سے ثمر بار ہوئی ہیں۔ المختصر اردو زبان و ادب کے سرمایے میں ان کی تحریروں سے جو بیش قیمت اضافہ ہوا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جب بیسوی صدی کے ربع ثانی کی ادبی تاریخ مدوّن کی جائے گی تو اس میں بلاشبہ سید صاحب کی ادبی خدمات کا ذکر سنہرے حرفوں میں کیا جائے گا۔

کتابیات

① اردو کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مرتب	مطبع / ناشر	سن اشاعت
۱۔	اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد	۱۹۲۶ء
۲۔	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	سید محمود الحسن رضوی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۳۔	اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	چمن بک ڈپو دہلی	-
۴۔	ابوالکلام آزاد فکر و فن	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۵۔	انوار ابوالکلام	علی جواد زیدی	جشن بہار کمیٹی کشمیر	۱۹۵۹ء
۶۔	ابوالکلام آزاد	عابد رضا بیدار	اورنیٹل اسٹڈیز رامپور	۱۹۶۸ء
۷۔	اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سود لیتھو پریس دہلی	-
۸۔	اقبال نامہ	شیخ عطاء اللہ	شیخ اشرف لاہور	-
۹۔	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	اردو مرکز پٹنہ	۱۹۵۶ء
۱۰۔	ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۰ء
۱۱۔	ارباب نثر اردو	سید محمد قادری	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد	۱۹۴۷ء
۱۲۔	اردو مضمون کا ارتقاء	ڈاکٹر سیدہ جعفر	نیشنل بکڈپو حیدرآباد	۱۹۶۲ء
۱۳۔	ارمغان سلیمان	غلام محمد		
۱۴۔	اردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	جدید ناشرین لاہور	۱۹۶۵ء
۱۵۔	اشارات تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۶۶ء

۱۶- ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	شاہی پریس لکھنؤ	۱۹۵۹ء
۱۷- اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	مرتبین	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۶ء
۱۸- اردو ادب کی ایک صدی	ڈاکٹر سید عبد اللہ	عامر بک ڈپو کلکتہ	—
۱۹- الغزالی	علامہ شبلی نعمانی	نامی پریس کانپور	۱۹۰۲ء
۲۰- ابوالکلام آزاد	عبد اللہ بٹ	قومی کتب خانہ لاہور	—
۲۱- اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	مطبع نولکشور لکھنؤ	۱۹۳۰ء
۲۲- امیر مینائی	ممتاز علی آہ	ادبی پریس لکھنؤ	۱۹۴۱ء
۲۳- اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	فروغ اردو لکھنؤ	—
۲۴- اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	—	۱۹۶۹ء
۲۵- بابائے اردو	عبد اللطیف اعظمی	فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۲ء
۲۶- تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۲۷- تنقیدی سرمایہ	عبد الشکور	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	—
۲۸- تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	۱۹۶۳ء
۲۹- تذکرہ سلیمان	غلام محمد	ادارہ مجلس علمی کراچی	۱۹۶۰ء
۳۰- تنقیدیں	ڈاکٹر خورشید الاسلام	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۶۴ء
۳۱- تنویر ادب	صغیر احمد جان	نیشنل پریس الہ آباد	۱۹۳۷ء
۳۲- تاریخ صحافت اردو	امداد صابری	سوبھاش بک ڈپو دہلی	۱۹۵۳ء
۳۳- تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبد القیوم	مشتاق بک ڈپو کراچی	۱۹۶۳ء
۳۴- تذکرہ وقار	امین زبیری	عزیزی پریس آگرہ	۳۸ء
۳۵- تنقیدات عبد الحق	عبد الحق	—	۱۹۳۴ء
۳۶- پنجاب میں اردو	پروفیسر محمود شیرانی	کریمی پریس لاہور	۱۹۲۸ء
۳۷- ....پا جا سراغ زندگی	ابو الحسن علی ندوی	انجمن طلبہ قدیم لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۳۸- پرانے چراغ	" "	مکتبہ فردوس لکھنؤ	۱۹۷۵ء

۳۹۔ جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد	۱۹۳۲ء
۴۰۔ جگر کے خطوط	ڈاکٹر محمد اسلام	دانش محل لکھنؤ	۱۹۶۵ء
۴۱۔ جنگ آزادی ۵۷ء	خورشید مصطفیٰ رضوی	الجمعیۃ پریس دہلی	۱۹۵۹ء
۴۲۔ حیات سلیمان	شاہ معین الدین ندوی	دارالمصنفین اعظم گڈھ	۱۹۷۳ء
۴۳۔ حالی کا نظریہ شاعری	ناظر کاکوروی	ادارہ انیس اردو الہ آباد	۱۹۵۹ء
۴۴۔ حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڈھ	۱۹۴۳ء
۴۵۔ حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۵۰ء
۴۶۔ حسرت موہانی، حیات و کارنامے	ڈاکٹر احمر لاری	نامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۴۷۔ حیات عبدالحئی	ابوالحسن علی ندوی	نامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۴۸۔ خطوط محمد علی	پروفیسر محمد سرور	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۴۰ء
۴۹۔ خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری	ڈاکٹر وحید اختر	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۷۱ء
۵۰۔ داستان تاریخ زبان اردو	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن تاجر کتب آگرہ	۱۹۵۷ء
۵۱۔ دید و شنید	رئیس احمد جعفری	کتاب منزل لاہور	۱۹۴۸ء
۵۲۔ داستان زبان اردو	شوکت سبزواری	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۶۰ء
۵۳۔ ذکر شبلی	منشی محمد امین زبیری	—	—
۵۴۔ ذکر آزاد	عبدالرزاق ملیح آبادی	آزاد ہند کلکتہ	۱۹۶۰ء
۵۵۔ روح مکاتیب	ساغر نظامی	—	۱۹۴۱ء
۵۶۔ سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی	پبلی کیشنز ڈویژن دہلی	۱۹۷۱ء
۵۷۔ سرسید احمد خاں	عبدالحق	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۵۹ء
۵۸۔ سیر المصنفین اول	محمد یحییٰ تنہا	دارالاشاعت غازی آباد	۱۹۲۴ء
۵۹۔ " " دوم	" "	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۲۸ء
۶۰۔ سیرت محمد علی مونگیری	محمد الحسنی	مکتبہ ندوہ لکھنؤ	۱۹۶۴ء
۶۱۔ سیاست ملیہ	منشی محمد امین زبیری	عزیزی پریس آگرہ	۱۹۴۱ء

۶۲۔	سرسید اور اصلاح معاشرہ	شاہد حسین رزاقی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	سنہ ۱۹۶۳ء
۶۳۔	سرسید کی اردو صحافت	ڈاکٹر اصغر عباس	انجمن ترقی اردو ہند	سنہ ۱۹۷۵ء
۶۴۔	سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری	مکتبہ جامعہ دہلی	سنہ ۱۹۳۲ء
۶۵۔	سات تحریریں	عبدالقوی دسنوی	—	سنہ ۱۹۷۵ء
۶۶۔	سخنہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	فروغ اردو لکھنؤ	سنہ ۱۹۵۵ء
۶۷۔	شبلی نامہ	شیخ محمد اکرام	الواعظ صفدر پریس لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۵ء
۶۸۔	شبلی بحیثیت انشا پرداز	سید انصاری	الناظر بک ڈپو لکھنؤ	سنہ ۱۹۳۴ء
۶۹۔	صدر یار جنگ	شمس تبریز خاں	مجلس تحقیقات لکھنؤ	سنہ ۱۹۷۲ء
۷۰۔	عظمت رفتہ	ضیاء الدین احمد برنی	تعلیمی مرکز کراچی	سنہ ۱۹۶۱ء
۷۱۔	علی برادران	رئیس احمد جعفری	محمد علی اکیڈمی لاہور	سنہ ۱۹۶۳ء
۷۲۔	علی گڑھ تحریک	نسیم قریشی	مسلم پریس لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۰ء
۷۳۔	فن صحافت	رحم علی الہاشمی	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	سنہ ۱۹۴۳ء
۷۴۔	قدر و نظر	اختر اورینوی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	سنہ ۱۹۵۵ء
۷۵۔	مضامین ڈار	محمد ابراہیم ڈار	قادری پریس بمبئی	-
۷۶۔	مکاتیب شبلی جلد دوم	سید سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڈھ	سنہ ۱۹۲۷ء
۷۷۔	مکتوبات سلیمانی اول	عبدالماجد دریابادی	شاہی پریس لکھنؤ	سنہ ۶۳ء
۷۸۔	" " دوم	"	" "	سنہ ۱۹۶۷ء
۷۹۔	مکاتیب سلیمان	مسعود عالم ندوی	مکتبہ چراغ راہ کراچی	سنہ ۱۹۵۴ء
۸۰۔	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ	سنہ ۱۹۶۵ء
۸۱۔	مکاتیب گیلانی	مناظر احسن گیلانی	دارالاشاعت رحمانی مونگیر	سنہ ۱۹۶۹ء
۸۲۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	سرسید بکڈپو علی گڑھ	سنہ ۱۹۷۰ء
۸۳۔	مقالات احسان	مرزا احسان بیگ	معارف پریس اعظم گڑھ	سنہ ۱۹۶۸ء
۸۴۔	مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں	عمران خان ندوی	مکتبہ جمعیۃ التعاون لکھنؤ	-

۸۵-	مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۶۸ء
۸۶-	ماسٹر رام چندر	صدیق الرحمٰن قدوائی	شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی	۱۹۶۱ء
۸۷-	ماسٹر رام چندر اور اردو نثر	ڈاکٹر سیدہ جعفر	—	۱۹۶۰ء
۸۸-	مقدمہ مکتوبات حالی	عبدالحق	حالی پریس پانی پت	۱۹۲۵ء
۸۹-	مقدمہ مکاتیب محسن الملک	منشی امین زبیری	شمسی پریس آگرہ	—
۹۰-	مکاتیب امیر مینائی	احسن اللہ خاں ثاقب	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶۴ء
۹۱-	مشاہیر اردو کے خطوط	منشی مہیش پرشاد	رام دیال اگروال الہ آباد	۱۹۳۲ء
۹۲-	مکتوبات عبدالحق	جلیل قدوائی	مکتبہ اسلوب کراچی	۱۹۶۳ء
۹۳-	مقدمات عبدالحق دوم	مرزا محمد بیگ	مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد	۱۹۷۲ء
۹۴-	مکاتیب مہدی	مہدی بیگم	آسی پریس گورکھپور	—
۹۵-	مرآۃ الشعر	عبدالرحمٰن	جید پریس دہلی	۱۹۲۶ء
۹۶-	مسلمانوں کا روشن مستقبل	محمد طفیل	کتب خانہ عزیزیہ دہلی	—
۹۷-	محمد علی جناح	کانجی دوارکا داس	علمی مجلس دہلی	۱۹۷۰ء
۹۸-	مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	مدینہ پریس بجنور	۱۹۶۸ء
۹۹-	مطالعۂ امیر	ابو محمد سحر	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۶۵ء
۱۰۰-	نقد ابوالکلام	ڈاکٹر رضی الدین احمد	فائن آرٹ پریس میرٹھ	۶۸ء
۱۰۱	نئے ادبی رجحانات	سید اعجاز حسین	کتابستان الہ آباد	۱۹۵۷ء
۱۰۲-	ندوۃ العلماء کا تخیل اور پیغام	عبدالسلام قدوائی	نامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۱۰۳	وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات	منظر عباس نقوی	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۶۹ء
۱۰۴-	وقار حیات	اکرام اللہ ندوی	مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۲۵ء
۱۰۵-	ہندوستانی مسلمان	ابوالحسن علی ندوی	تنویر پریس لکھنؤ	۱۹۶۱ء

۱۰۶-	ہندوستانی سماجیات	جعفر حسن	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۵۵
۱۰۷-	ہندوستان اور پاکستان	عبدالقدوس ہاشمی	دارالاشاعت حیدرآباد	۱۹۴۱ء
۱۰۸-	ہم نفسان رفتہ	رشید احمد صدیقی	معارف پریس اعظم گڈھ	-
۱۰۹-	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین (ترجمہ)	ادبی پریس لکھنؤ	۱۹۴۸ء
۱۱۰-	ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	۱۹۶۰ء
۱۱۱-	ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۶۵ء
۱۱۲-	فن کی جانچ	ڈاکٹر سیدہ جعفر	نیشنل پریس حیدرآباد	۱۹۶۵ء
۱۱۳-	ادب اور تنقید	اسلوب احمد انصاری	نیشنل آرٹ پرنٹرس الٰہ آباد	۱۹۶۸ء
۱۱۴	تلاش و تاثر	عبدالقوی دسنوی	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۱۱۵-	تنقید اور احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا	اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۷۶ء
۱۱۶-	فکر و ریاض	علی جواد زیدی	جمال پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۷۵ء
۱۱۷-	اسلوب	عابد علی عابد	اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۷۶ء
۱۱۸-	ترقی پسند ادب	عزیز احمد	خواجہ پریس دہلی	۱۹۴۵ء
۱۱۹-	مباحث	ڈاکٹر سید عبداللہ	کتب خانہ نذیریہ دہلی	۱۹۶۸ء
۱۲۰-	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۷۲ء
۱۲۱-	اردو تنقید کے معمار	ایم حبیب خاں	جمال پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۶۵ء
۱۲۲-	ترقی پسند ادب	ہنسراج رہبر	آزاد کتاب گھر دہلی	۱۹۶۷ء
۱۲۳-	تجزیے	ڈاکٹر گیان چند جین	جمال پرنٹنگ پریس دہلی	۱۹۷۳ء

② عربی کتابیں

۱۔	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	بشاری مقدسی	مطبعہ بریل لیڈن	؁۱۹۰۶ء
۲۔	کتاب العمدہ	ابوعلی الحسن ابن رشیق	مطبعہ سعادہ قاہرہ	؁۱۹۰۷ء
۳۔	تاریخ آداب اللغۃ العربیہ	جرجی زیدان	مطبعۃ الہلال مصر	؁۱۹۱۲ء
۴۔	رحلہ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	مطبعہ خیریہ قاہرہ	؁۱۹۰۴ء
۵۔	تاریخ علم الادب	المقدسی	مطبعۃ الہلال مصر	؁۱۹۰۹ء
۶۔	المجمل فی تاریخ الادب العربی	محمد بہجۃ الاثری	مطبعہ العراق بغداد	؁۱۹۲۹ء
۷۔	نقد الشعر	قدامہ بن جعفر	مطبعۃ الجوائب قسطنطنیہ	؁۱۸۸۴ء
۸۔	کتاب الصناعتین	ابو ہلال العسکری	ـ	؁۱۹۰۲ء

③ رسائل و اخبارات

۱۔	آجکل	دہلی	ابوالکلام نمبر ، جنگ آزادی نمبر
۲۔	برہان	دہلی	مارچ ؁۱۹۵۴ء ، مئی ؁۱۹۶۰ء ، مارچ ؁۱۹۶۴ء ، ستمبر ؁۱۹۶۴ء نومبر ؁۱۹۶۵ء
۳۔	تحریک	دہلی	جولائی ؁۱۹۵۲ء
۴۔	جامعہ	دہلی	دسمبر ؁۱۹۶۳ء
۵۔	الہلال	کلکتہ	۱۰ر جنوری ؁۱۹۱۳ء ، ۱۳ر اگست ؁۱۹۱۳ء

۶۔	زندگی	رام پور	اپریل ۱۹۶۴ء
۷۔	سب رس	حیدرآباد	مارچ ۱۹۶۵ء، مئی ۱۹۶۹ء، محی الدین زور نمبر
۸۔	شیرازہ	کشمیر	زور نمبر
۹۔	صبا	حیدرآباد	جنوری، فروری ۱۹۵۸ء (شبلی نمبر)
۱۰۔	ادیب	علی گڑھ	شبلی نمبر (ستمبر ۱۹۶۰ء) دسمبر ۱۹۶۱ء (عبدالسلام نمبر)
۱۱۔	اردو ادب	″	آزاد نمبر (۵۹ء)
۱۲۔	ریاض	کراچی	مارچ ۱۹۵۴ء (سلیمان نمبر)
۱۳۔	صریر خامہ	″	تنقیدی ادب نمبر (سندھ یونیورسٹی میگزین)
۱۴۔	صبح	دہلی	ابوالکلام آزاد نمبر
۱۵۔	صنم	پٹنہ	بہار نمبر
۱۶۔	صدق جدید	لکھنؤ	۲۲ر جنوری ۱۹۵۶ء، ۲۵ر جنوری ۱۹۵۶ء، یکم نومبر ۱۹۶۳ء، ۱۰ر جنوری ۱۹۶۴ء، ۲۴ر جنوری ۱۹۶۴ء، ۲۱ر فروری ۶۴ء، ۶ر مارچ ۶۴ء، ۱۳ر مارچ ۶۴ء، ۲۷ر مارچ ۶۴ء، ۸ر مئی ۶۴ء، ۱۰ر نومبر ۱۹۶۷ء، ۲۴ر نومبر ۶۷ء، ۲۲ر مئی ۶۴ء، ۲۶ر جون ۶۴ء، ۱۰ر جولائی ۶۴ء، ۲۴ر جولائی ۶۴ء، ۳۱ر جولائی ۱۹۶۴ء، ۱۱ر ستمبر ۶۴ء، ۳۱ر مئی ۱۹۶۶ء، ۷ر جون ۱۹۶۶ء۔
۱۷۔	فاران	کراچی	مئی ۱۹۵۶ء، اگست ۱۹۵۶ء، ستمبر ۱۹۵۶ء، جون ۱۹۵۹ء، اکتوبر ۱۹۵۹ء، فروری ۱۹۶۰ء، ستمبر ۱۹۶۰ء، ستمبر ۱۹۶۱ء، جون ۱۹۶۴ء
۱۸۔	قومی آواز	لکھنؤ	۳۰ر نومبر ۱۹۵۳ء۔
۱۹۔	فروغ اردو	″	اگست تا اکتوبر ۱۹۶۱ء (عبدالماجد دریابادی نمبر)
۲۰۔	نیا دور	″	غالب نمبر (۱۹۶۹ء)
۲۱۔	نورس	کراچی	جولائی ۱۹۶۰ء (عبدالحق نمبر)
۲۲۔	نقوش	لاہور	شخصیات نمبر، مکاتیب نمبر جلد اول، خطوط نمبر

۲۳۔	معارف	اعظم گڈھ	جولائی ۱۹۱۶ء، جنوری ۱۹۱۷ء، اکتوبر ۱۹۳۶ء، جولائی ۱۹۵۰ء، اکتوبر ۱۹۵۵ء، نومبر ۱۹۵۵ء، اپریل ۵۶ء، فروری ۵۷ء، مارچ ۵۷ء، اپریل ۵۷ء، مئی ۵۷ء، جون ۵۷ء، جولائی ۵۷ء، اگست ۵۷ء، ستمبر ۵۷ء، جون ۵۸ء، ستمبر ۱۹۵۹ء جون ۱۹۶۰ء، جولائی ۱۹۶۰ء، ستمبر ۱۹۶۰ء، اکتوبر ۶۰ء، دسمبر ۶۰ء، اپریل ۱۹۶۴ء، جولائی ۱۹۶۱ء۔
۲۴۔	منہاج	لاہور	۵؍ جون ۱۹۵۸ء، ۱۴؍ جون ۱۹۵۸ء، ۲۱؍ جون ۱۹۵۸ء، ۲۸؍ جون ۵۸ء
۲۵۔	مدینہ	بجنور	۲۵؍ جولائی ۱۹۶۰ء، ۲۸؍ جولائی ۶۰ء
۲۶۔	نقش	دیوبند	جولائی ۱۹۵۹ء، اگست ۱۹۵۹ء
۲۷۔	اردو	اورنگ آباد	جنوری ۱۹۲۵ء، جولائی ۱۹۲۵ء، جولائی ۳۵ء، اکتوبر ۴۱ء، جولائی ۱۹۴۳ء، جولائی ۱۹۵۰ء۔
۲۸۔	اردو	کراچی	جنوری ۱۹۵۳ء، اکتوبر ۱۹۵۴ء، جولائی ۱۹۵۵ء، اکتوبر ۵۷ء، جنوری ۵۸ء۔
۲۹۔	ہماری زبان	علی گڑھ	یکم جون ۱۹۶۱ء، یکم ستمبر ۱۹۶۵ء

مُصنّف کی دُوسری کتاب

تبع تابعینؒ

(جلد دوم)

"بڑے شکر و مسرت کا مقام ہے کہ دار المصنفین کے ایک ہونہار اور فاضل رفیق عزیز گرامی حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی نے تبع تابعین کی دوسری ضخیم و مفصل جلد تصنیف کی۔ جس میں دار المصنفین کی قدیم علمی روایات اور اس کے معیار کے مطابق قدیم مستند ماخذ سے، جن میں ان باکمال ہستیوں کے حالات یکجا یا متفرق طور پر موجود ہیں، معلومات اخذ کر کے ان کو سلیقہ و قابلیت کے ساتھ اس کتاب میں مرتب کر دیا۔ اس مواد کے جمع کرنے میں وہ محض ناقل یا مرتب نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی خوش مذاقی، محنت، حسن انتخاب اور تصنیفی لیاقت کا ثبوت دیا ہے، زبان دبستان شبلی کے تربیت یافتہ لوگوں کی طرح شگفتہ، طرز بیان سلجھا ہوا اور متین و سنجیدہ ہے۔ انھوں نے اس میں اپنے ذہن، مطالعہ اور تحقیق سے بھی کام لیا ہے۔ اور وہ محض لکیر کے فقیر نہیں بنے رہے۔"

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

(اقتباس از مقدمہ تبع تابعین)